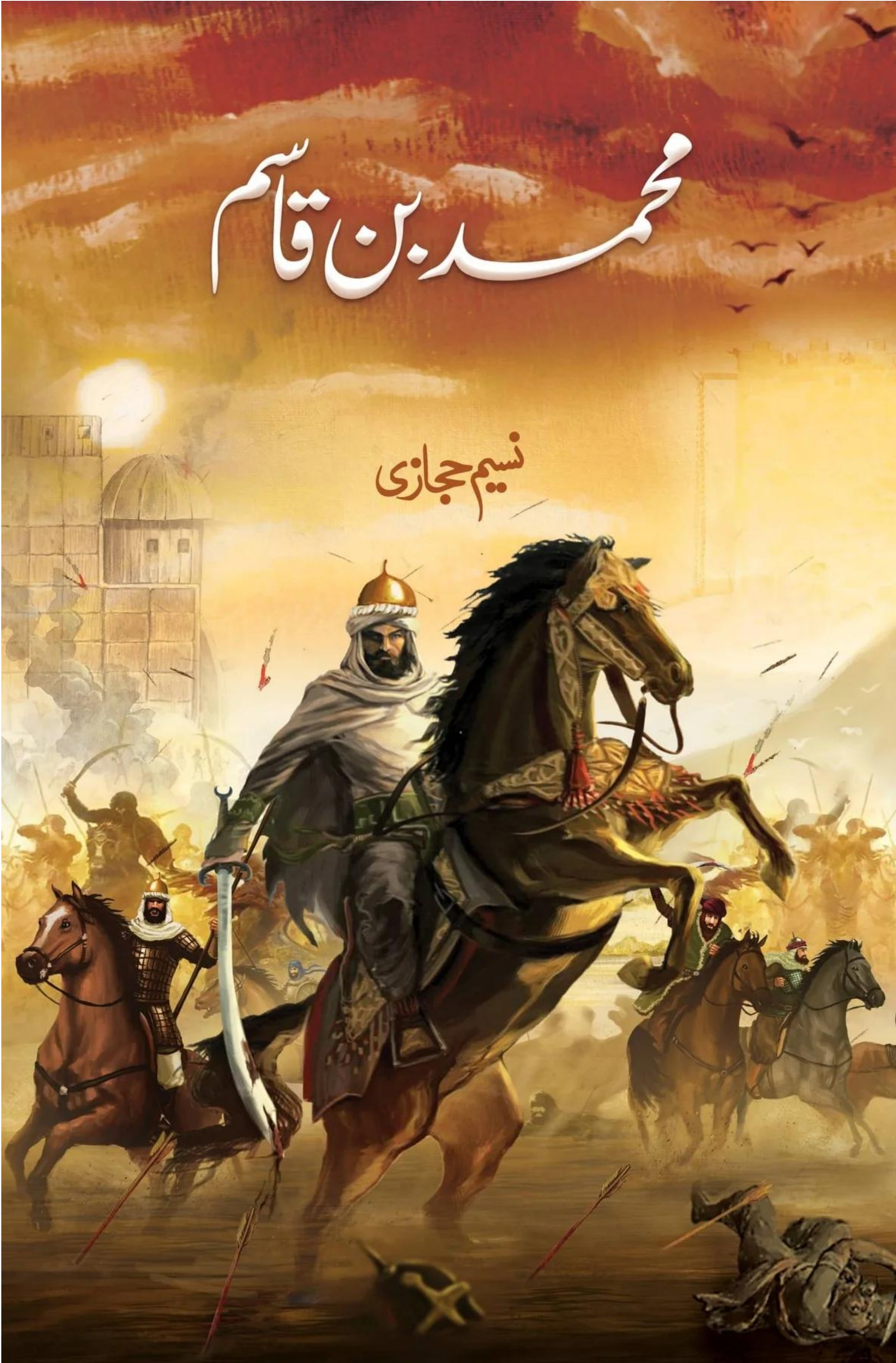
محمد بن قاسم
نسیم حجازی

محمدؐ بن قاسم

نسیم حجازی

فہرست

ابوالحسن 8

سراندیپ کے دربار میں 65

قزاق 96

گنگو اور اُس کی سرگزشت 123

دیبل 148

قیدی 172

مایا کی پریشانی..193

بہن اور بھائی 226

دوست اور دُشمن 248

آخری اُمّید..284

قتیبہ کا ایلچی 321

بصرہ سے دمشق تک 367

سپاہی اور شہزادہ 389

پہلی فتح 423

سب کا مُحسن 466

صُبح کا ستارہ 491

سندھ کا نیا سپہ سالار 506

راجہ داہر کی آخری شکست 531

برہمن آباد سے ارَوَر تک 548

اُن کا دیوتا 574

سلیمان کا قیدی 595

غروبِ آفتاب 608

ابو الحسن

ہندوستان کے مغربی ساحل کی اہم بندر گاہوں اور جزیرہ سراندیپ (موجودہ سری لنکا یا سیلون) کے ساتھ ایک مدّت سے عربوں کے تجارتی تعلّقات چلے آتے تھے۔ زمانہ جاہلیت میں چند عرب تاجر سراندیپ میں آباد ہو گئے تھے۔ اور جب عرب میں ایک نئے دین کا چرچا ہونے لگا تو یہ دین اُن تاجروں کو اپنے آباو اجداد کے مذہب کو ترک کرنے پر آمادہ نہ کر سکا لیکن ایرانیوں اور رومیوں کے مُقابلے میں عربوں کی شاندار فتوحات کی خبریں سُن کر اُن کی قومی عصبیت جاگ اُٹھی۔ ایران، عرب کے مُقابلے میں ایک متمدّن ملک سمجھا جاتا تھا۔ اِس لیے ہندوستان کے

بازاروں میں عرب کے مُقابلے میں ایران کی مصنوعات کی زیادہ قدر تھی۔ اِس کے علاوہ ہندوستان کے حکمران ایران کو ایک طاقتور ہمسایہ خیال کرتے تھے، اور عربوں کے مقابلے میں ایرانی تاجروں کو زیادہ عزّت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اگر شام سے کوئی قافلہ آجاتا، تو روما کی قدیم سطوت سے مرعُوب ہندوستانی انہیں بھی عربوں سے زیادہ مراعات دیتے لیکن حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق کی شاندار فتوحات نے عربوں کے متعلّق ہمسایہ ممالک کے باشندوں کا زاویہ نگاہ تبدیل کر دیا۔ سراندیپ اور ہندوستان کے دوسرے حصّوں میں آباد ہونے والے وہ تاجر جو ابھی تک عرب کے اندرونی انقلاب سے متاثر نہیں ہوئے تھے کُفر کے مُقابلہ میں اسلام کی فتوحات کو ایرانیوں اور رومیوں کے مقابلہ میں عرب کی فتوحات سمجھ کر خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے عربوں کے نئے دین سے اُن کی نفرت اب محبّت میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اُس زمانے میں جِن لوگوں کو عرب جانے کا اتّفاق ہوا وہ اسلام کی نعمتوں سے مالامال ہو کر واپس آئے۔

عبد الشمس عرب تاجروں کا سرکردہ تھا۔ اُس کا خاندان ایک مدّت سے سراندیپ میں آباد تھا۔ وہ اسی جزیرے میں پیدا ہوا، اور اُسی جگہ آباد ہونے والے ایک عرب خاندان کی لڑکی سے شادی کی جوانی سے بڑھاپے تک اُس کے بحری سفر بھی سراندیپ سے کاٹھیاواڑ تک محدود ہے۔ اُسے بھی معلوم نہ تھا کہ عرب میں اُس کے خاندان کے دوسرے افراد کون ہیں اور کس جگہ رہتے ہیں۔

دوسرے عربوں کی طرح وہ بھی مادرِ وطن کے ساتھ اس وقت دلچسپی لینے لگا جب یرموک اور قادسیہ مسلمانوں کی شاندار فتوحات کی خبریں دُنیا کے ہر گوشے میں پہنچ چکی تھیں۔

موجودہ راجہ کے باپ کو انہی خبروں نے عرب کے ایک گم نام تاجر کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے پر آمادہ کیا تھا۔ اُس نے عبد الشمس اور اُس کے ساتھیوں کو دربار میں لایا اور بیش قیمت تحائف دے کر رُخصت کیا۔

سنہ ۸۴ ھ میں اپنے باپ کی وفات کے بعد نئے راجہ کے تخت نشین ہوتے ہی عبد الشمس کو بُلایا اور کہا۔ ”مدّت سے ہمارے ملک میں تمہارے ملک کا

کوئی تاجر نہیں آیا، میں عرب کے تازہ حالات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ مُجھے تمھارے نئے دین کے ساتھ دلچسپی ہے۔ اگر تم وہاں جانا پسند کرو تو میں تمھارے لیے ہر سہولت مہیّا کرنے کے لیے تیّار ہوں۔"

عبدالشمس نے جواب دیا۔ "آپ کے منہ سے میرے دِل کی ہی آواز نکلی ہے۔ میں جانے کے لیے تیّار ہوں!"

پانچ عرب تاجروں کے سوا باقی سب عبدالشمس کا ساتھ دینے کے لیے تیّار ہو گئے۔

دس دِن بعد بندرگاہ پر ایک جہاز کھڑا تھا اور عرب اپنے بال بچّوں سے رُخصت ہو رہے تھے۔ عبدالشمس کی بیوی فوت ہو چکی تھی۔ اُس نے سینے پر پتھّر رکھ کر اپنی اکلوتی بیٹی کو الوداع کہا۔ اُس لڑکی کا نام سلمٰی تھا۔ شہر میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اُسے نسوانی حُسن کا بُلند ترین معیار تصور نہ کرتا ہو۔ شاہ سوار اُسے تند و سرکش گھوڑوں کو دوڑاتے اور بہترین تیراک اسے خوفناک آبشاروں میں کودتے اور سمندر میں مچھلی کی طرح تیرتے دیکھ کر دم بخود رہ جاتے تھے۔

عبد الشمس کی روانگی کے بیس دِن بعد کاٹھیاواڑ کے تاجروں کا ایک جہاز بندر گاہ پر رُکا اور عبد الشمس اور اُس کے دو ساتھیوں نے اُتر کر یہ خبر سُنائی کہ ان کا جہاز اور دوسرے ساتھی سمندر کی لہروں کا شکار ہو چکے ہیں اور اگر کاٹھیاواڑ کے تاجر کا جہاز وقت پر نہ پہنچتا تو وہ بھی چند ساعت اور پانی میں ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد ڈوب جاتے۔

راجہ نے اس حادثے کی خبر نہایت افسوس کے ساتھ سُنی۔ سندھی تاجروں کے سردار کا نام دلیپ سنگھ تھا۔ راجہ نے اُس سے دربار میں بُلایا اور تین عربوں کی جان بچانے کے عوض اسے تین ہاتھی انعام دیے۔۔۔ راجہ کو مہربان دیکھ کر دلیپ سنگھ اور اُس کے ساتھیوں نے وہاں آباد ہونے کا خیال ظاہر کیا۔ راجہ نے خوشی سے اُن کی یہ درخواست منظور کی اور شاہی خزانے سے اُن کے لیے مکان تعمیر کروادیے۔

چند سال کی وفادارانہ خدمات کے بعد دلیپ سنگھ راجہ کے بحری بیڑے کا افسرِ اعلیٰ بنادیا گیا۔

(۲)

اس واقعے کے تین سال بعد ابو الحسن پہلا مسلمان تھا جسے تجارت کا اِرادہ اور تبلیغ کا شوق اِس دُور اُفتادہ جزیرے تک لے آیا۔

کئی ہفتوں کے سفر کے بعد ایک صُبح ابو الحسن اور اس کے ساتھی جہاز پر کھڑے سراندیپ کے سر سبز ساحل کی طرف دیکھ رہے تھے۔

بندر گاہ کے قریب مرد، عورتیں اور بچّے کشتوں پر سوار ہو کر اور چند تیرتے ہوئے لوگ جہاز کے استقبال کو نکلے۔ ایک کشتی پر ابو الحسن کو جزیرے کی سیہ فام اور نیم عُریاں عورتوں کے درمیان ایک اجنبی صورت دکھائی دی۔ اُس کا رنگ سُرخ و سفید اور شکل و صورت جزیرے کے باشندوں سے بہت مختلف تھی۔ دوسری کشتیوں سے پہلے جہاز کے قریب پہنچنے کے لیے وہ اپنی کشتی پر کھڑی دو تنو مند ملّاحوں کو جو کشتی کے چپّو چلا رہے تھے، ڈانٹ ڈپٹ کر رہی تھی۔

یہ کشتی تمام کشتیوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی جہاز کے ساتھ آلگی۔ لڑکی نے ابو

الحسن کی طرف دیکھا اور اُس نے بے باک نگاہوں کا جواب دینے کی بجائے مُنہ دوسری پھیر لیا۔۔۔ ابو الحسن کے ساتھیوں کو بھی عورتوں کا نیم عریاں لباس پسند نہ آیا۔ حسین لڑکی نے جہاز والوں کی بے اعتنائی کو اپنی توہین سمجھتے ہوئے سراندیپی زبان میں کُچھ کہا لیکن جہاز پر سے کوئی جواب نہ آیا۔

اچانک ابو الحسن نے کسی کی چیخ پُکار سُن کر نیچے دیکھا۔ کشتی سے آٹھ دس گز کے فاصلے پر وہی خوبصورت لڑکی پانی میں غوطے کھا رہی تھی اور کشتی والے اُس کی چیخ پکار کے باوجود سخت بے اعتنائی سے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ابو الحسن نے پہلے رسّی کی سیڑھی پھینکی لیکن جب اِس بات کا یقین ہو گیا کہ لڑکی کے ہاتھ پاؤں جواب دے رہے ہیں اور وہ سیڑھی تک نہیں پہنچ سکتی تو وہ کپڑوں سمیت سمندر میں کود پڑا لیکن لڑکی اچانک پانی میں غائب ہو گئی اور وہ پریشان ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اتنی دیر میں بہت سی کشتیاں جہاز کے گرد جمع ہو چکی تھیں اور جزیرے کے باشندے قہقہے لگا رہے تھے۔

ابو الحسن نے تین مرتبہ غوطہ لگانے کے بعد دِل برداشتہ ہو کر سیڑھی کی رسّی پکڑ لی اور وہ جہاز پر چڑھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اوپر سے اُس کا ساتھی چلّانے لگا۔ ’’وہ اُدھر ہے جہاز کے دوسری طرف۔ وہ ڈوب رہی ہے۔ شاید کسی مچھلی نے پکڑ رکھا ہے۔‘‘

مقامی مردوں اور عورتوں نے پھر قہقہہ لگایا۔ ابو الحسن لڑکی کے جہاز کی دوسری طرف پہنچنے کی وجہ نہ سمجھ سکا۔ تشویش اور حیرانی کے مِلے جُلے جذبات کے ساتھ اُس نے جلد ہی پھر غوطہ لگایا اور جہاز کے نیچے سے گزرتا ہوا دوسری طرف پہنچ گیا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ اوپر سے اُس کا وہی ساتھی شور مچا رہا تھا۔

’’وہ ڈوب گئی۔ اُسے مچھلی نگل گئی۔‘‘

ابو الحسن مایوس ہو کر پھر دوسری طرف پہنچا۔ اِس دفعہ لوگوں کے قہقہوں میں اُس کے ساتھی بھی شریک تھے اور ایک عرب نے کہا۔ ’’آپ آ جایئے! وہ آپ سے بہتر تیر سکتی ہے۔‘‘

ابوالحسن نے کھسیانہ ہو کر سیڑھی پکڑ لی لیکن ابھی ایک ہی پاؤں اوپر رکھا تھا کہ کسی نے اُس کی ٹانگ پکڑ کر پانی میں گرا دیا۔ اُس نے سنبھل کر اِدھر اُدھر دیکھا تو لڑکی تیزی سے سیڑھی پر چڑھ رہی تھی۔ ابوالحسن جہاز پر پہنچا تو اس کے ساتھی پریشان سے ہو کر جزیرے کی لڑکی کے قہقہے سُن رہے تھے۔

لڑکی نے ابوالحسن کی طرف دیکھ کر عربی زبان میں کہا۔ ”مُجھے آپ کے بھیگ جانے کا بہت افسوس ہے۔“

لڑکی کے مُنہ سے عربی کے الفاظ سُن کر سب کی نگاہیں اس پر جم کر رہ گئیں۔ ابوالحسن نے پوچھا۔ ”کیا تُم عرب ہو؟“

لڑکی نے ایک طرف سر جھکا کر دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کے بالوں کا پانی نچوڑتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہاں میں عرب ہوں، ایک مدّت سے ہم عربوں کے جہاز کی راہ دیکھا کرتے تھے۔ میں آپ کو خوش آمدید کہتی ہوں۔ آپ کیا مال لائے ہیں؟“

ایک عرب لڑکی کو اس لباس میں دیکھنا ابو الحسن اور اس کے ساتھیوں کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ پریشان ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

لڑکی نے اپنے سوال کا جواب نہ پا کر پھر پوچھا۔ "میں پوچھتی ہوں آپ کیا مال لائے ہیں؟ آپ حیران کیوں ہیں۔ کیا عرب عورتیں تیرنا نہیں جانتیں۔ آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ اچھّا میں خود دیکھ لیتی ہوں۔"

ابو الحسن نے کہا۔ "ٹھہرو! ہم گھوڑے لائے ہیں۔ میں تمہیں خود دِکھاتا ہوں لیکن میں حیران ہوں کہ اِس جزیرے کے عرب ابھی تک زمانۂ جاہلیت کے عربوں سے بدتر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کیا اُنہیں انسانوں کا سا لباس پہننا اور مردوں سے حیا کرنا کسی نے نہیں سکھایا؟"

لڑکی کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا۔ اُس نے جواب دیا۔ "کیا یہ انسانوں کا لباس نہیں؟"

"نہیں معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے گھر تک اسلام کی روشنی ابھی ہی نہیں

آئی۔" یہ کہہ کر ابوالحسن نے ایک جُبّہ اُٹھایا اور لڑکی کے کندھوں پر ڈال کر بولا۔ "اب تُم ہمارا جہاز دیکھ سکتی ہو۔"

لڑکی نے ابوالحسن کے الفاظ سے زیادہ اُس کی شخصیت سے مرعوب ہو کر اپنے عُریاں بازوؤں اور پنڈلیوں کو جبّے میں چھُپالیا۔

ابوالحسن کی پونجی پچاس عربی گھوڑے تھے۔ لڑکی نے یکّے بعد دیگرے تمام گھوڑوں کا معائنہ کیا اور ایک گھوڑے کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "میں یہ خریدوں گی۔ اِس کی قیمت کیا ہے؟"

ابوالحسن نے کہا۔ "تُم میں ابھی تک عربوں کی ایک خصوصیت باقی ہے۔ یہی گھوڑا اِن سب میں بہترین ہے لیکن تُم نہ اِس کی قیمت ادا کر سکو گی اور نہ یہ عورتوں کی سواری کے قابل ہے۔ یہ جس قدر خوبصورت اور تیز رفتار ہے اسی قدر منہ زور بھی ہے۔"

لڑکی اِس جواب پر مُسکرائی اور بولی۔ "خیر دیکھا جائے گا، آپ نے جہاز اتنی دُور کیوں ٹھہرالیا؟"

ابو الحسن نے جواب دیا۔ ”میں اِس ملک کی حکومت سے اجازت لینا ضروری خیال کرتا ہوں۔“

لڑکی نے کہا۔ ”سراندیپ کا راجہ ایک مدّت سے عربوں کے جہاز کا انتظار کر رہا ہے۔ جہاز کنارے پر لے چلیے، لیجئے راجہ کے امیر البحر خود ہی پہنچ گئے۔“

دلیپ سنگھ، عبد الشمس سے گہرے تعلقات کی بدولت عربی میں اچھّی خاصی استعداد پیدا کر چُکا تھا۔ اُس نے جہاز پر چڑھتے ہی عربی زبان میں کہا۔ ”آپ نے جہاز اتنی دُور کیوں ٹھہرالیا؟“ ابوالحسن کی بجائے لڑکی نے جواب دیا۔ ”اِن کا خیال تھا کہ شاید جہاز کو بندرگاہ پر لگانے سے پہلے راجہ سے اجازت حاصل کرنا ضروری ہو!“

دلیپ سنگھ نے جواب دیا۔ ”مہاراج آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔“

لڑکی نے کہا۔ ”یہ میں جانتی ہوں لیکن اِس بات کا خیال رہے کہ وہ سفید

گھوڑا میرا ہے اور میں اُس کے مُنہ مانگے دام دوں گی۔" یہ کہ کر لڑکی نے جُبّہ اُتار کر ایک عرب کے کندھوں پر پھینک دیا اور بھاگ کر سمندر میں چھلانگ لگا دی:

(۳)

عبد الشمس کو عربوں کے جہاز کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ اُس نے شہر کے چند معزّزین کے ساتھ ابو الحسن اور اُس کے ساتھیوں کا استقبال کیا، اُنہیں اپنے گھر اور ان کے گھوڑوں کو اپنے اصطبل میں جگہ دی۔ آن کی آن میں پچاس گھوڑوں کے کوئی دو سو خریدار جمع ہو گئے اور تمام ایک دوسرے سے بڑھ کر بولی دینے لگے۔ دلیپ سنگھ نے مشورہ دیا کہ راجہ کو دِکھائے بغیر کوئی گھوڑا فروخت نہ کیا جائے۔ مُمکن ہے وہ تمام گھوڑے خرید لیں۔ عبد الشمس نے دلیپ سنگھ کی تائید کی۔ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ راجہ کا ایلچی آیا اور اُس نے کہا۔ "مہاراج عرب تاجر سے ملنا اور اُن کے گھوڑے دیکھنا چاہتے ہیں۔"

دلیپ سنگھ نے ایلچی سے کہا۔ "تُم جاؤ اور مہاراج سے کہو ہم ابھی آتے

ہیں۔" یہ کہہ کر ابو الحسن سے مخاطب ہوا۔ "ایک گھوڑا شیخ عبد الشمس کی بیٹی نے اپنے لیے منتخب کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اُسے یہیں رہنے دیا جائے۔"

ابو الحسن نے کہا۔ "اگر شیخ خود اپنے لیے لینا چاہتے ہیں تو مجھے قدر نہیں لیکن وہ لڑکیوں کی سواری کے قابل نہیں۔ وہ بہت سرکش ہے!"

ایک طرف سے آواز آئی۔ "نہیں ابّا جی! اِن کا خیال ہے کہ ہم اس کی قیمت ادا نہیں کر سکیں گے۔"

ابو الحسن نے دیکھا۔ وہی لڑکی جسے اُس نے جہاز پر دیکھا تھا۔ ایک ہاتھ میں لگام اور دوسرے ہاتھ میں چابک لیے کھڑی تھی لیکن اِس دفعہ اُس کا لباس عرب عورتوں کا سا تھا۔

ابو الحسن نے قدرے خفیف ہو کر کہا۔ "اگر مجھ پر اعتبار نہیں آتا تو خود دیکھ لو، اگر تُم اُسے لگام بھی دے سکو تو یہی گھوڑا تمہارا انعام ہو گا!"

لڑکی تیزی سے قدم اُٹھاتی ہوئی اصطبل کی طرف بڑھی۔ باقی سب لوگ

بھی اُس طرف چل دیے۔ لڑکی تمام گھوڑوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد سفید گھوڑے کی طرف بڑھی، گھوڑے نے اُسے دیکھتے ہی چارہ چھوڑ کر کان کھڑے کر لیے۔ لڑکی نے گھوڑے کو تھپکی دی اور وہ پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ اُسے دیکھ کر دوسرے گھوڑے رسّے تُڑوانے لگے۔

ابو الحسن نے کہا۔ ”ٹھہرو!“ اور آگے بڑھ کر گھوڑے کا رسّہ کھول کر باہر لے آیا اور اُسے ایک درخت کے ساتھ باندھ کر کہنے لگا۔ ”اب آپ ہمّت آزمائی کر سکتی ہیں۔“

لڑکی نے اچانک آگے بڑھ کر ایک ہاتھ سے گھوڑے کا نچلا جبڑا پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے زخمی درندے کی طرح تڑپتے، اُچھلتے اور کودتے ہوئے جانور کے مُنہ میں لگام ٹھونس دی۔ تماشائیوں نے حیرانی پر قابو نہ پایا تھا کہ اُس نے رسّہ کھولا اور گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو گئی۔ گھوڑا چند بار سیخ پا ہونے کے بعد چھلانگیں لگاتا ہوا مکان سے باہر نکل گیا۔

شیخ عبد الشمس نے فخریہ انداز میں کہا۔ ”عرب کی گھوڑیوں نے ایسا گھوڑا پیدا نہیں کیا جس پر سلمیٰ سواری نہ کر سکتی ہو، مجھے افسوس ہے کہ آپ

شرط ہار گئے لیکن اطمینان رکھیے کہ آپ کو اِس کی پوری قیمت ادا کی جائے گی۔“

ابوالحسن نے جواب دیا۔ ”یہ شرط نہ تھی، انعام تھا اور انعام کی قیمت نہیں لی جاتی۔ خوش قسمت ہے وہ گھوڑا جسے ایسا سوار مل جائے۔“

(۴)

راجہ دیکھنے سے پہلے ہی تمام گھوڑوں کو خریدنے کا فیصلہ کر چُکا تھا۔ شاہی خزانے سے جو قیمت ادا کی گئی، وہ عربوں کی توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ راجہ نے ابوالحسن سے عربوں کے نئے دین اور اُن کی فتوحات کے متعلّق کئی سوالات کیے۔ دلیپ سنگھ نے ترجمانی کے فرائض انجام دیے۔ ابوالحسن نے تمام سوالات کا جواب دینے کے بعد دینِ اسلام کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی۔ راجہ نے اسلام کی بہت سی خوبیوں کا اعتراف کرنے کے بعد ابوالحسن سے دوبارہ ملاقات کا وعدہ لے کر اُسے رخصت کیا۔ جب ابوالحسن اپنے میزبان کے گھر واپس پہنچا تو اُسے معلوم ہوا کہ سلمیٰ ابھی تک واپس نہیں آئی اور عبدالشمس چند آدمیوں کے ہمراہ اُس کی تلاش میں جا

چکا ہے۔ ابو الحسن نمازِ ظہر ادا کرنے کے بعد پریشانی کی حالت میں مکان کے صحن میں ٹہل رہا تھا کہ سفید گھوڑا بے تحاشا بھاگتا ہوا اندر آیا۔ گھوڑے کی لگام بھی غائب تھی۔

ابو الحسن نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "خُدا معلوم اِسے کیا ہوا۔ یہ گھوڑا سرکش ضرور ہے لیکن گِرے ہوئے سوار کو چھوڑ کر آنے والا نہیں اور لگام پاؤں کے نیچے آکر ٹوٹ سکتی تھی، لیکن اِس کا گِر پڑنا ممکن نہ تھا۔ میں جاتا ہوں۔"

ابو الحسن نے شیخ عبد الشمس کے خادم سے دوسری لگام منگوا کر گھوڑے کو دی اور ننگی پیٹھ پر سوار ہو کر مکان سے باہر نکلا اور گھوڑے کو اُس کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ گھوڑے کی رفتار ظاہر کرتی تھی کہ اُس سے بہت زیادہ کام لیا جا چُکا ہے۔ گھوڑا چند کوس گھنے جنگل میں سے گزرنے کے بعد ایک ٹیلے پر چڑھا اور ایک آبشار کے قریب پہنچ کر رُک گیا۔ اس سے اوپر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ کُچھ دیر اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد ابو الحسن گھوڑے سے اُترا اور اسے ایک درخت کے ساتھ باندھ کر سلمیٰ کو آوازیں دینے لگا۔

دیر تک تلاش کرنے کے بعد وہ تھک کر آبشار کے قریب ایک پتھّر کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ شام ہونے کو تھی۔ ابوالحسن نے عصر کی نماز ادا کی اور پھر ایک دشوار گزار راستے سے اُس مقام تک پہنچا جہاں سے پہاڑی ندی کا پانی ایک آبشار کی شکل میں نیچے گرتا تھا۔ سلمیٰ چند قدم کے فاصلے پر ندی کے کنارے ایک درخت کے نیچے لیٹی ہوئی تھی۔ ابوالحسن کی نظر اُس پہ اس وقت پڑی جب ایک تین چار گز لمبا اور آدمی کی ران کے برابر موٹا اژدہا گھاس میں سے سِرکتا ہوا اُس کے قریب پہنچ رہا تھا۔ ابوالحسن ”سلمیٰ! سلمیٰ!“ کہتا ہوا بھاگا اور اُس کا بازو پکڑ کر گھسیٹتا ہوا چند قدم دور لے گیا۔ سلمیٰ نے ہلکی سی چیخ کے ساتھ آنکھیں کھولیں۔ اژدہا شکار کو جاتا ہوا دیکھ کر پھنکارتا ہوا لپکا۔ اتنی دیر میں ابوالحسن نیام سے تلوار نکال چکا تھا۔ اژدہے نے اُس کے بالکل قریب پہنچ کر گردن بُلند کی۔ ابوالحسن نے ایک طرف کود کر وار کیا، اژدہے کا سر کٹ کر علیحدہ ہو گیا۔ ابوالحسن نے ندی کے پانی سے تلوار صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”تُم بہت بیوقوف ہو! سونے کی یہ کون سی جگہ تھی۔“

سلمیٰ ابھی تک دہشت زدہ ہو کر کانپ رہی تھی۔ وہ بولی۔ ”میں تھک کر یہاں بیٹھ گئی تھی اور اونگھتے اونگھتے نہ جانے کس وقت لیٹ کر سو گئی۔ میں یہاں کئی بار آ چکی ہوں لیکن ایسا اژدہا کبھی نہیں دیکھا۔ آپ پہنچ گئے، ورنہ یہ اژدہا اِس طرح تڑپنے کی بجائے مُجھے نگل رہا ہوتا۔ آپ یہاں کیسے پہنچے؟“

”تم جانتی ہو میں یہاں کیسے پہنچا ہوں۔ تُم بتاؤ کہ تُم نے یہاں پہنچ کر گھوڑا کیوں چھوڑ دیا تھا؟“

سلمیٰ نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں نے کب چھوڑا۔ وہ مُجھے گِرا کر بھاگ گیا تھا۔“

ابو الحسن نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ تمھاری تربیت بہت ناقص ماحول میں ہوئی ہے۔ اِس لیے تمھارے اخلاق کا معیار وہی ہونا چاہیے جو زمانہ جاہلیت کے عربوں کا تھا لیکن وہ بھی ہزار بُرائیوں کے باوجود مہمان سے جھوٹ بولنا ایک گھناؤنا فعل خیال کرتے تھے اور اِس گھوڑے کو خالی واپس آتا دیکھ کر مُجھے یقین نہ آتا تھا کہ یہ تمہیں گِرا کر

بھاگ آیا ہے۔ اِس کی تربیت میرے اصطبل میں ہوئی ہے۔ یہ سرکش اور مغرور ضرور ہے لیکن دھوکا دینا نہیں جانتا۔ سچ بتاؤ تُم نے اپنے ہاتھوں سے اِس کی لگام نہیں اُتاری اور اِسے ڈرا دھمکا کر واپس نہیں بھیجا؟"

سلمٰی نے آنکھیں جھکاتے ہوئے جواب دیا۔ "اگر آپ بُرا مانتے ہیں تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ کبھی جھوٹ نہ بولوں گی۔"

"تم میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جنہیں میں بُرا سمجھتا ہوں۔ جنہیں ہر مسلمان بُرا جانے گا۔"

"آپ چاہیں تو میں ہر عادت بدلنے کے لیے تیّار ہوں۔ آپ کی خوشنودی میرا فرض ہے اور آپ نے تو آج میری جان بھی بچائی ہے۔"

"تمہیں مجُھے خوش کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں چاہتا ہوں تمہارا خُدا تُم سے خوش ہو۔ تمہیں صرف وہ چیز پسند کرنی چاہیے جو اُسے پسند ہو اور ہر اُس چیز کو ناپسند کرنا چاہیے جو اُسے ناپسند ہو۔ خُدا کو عورتوں کا نیم عُریاں لباس میں مردوں کے سامنے جانا پسند نہیں۔"

سلمٰی نے جواب دیا۔ ”لباس تو میں نے آپ کے کہنے سے تبدیل کر لیا ہے۔“

ابوالحسن نے کہا۔ ”لباس سے زیادہ دِل کی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ خیر اب باتوں کا وقت نہیں۔ شام ہو رہی ہے۔ تمہارے والد بہت پریشان ہوں گئے۔ وہ گھوڑے کے پہنچنے سے پہلے ہی تمہاری تلاش میں نکل گئے تھے۔

چاندنی رات میں ابو الحسن اور سلمٰی جنگل کو عبور کر رہے تھے سلمٰی گھوڑے پر سوار تھی۔ ابو الحسن باگ تھامے آگے آگے چل رہا تھا۔ راستے میں سلمٰی نے ابوالحسن کے بحری سفر، اُس کے خاندان اور اُس کے ساتھیوں کے متعلّق سوالات کیے لیکن اُس کی توقع کے خلاف ابوالحسن کی بے اعتنائی بڑھتی گئی۔ سلمٰی پریشان بھی تھی اور نادم بھی۔ بالآخر اُس نے کہا: ”آپ کو میری وجہ سے بہت تکلیف ہوئی، میں معافی چاہتی ہوں۔ آپ مُجھے سزا دے لیں لیکن خفا نہ ہوں۔ یہ میرا قصور تھا اور مُجھے پیدل چلنا چاہیے تھا۔ میں اتر آتی ہوں۔ آپ گھوڑے پر سوار ہو جائیں۔“

اس دفعہ بھی اُس کی توقع کے خلاف ابو الحسن نے سرد مہری سے جواب دیا۔ ”اگر مجھے اِس بات کا خدشہ نہ ہوتا کہ تُم ایک عورت ہو اور کوئی درندہ تمہیں کھا جائے گا تو میں یقیناً اِس وقت تمہارے ساتھ چلنا گوارا نہ کرتا۔“

سلمیٰ شکست خوردہ سی ہو کر تھوڑی دیر خاموش رہی۔ پھر بولی۔ ”اگر وہ اژدہا مجھے نِگل جاتا تو آپ کو اِس بات کا افسوس ہوتا؟“

”یہ صرف تمہارے لیے ہی نہیں۔ میرے سامنے اگر وہ کسی کو بھی ہلاک کرتا تو مجھے اُسی قدر افسوس ہوتا۔“

”آپ نے میرے لیے اپنی جان خطرے میں کیوں ڈالی؟“

”ایک انسان کی جان بچانا مسلمان کا فرض ہے۔“

سلمیٰ دیر تک خاموش رہی۔ دُور سے چند گھوڑوں کی ٹاپ سُنائی دی اور ابو الحسن نے کہا۔ ”دیکھو! وہ ابھی تک تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔“

تھوڑی دیر بعد عبد الشمس اور اُس کے ساتھی پہنچ گئے۔ بیٹی کو سلامت

دیکھ کر عبد الشمس نے واقعات کی تفصیل میں جانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ سلمیٰ کی زبانی اژدھے کے متعلّق سُن کر اُس نے ابو الحسن کا شکریہ ادا کیا۔

(۵)

اگلے روز علی الصباح عبد الشمس اپنے مکان کی چھت پر نیم خوابی کی حالت میں لیٹے لیٹے اذان کی دِلکش آواز سُن رہا تھا۔ کُچھ دیر انگڑائیاں لینے کے بعد اُس نے آنکھیں کھولیں۔ سلمیٰ ابھی تک گہری نیند سو رہی تھی۔ عبد الشمس اُسے جگا کر صُبح کی ہوا خوری کے اِرادے سے نیچے اُتر آیا۔

ابو الحسن کے ساتھی شبنم آلود گھاس پر چادریں بچھا کر اُس کے پیچھے صف بستہ کھڑے تھے۔ ابو الحسن نے نہایت دِلکش آواز میں سورۃ فاتحہ کے بعد چند آیات تلاوت کیں۔ قرآن مجید کے الفاظ نے عبد الشمس کے دِل میں تلاطم بپا کر دیا۔ اُس کے پڑوسی بھی اُس کے قریب آ کھڑے ہوئے اور اپنی قوم کے نوجوانوں کے نئے طریقِ عبادت کو دِلچسپی سے دیکھنے لگے۔ رکوع و سجود کے بعد دوسری رکعت تک عبد الشمس پر ایک بے خودی سی

طاری ہو چکی تھی۔ اُس نے آہستہ آہستہ نمازیوں کی طرف چند قدم اُٹھائے۔ قریب پہنچ کر جھجکا اور جذبات کے ہیجان کی کسی رَو کے ماتحت بھاگتا ہوا صف میں کھڑا ہو گیا۔ اُس کے ساتھیوں نے اُس کی تقلید کی۔ نماز کے اختتام پر ابوالحسن نے اُٹھ کر عبدالشمس کو گلے لگالیا۔ عبدالشمس کی آنکھوں میں مسرّت کے آنسو چھلک رہے تھے۔ ابوالحسن اور اُس کے ساتھیوں نے اُنہیں مبارک باد دی۔

عبدالشمس نے کہا۔ "آپ کی زبان میں ایک جادُو تھا، مُجھے کُچھ اور سُنایئے!"

ابوالحسن نے جواب دیا۔ "یہ میری آواز نہ تھی۔ یہ خُدا کا کلام تھا۔"

عبدالشمس نے کہا۔ "بے شک یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا۔ سُنایئے مُجھے!"

ابوالحسن نے اپنے ایک ساتھی طلحہ کی طرف اشارہ کیا۔ طلحہ قرآن کا حافظ تھا۔ عرب اُس کے اردگرد بیٹھ گئے۔ طلحہ نے سورۃ یٰسین کی تلاوت کی۔

قرآن مجید کے مقدّس الفاظ اور طلحہ کی دِل گُداز آواز سے عبدالشمس اور اُس کے ساتھیوں پر رقت طاری ہو گئی۔ تلاوت کے بعد ابو الحسن نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور اسلام کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے انہیں اسلام کی دعوت دی۔ عبدالشمس اور اُس کے ساتھی جو ایک مدّت سے عربوں کی عظمت کی داستانیں سُن کر رسول اکرم صلی علیہ وسلم کی عظمت کا اعتراف کر چُکے تھے۔ ابو الحسن کی تبلیغ کے بعد دینِ اسلام کی صداقت پر ایمان لے آئے۔ کلمۂ توحید پڑھنے کے بعد عبدالشمس نے اپنے لیے عبداللہ کا نام پسند کیا۔

سلمیٰ ناریل کے ایک درخت کا سہارا لیے کھڑی یہ تمام واقعات دیکھ رہی تھی۔ وہ جھجکتی ہوئی آگے بڑھی اور اپنے باپ سے کہنے لگی۔ ”ابّا جان! کیا عورتیں بھی مسلمان ہو سکتی ہیں؟“

عبداللہ نے مُسکراتے ہوئے ابو الحسن کی طرف دیکھا اور وہ بولا۔ ”خُدا کی رحمت عورتوں اور مردوں کے لیے یکساں ہے۔“

سلمیٰ نے کہا۔ ”تو میرا نام بھی تبدیل کر دیجیے! میں بھی مسلمان ہونا چاہتی

ہوں۔“

ابوالحسن نے کہا۔ ”یہ تمہارا ہی نام ٹھیک ہے۔ تُم فقط کلمہ پڑھ لو!“

سلمیٰ نے کلمہ پڑھا اور سب نے ہاتھ اُٹھا کر اُس کے لیے دُعا کی۔

آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ اچانک موسلا دھار بارش ہونے لگی اور یہ لوگ ایک کمرے میں چلے آئے۔ تھوڑی دیر بعد بارش تھم گئی اور دلیپ سنگھ نے آ کر خبر دی کہ ”مہاراج آپ کا انتظار کر رہے ہیں!“

ابوالحسن اپنے ساتھیوں کو وہیں چھوڑ کر دلیپ سنگھ کے ساتھ ہو لیا۔

(٦)

دوپہر کے وقت ابوالحسن واپس آیا اور اُس نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ راجہ اور بعض سرداروں نے اور بھی عربی گھوڑے خریدنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اس لیے ہمارا جہاز چوتھے روز واپس روانہ ہو جائے گا۔

عبداللہ (عبدالشمس) نے اُنہیں کُچھ دِن اور ٹھہرنے کے لیے کہا لیکن ابو

الحسن نے جلد واپس آنے کا وعدہ کر کے اجازت حاصل کرلی۔ عبداللہ نے کہا۔ ”ابھی ہمیں اسلام کے متعلّق بہت کُچھ جانتا ہے۔ اگر آپ طلحہ کو یہاں چھوڑ جائیں تو بہت اچھّا ہو گا۔“

ابوالحسن نے طلحہ کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”اگر یہ پسند کریں تو میں انہیں بخوشی یہاں چھوڑنے کے لیے تیّار ہوں!“

طلحہ نے یہ دعوت خوشی سے قبول کرلی۔

اگلے دِن ابوالحسن کے ساتھی جہاز کے بادبانوں کی مرمّت اور خوردونوش کا ضروری سامان خریدنے کے لیے روانہ ہو چُکے تھے۔ دلیپ سنگھ اور عبداللہ سے مشورہ کرنے کے بعد ابوالحسن نے اپنے تمام سرمائے سے آٹھ ہاتھی اور باقی جہاز ناریل سے بھر لیا۔

شام کے وقت ابوالحسن عبداللہ کے باغیچے میں چہل قدمی کر رہا تھا کہ پیچھے سے کسی کے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ مُڑ کر دیکھا تو سلمیٰ کھڑی تھی۔ وہ چہرہ جو دو دِن پہلے مسرّتوں کا گہوارہ تھا اب حزن و ملال کی تصویر بنا ہوا تھا۔

وہ آنکھیں جو اندھیری رات کے ستاروں سے زیادہ دِلفریب اور چمکیلی تھیں، اب پُرنم تھیں۔

اُس نے قدرے بے اعتنائی سے پوچھا۔ "سلمٰی! تُم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

ابو الحسن کا رُوکھا پن دیکھ کر ضبط کی کوشش کے باوجود اُس کے آنسو چھلک پڑے۔ کانپتے ہوئے ہونٹوں سے درد کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی۔ "آپ پرسوں جا رہے ہیں؟"

"ہاں! لیکن تمہیں کیا ہوا؟ تُم رو کیوں رہی ہو؟"

"کُچھ نہیں! کُچھ بھی تو نہیں!!"

آنسوؤں میں بھیگی ہوئی مُسکراہٹ ابو الحسن کے دِل پر اثر کیے بغیر نہ رہی۔ اُس نے کہا۔ "سلمٰی! تُم ابھی تک وہی ہو۔ اسلام قبول کرنے کے باوجود میں تُم میں کوئی تبدیلی نہیں دیکھتا۔ تمہیں اب نامحرموں کے سامنے آنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ایک مسلمان لڑکی کا سب سے زیور حیا ہے۔"

"آپ اب تک مُجھ سے خفا ہیں۔ آپ کے کہنے پر میں لباس تبدیل کر چکی

ہوں، نماز پڑھ چکی ہوں۔ پرسوں سے میں نے گھر کے باہر پاؤں نہیں رکھا۔ کیا یہ بھی ضروری ہے کہ میں ایک مسلمان کے سامنے بھی نہ آؤں؟"

"ہاں! یہ بھی ضروری ہے۔ میں طلحہ کو یہاں چھوڑ کر جارہا ہوں۔ وہ تمہیں ایک مسلمان عورت کے فرائض سے آگاہ کرے گا۔ تمہیں اسلام کی صحیح تعلیم دے گا۔"

سلمٰی نے جواب دیا۔ "مُجھے کسی اور تعلیم کی ضرورت نہیں۔ آپ جو حکم دیں گے، میں مانوں گی۔ آپ کے اشارے پر میں پہاڑ پر سے کودنے اور ہاتھ پاؤں باندھ کر سمندر میں چھلانگ لگانے کے لیے تیّار ہوں!"

ابو الحسن نے کہا۔ "سلمٰی! اگر تمہیں میری خوشی اِس قدر عزیز ہے تو سنو۔ میں اِس کے سوا اور کُچھ نہیں چاہتا کہ تُم سر سے پاؤں تک اسلام کے سانچے میں ڈھل جاؤ۔ سچّے مسلمان کی ہر نیّت اور ہر فعل کو کسی انسان کی خوشی نہیں بلکہ خُدا کی خوشی کا طلب گار ہونا چاہیے۔ یہ کلمہ پڑھنے کے بعد تُم ایک ایسی دُنیا میں پاؤں رکھ چکی ہو، جو ایک لامتناہی جدوجہد کا گھر ہے۔

اِس میدان میں کودنے والے کے دِل میں آنسوؤں اور آہوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیے۔ مسلمان کے لیے زندگی ایک بہت بڑا امتحان ہے۔ اس کے پہلو وہ دِل ہونا چاہیے جو خُدا کی راہ میں زندگی کی بلند ترین خواہشات کو بھی قربان کرنے سے نہ گھبرائے۔ اُس کا سینہ تیروں سے چھلنی ہو لیکن زبان سے آہ تک نہ نکلے۔ تُم عرب جاؤ تو شاید یہ دیکھ کر حیران ہو گئی کہ مسلمان عورتیں اپنے شوہروں، بھائیوں اور بیٹوں کو جہاد پر رُخصت کرتی ہیں لیکن اُن کی آنکھ میں آنسو تو درکنار پیشانی پر شکن تک نہیں آتی اور یہ صرف اِس لیے کہ وہ خُدا کی خوشی کو دُنیا کی ہر خوشی پر ترجیح دیتی ہیں۔ اگر تُم نے مُجھے خوش کرنے کے لیے اسلام قبول کیا ہے تو مُجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑے گا کہ تُم اسلام کو سمجھی نہیں۔ اگر خُدا کو خوش کرنا چاہتی ہو تو گھر جاؤ۔ میں طلحہ کو بھیجتا ہوں، وہ آج ہی تمہیں قرآن پڑھانا شروع کر دے گا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ جب میں واپس آؤں تو تُم میری پیراکی کا امتحان لینے کے لیے ساحل سے ایک میل کے فاصلے پر سمندر میں میرا استقبال نہ کرو اور مُجھے جنگلوں اور پہاڑوں میں تمہیں تلاش نہ کرنا پڑے۔ مُجھے یہ دیکھ کر خوشی ہو گی کہ عبدالشمس کا نام تبدیل

ہونے کے بعد اُس کے گھر کا نقشہ بھی بدل چکا ہے اور اِس چار دیواری میں ایک مسلمان لڑکی پرورش پا رہی ہے۔"

سلمٰی نے پُر اُمّید ہو کر پوچھا۔ "آپ کب آئیں گے؟"

"میں دِن معیّن نہیں کر سکتا لیکن ارادہ یہی ہے کہ گھوڑے خریدتے ہی وہاں سے واپس آ جاؤں لیکن اگر مُجھے جہاد کے لیے کہیں جانا پڑا تو ممکن ہے کہ دوبارہ نہ آسکوں۔"

سلمٰی کے چہرے پر پھر ایک بار اُداسی چھا گئی اور اُس نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ "نہیں، یوں نہ کہیے! خُدا آپ کو واپس ضرور لائے گا۔"

"تُم دُعا کرتی رہو گی تو انشاء اللہ میں ضرور آؤں گا۔"

سلمٰی نے کہا: "دُعا؟ آپ کیا کہتے ہیں اگر میری دُعا قبول ہو سکتی تو آپ جانے کا ارادہ کیوں کرتے؟" ابوالحسن نے اچانک محسوس کیا کہ وہ بہت زیادہ باتیں کر چُکا ہے۔ اُس نے لہجے کو ذرا تُرش بناتے ہوئے کہا۔ "سلمٰی!

اگر عرب کی تمام عورتیں تمہارے جیسی نیک دُعائیں کرتیں تو اسلام کی روشنی عرب کی حدود سے باہر نہ نکلتی۔“

سلمیٰ نادم سی ہو کر واپس ہوئی۔ بار بار اُس کے منہ سے یہ الفاظ نکل رہے تھے۔ ”میں بہت بے وقوف ہوں۔ میں نے یہ کیوں کہا۔“

تھوڑی دیر کے بعد وہ کوٹھے پر چڑھی اُفقِ مغرب پر گرم لوہے کے سُرخ نقال کی طرح چمکتا ہوا سورج پانی میں غوطہ لگانے کی تیّاری کر رہا تھا۔ آسمان پر کہیں کہیں ہلکے ہلکے بادل شفق کی سُرخی کی عکاسی کر رہے تھے۔ مرطوب ہوا کے جھونکے ناریل کے پتّوں پر ایک دِلکش راگ چھیڑ رہے تھے۔ اِرد گرد کے تمام مناظر سے ہٹ کر سلمیٰ کی نگاہیں سمندر کے کنارے عربوں کے جہاز پر مرکوز ہو گئیں۔ دِل میں ہیجان بپا ہوا۔ اُس نے ہاتھ اُٹھا کر دُعا کی۔ ”اے خُشکی اور تری کے مالک! مُجھے ایک مسلمان عورت کا ایمان دے۔ مُجھے سیدھی راہ دِکھا اور جب وہ واپس آئیں تو مُجھے دیکھ کر خفا نہ ہوں۔

(۷)

تیسرے دِن آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ سلمٰی کوٹھے پر چڑھ کر حسرت بھری نگاہوں سے سمندر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ساحل سے دور ابو الحسن کا جہاز موجوں پر رقص کرتا نظر آرہا تھا۔ ہوا کے چند تیز جھونکے آئے اور بارش ہونے لگی۔ بارش کی تیزی کے ساتھ اُس کی نگاہوں کا دائرہ محدود ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ جہاز آنکھوں سے اوجھل ہو گیا ضبط کی کوشش کے باوجود اُس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے اور رخساروں پر بہتے ہوئے بارش کے قطروں کے ساتھ مل گئے۔ سلمٰی دیر تک ہاتھ اُٹھا کہ یہ دُعا دہراتی رہی۔ ”میرے مولا! اُسے سمندر کی سرکش لہروں سے محفوظ رکھیو!“

باغیچے میں ابو الحسن سے آخری ملاقات کے بعد سلمٰی کے خیالات اور عادات میں بہت بڑی تبدیلی آچکی تھی۔ اُسے ابو الحسن کی بے اعتنائی کا بے حد ملال تھا۔ تاہم اُسے انسانیت کا بُلند ترین معیار تصوّر کرتے ہوئے وہ اِس بات پر ایمان لاچکی تھی کہ اس کی جو عادت ابو الحسن کو ناپسند ہے

یقیناً بُری ہو گی۔ چنانچہ اُس نے دوبارہ کسی کے سامنے بے حجاب ہونے کی جرأت نہ کی۔

جب ابو الحسن اور اُس کے ساتھی بندر گاہ کی طرف روانہ ہوئے تو اُس نے اپنے دِل سے یہ سوال کیا: "کیا اُس کے دِل میں میرے لیے کوئی جگہ ہو سکتی ہے؟" ابو الحسن کی باتیں یاد آتیں تو اُس کے دِل میں کبھی یاس کی تاریکیاں مسلط ہو جاتیں اور کبھی اُمّید کے چراغ چمک اُٹھتے۔

عبد اللہ کی آواز سُن کر وہ نیچے اُتری۔ بوڑھے باپ نے سوال کیا۔ "سلمیٰ! تُم بارش میں اوپر کیا کر رہی تھیں؟"

"کُچھ نہیں ابّا جی! میں۔۔۔" سلمیٰ کوئی بہانہ کرنا چاہتی تھی لیکن اُسے ابو الحسن کی نصیحت یاد آ گئی اور وہ بولی۔ "میں اُن کا جہاز دیکھ رہی تھی۔"

عبد اللہ نے کہا۔ "وہ تو دیر ہوئی جا چکے۔ جاؤ تُم کپڑے بدل آؤ۔ طلحہ ابھی آ جائے گا۔ ہم اُس سے قرآن مجید پڑھیں گے۔"

سلمیٰ نے پوچھا۔ "آپ اُنہیں کہاں چھوڑ آئے؟"

”وہ راستے میں زید کے گھر ٹھہر گیا تھا۔ ابھی آجائے گا۔“

چند دِنوں میں طلحہ کی تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلمیٰ اپنی ہر بات میں ابوالحسن کی خوشی کو مقدم سمجھنے کی بجائے خُدا کی رضا کو مقدم سمجھنے لگی۔ تاہم ہر نماز کے بعد اُس کی سب سے پہلی دُعا ابوالحسن کے لیے ہوتی تھی۔ چھ مہینے گُزر گئے۔ ابوالحسن کی کوئی خبر نہ آئی۔ سلمیٰ کی اداسی بے چینی میں تبدیل ہونے لگی۔ وہ صُبح و شام مکان کی چھت پر چڑھ کر سمندر کی طرف دیکھتی۔ بندر گاہ کی طرف آنے والا ہر نیا جہاز اُسے دور سے ابوالحسن کی آمد کا پیغام دیتا۔ وہ اپنے خادم کو دِن میں کئی کئی بار بندر گاہ کی طرف بھیجتی۔ جب وہ مایوس نگاہوں کے ساتھ واپس آتا تو وہ بے قرار سی ہو کر پوچھتی۔ ”تُم نے اچھّی طرح دیکھا۔ مُمکن ہے اُن میں کوئی عرب بھی ہو؟“

خادم جواب دیتا۔ ”وہ فلاں جگہ سے آیا ہے۔ میں پوری طرح چھان بین کر کے آیا ہوں۔ اُن میں ایک بھی عرب نہ تھا۔“

وہ اُمّید و بیم کے سمندر میں غوطے کھانے والے انسان کی طرح تِنکوں کا

سہارا لیتی اور کہتی۔ ”تم نے ملّاحوں سے پوچھا ہوتا۔ ممکن ہے اُنہوں نے راستے میں کسی بندر گاہ پر عربوں کا جہاز دیکھا ہو یا اُن کے متعلّق سُنا ہو؟“

خادم پھر بھاگتا ہوا بندر گاہ جاتا۔ سلمیٰ کی امنگیں پُرانی اُمّیدوں کے کھنڈروں پر نئی اُمّیدوں کا محل کھڑا کر لیتیں۔ بوڑھے نوکر کا افسردہ اور ملول چہرہ پھر وہی حوصلہ شکن خبر دیتا اور سلمیٰ کی اُمّیدوں کا محل دھڑام سے نیچے آرہتا۔ ہر صُبح وہ اپنے دِل میں اُمّید کے چراغ روشن کرتی۔ جب سورج سمندر کی لہروں میں چھُپ جاتا تو یہ چراغ بھی بُجھ جاتے۔ اُس کے دِل کی دھڑکنیں آہوں اور آنسوؤں میں تبدیل ہو جاتیں۔

مدّت تک طلحہ یا اپنے باپ میں سے کسی پر اُس نے اپنے دِل کا حال ظاہر نہ ہو دیا لیکن ایک شام سلمیٰ کے طرزِ عمل نے اُن دونوں کو شُبہ میں ڈال دیا۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی، طلحہ اور عبد اللہ برآمدے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ سلمیٰ ایک کمرے کے دریچے کے سامنے بارش کا منظر دیکھ رہی تھی۔ باتوں باتوں میں ابو الحسن کا ذکر آگیا۔ عبد اللہ نے کہا۔ ”خُدا جانے وہ اب تک کیوں نہیں آئے۔ آٹھ مہینے ہو گئے ہیں۔“

طلحہ نے کہا۔ ”اگر خُدا نے اُسے سمندر کے حوادث سے محفوظ رکھا ہو تو اتنی دیر تک اُس کے واپس نہ آنے کی وجہ یہی ہے کہ وہ کہیں جہاد پر چلا گیا ہے۔“

عبداللہ نے کہا۔ ”آج مجُھے دلیپ سنگھ نے بتایا ہے کہ یہاں سے کوئی تیس میل کے فاصلے پر مالابار کا ایک جہاز غرق ہو چکا ہے۔ صرف ایک کشتی پانچ آدمیوں کو لے کر یہاں پہنچی ہے۔“

طلحہ نے پوچھا۔ ”اس پر کتنے آدمی تھے؟“

”شاید بیس تھے۔ جہاز بہت بڑا تھا اور اُس پر تجارت کا بہت سامال تھا“

”جہاز کیسے غرق ہوا؟“

”ملّاح منزل کو قریب دیکھ کر بے پرواہ ہو گئے اور یہ ایک چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔“

سلمٰی پاس کے کمرے میں بیٹھی ہوئی اپنے خیالات میں محو تھی۔ اُس نے فقط آخری فقرہ سُنا اور ایک ثانیہ کے لیے اُس کی رگوں میں خُون کا ہر قطر

منجمد ہو کر رہ گیا۔

بر آمدے سے پھر عبداللہ کی آواز آئی۔ "یہ چٹانیں بہت خطرناک ہیں۔ ہر سال اِن کی وجہ سے کوئی نہ کوئی جہاز غرق ہو جاتا ہے۔ یہاں کے باشندوں کا خیال ہے کہ یہ چٹانیں سمندر کے دیوتا کے مندر ہیں۔"

یہ سُنتے ہی سلمیٰ کی رگوں میں ایک غیر معمولی ارتعاش پیدا ہوا۔ وہ اٹھی اور اپنے کمرے سے نکل کر باپ کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اُس کا دہشت زدہ چہرہ اور پتھرائی ہوئی آنکھیں دیکھ کر باپ نے پوچھا۔ "بیٹی! تمہیں کیا ہوا؟"

کُچھ دیر جذبات کی شدّت کی وجہ سے سلمیٰ کے مُنہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ رنج و کرب کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی نگاہیں یہ کہہ رہی تھیں۔ "جو کُچھ تُم مُجھ سے چھپانا چاہتے ہو میں سُن چکی ہوں۔"

طلحہ نے حیران ہو کر پوچھا۔ "کیوں بیٹی کیا بات ہے؟"

سلمیٰ کے بھنچے ہوئے ہونٹ کپکپائے۔ تھرّائی ہوئی آنکھوں پر آنسوؤں

کے باریک پردے چھا گئے۔ اس نے کہا۔ ”بتائیے کب ڈوبا اُن کا جہاز؟ آپ کو کس نے بتایا ہے اور وہ۔۔۔۔ آپ خاموش کیوں ہیں؟ خُدا کے لیے کُچھ کہیے۔ میں! وہ! بُری سے بُری خبر سُننے کے لیے تیّار ہوں۔“ ہچکیوں اور آہوں کی شدّت اُس کی آواز کے تسلسل کو توڑ رہی تھی۔

عبد اللہ نے پریشان سا ہو کر جواب دیا۔ ”بیٹی! ہم مالا بار کے ایک جہاز کا ذکر کر رہے تھے۔ آج دلیپ نے مجُھے بتایا تھا۔“

لیکن سلمیٰ نے باپ کا فقرہ پورا نہ ہونے دیا۔ ”نہیں نہیں آپ مُجھ سے چھپانا چاہتے ہیں۔ مُجھے جھوٹی تسلّیاں نہ دیں۔“ یہ کہ کر سلمیٰ ہچکیاں لیتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

بوڑھا باپ کُچھ نہ سمجھا۔ وہ طلحہ کی طرف معذرت طلب نگاہوں سے دیکھتا ہوا اُٹھا اور سلمیٰ کے کمرے میں چلا گیا۔ سلمیٰ مُنہ کے بل بستر پر لیٹی ہچکیاں لے رہی تھی۔

بوڑھے باپ کا دِل بھر آیا اور اُس نے قریب بیٹھ کر سر پر ہاتھ پھیرتے

ہوئے کہا۔ ”بیٹی کیا ہو گیا تمہیں؟“

سلمٰی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ آنسو اور ہچکیاں ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”کُچھ نہیں ابّا جان! مُجھے معاف کیجیے! آئندہ آپ مُجھے کبھی روتے نہیں دیکھیں گے۔“

”لیکن رونے کی کوئی وجہ بھی تو ہو؟ ایسی خبریں تو ہم روز سُنا کرتے ہیں۔ آخر مالابار کا ایک جہاز غرق ہو جانے کی خبر میں کیا خصوصیت تھی؟“

سلمٰی نے غور سے اپنے باپ کے چہرے کی طرف دیکھا اور قدرے مطمئن ہو کر بولی۔ ”آپ سچ کہتے ہیں؟“

عبداللہ نے برہم ہو کر کہا۔ ”آخر مُجھے جھوٹ کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ آج تک تُم نے میری کسی بات پر شک نہیں کیا۔ اگر مُجھ پر یقین نہیں آتا تو طلحہ سے پوچھ لو۔“

سلمٰی نے ندامت سے سر جھکا لیا اور کہا۔ ”ابّا جان! میں معذرت چاہتی ہوں میں سمجھتی تھی۔۔۔ کہ شاید آپ عربوں کے جہاز کا ذکر کر رہے

تھے۔"

"بیٹی! کیا تُم یہ سمجھتی ہو کہ خدانخواستہ اگر میں اُن کے جہاز کے متعلّق ایسی خبر سُنتا تو مُجھے تُم سے کم صدمہ ہوتا؟"

شام کے کھانے کے بعد طلحہ اور عبد اللہ کا خادم عشاء کی نماز ادا کر رہے تھے۔ خادمہ برتن صاف کر رہی تھی۔ اِتنے میں کسی نے باہر کے پھاٹک پر دستک دی۔ سلمٰی نے خادمہ سے کہا۔ "شاید زید اور قیس آتے ہیں۔ تُم نے باہر کا دروازہ بند تو نہیں کر دیا تھا؟"

خادمہ نے جواب دیا۔ "ایسی بارش میں کون آسکتا ہے۔ میں ابھی کواڑ بند کر کے آئی ہوں۔ اگر اُنہیں آنا ہوتا تو مغرب کی نماز کے لیے نہ آتے؟ اور ہاں زید تو بیمار ہے، قیس بے چارہ بوڑھا۔ اُس نے گھر ہی پر نماز پڑھ لی ہو گی۔"

"لیکن پھر بھی کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔"

"یہ آپ کا وہم ہے۔ دروازہ ہوا سے ہل رہا ہے۔"

"نہیں کسی کی آواز بھی سُن رہی ہوں۔ شاید۔۔۔۔۔! میں جاتی ہوں۔"

سلمیٰ کا دِل دھڑک رہا تھا۔ تاریکی میں ایک قدم آگے دیکھنا محال تھا۔ وہ بجلی کی چمک میں درختوں سے بچتی ہوئی پھاٹک تک پہنچی۔

پھاٹک کے باہر کوئی آہٹ نہ پا کر اُس کا دِل بیٹھ گیا۔ وہ مایوس ہو کر واپس ہونے کو تھی کہ کسی نے دروازے کو زور سے دھکّا دیتے ہوئے آواز دی۔ "کوئی ہے؟"

ایک آن کے لیے سلمیٰ کے پاؤں زمین سے پیوست ہو کر رہ گئے۔ پھر وہ لپک کر آگے بڑھی اور دروازہ کھول دیا۔ سلمیٰ کے سامنے ایک بُلند قامت انسان کھڑا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی اُس نے سوال کیا۔ "کیا یہ عبداللہ کا گھر ہے؟"

پیشتر اِس کے کہ سلمیٰ کوئی جواب دیتی بجلی چمکی اور ابو الحسن سلمیٰ کو پہچان کر اندر داخل ہوا۔

ابو الحسن نے کہا: "اوہو تُم! مُجھے افسوس ہے کہ اِس وقت میری وجہ سے

تمہیں بارش میں بھیگنا پڑا۔"

سلمیٰ نے اپنے دِل میں کہا۔ "کاش تُم یہ جان سکتے کہ اِس بارش کی بوندیں کِس قدر خوش گوار ہیں۔" اور پھر ابو الحسن سے مخاطب ہو کر بولی۔ "چلیے!"

بر آمدے میں طلحہ اور عبد اللہ ابو الحسن کی آواز سُن کر اُس کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ عبداللہ نے آواز دی:

"کون! ابو الحسن!!"

ابو الحسن نے بر آمدے کی سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں میں ہی ہوں۔ مُجھے افسوس ہے کہ میں نے خواہ مخواہ اِس وقت آپ کو تکلیف دی۔"

طلحہ نے پوچھا۔ "کہیے خیریت تو ہے نا! آپ کے ساتھی کہاں ہیں؟"

"ہاں خیریت ہے۔ میں اُن سب کو جہاز پر چھوڑ آیا ہوں۔ مُجھے معلوم نہ تھا کہ یہاں تک پہنچنے کے لیے مجھے اِتنے مراحل سے گزرنا پڑے گا۔ راستے

میں ایک دفعہ پھسلا۔ دو مرتبہ ندی میں گرا، پانچ مکانات کو آپ کا مکان سمجھ کر آوازیں دیں۔ ایک گھر کے چند فرض شناس کتّوں نے میرا استقبال کیا۔"

عبد اللہ نے سلمیٰ کو آواز دی۔ سلمیٰ ابھی بے خودی کے عالم میں بر آمدے سے باہر کھڑی تھی۔

آج بھی بارش کے قطرے اُس کے رُخساروں کے آنسو دھو رہے تھے لیکن یہ خُوشی کے آنسو تھے۔ باپ کی آواز سُن کر وہ چونکی اور بھاگتی ہوئی بر آمدے میں داخل ہوئی۔

"کیا ہے ابّا جان؟"

"بیٹی! جاؤ اِن کے لیے کھانا اور کپڑوں کا جوڑا لے آؤ اور باقی مہمانوں کے لیے بھی کھانا تیّار کراؤ! میں اُنہیں بُلانے کے لیے جاتا ہوں۔"

ابوالحسن نے کہا۔ "کھانا ہم سب کھا چکے ہیں۔ آپ تکلیف نہ کریں۔"

کپڑے بدلنے کے بعد ابوالحسن، عبد اللہ اور طلحہ سے دیر تک باتیں کرتا

رہا۔ اُس نے دیر سے واپس آنے کی یہ وجہ بیان کی کہ بصرہ سے اُسے افریقہ ایک مہم میں شریک ہونے کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔

ساتویں دِن عبد اللہ کی رضامندی نے سلمٰی اور ابوالحسن کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا۔

(۸)

تین سال بعد ابوالحسن شہر میں اپنے لیے ایک خوبصورت مکان اور اُس کے قریب ایک مسجد تعمیر کروا چُکا تھا۔ اُس کی دیکھا دیکھی اُس کے چند ساتھی بھی اُس شہر میں آباد ہو گئے۔ پانچ سال کے عرصے میں ابوالحسن اور طلحہ کی تبلیغ سے مقامی باشندوں کے چند گھرانے دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے اور ابوالحسن نے مسلمان بچّوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک مدرسہ تعمیر کر کے درس و تدریس کے فرائض طلحہ کے سپرد کر دیے۔

عبد اللہ کی بدولت اُس کی تجارت کو بہت فروغ ہوا۔ شادی کے دوسرے سال اُس کے ہاں ایک لڑکا اور چوتھے سال ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ لڑکے کا

نام اُس نے خالد اور لڑکی کا نام ناہید رکھا۔ دسویں سال ایک اور لڑکا پیدا ہوا لیکن تین ماہ کی عمر میں والدین کو داغِ مفارقت دے گیا۔

جب خالد کی عمر سات اور ناہید کی عمر پانچ برس تھی سلمٰی کے باپ نے چند دِن موسمی بخار میں مبتلا رہ کر داعی اجل کو لبیک کہا۔ ابو الحسن کو دُنیا کی ہر نعمت میسّر تھی۔ اس کے پاس مال و دولت کی کمی نہ تھی۔ اُسے اپنے بیوی بچّوں سے بے انتہا محبّت تھی لیکن یہ محبّت اُسے گھر کی چار دیواری میں پابندِ سلاسل نہ رکھ سکی۔ وہ قریباً ہر سال فریضہء حج ادا کرنے کے لیے ایک طویل بحری سفر کی کٹھن منازل طے کرتا۔ پانچ دفعہ اُس نے ایشیائے کوچک اور شمالی افریقہ میں جہاد کرنے والی افواج کا ساتھ دیا۔

ہر بار جہاد اور حج سے واپس آنے کے بعد وہ فنونِ حرب اور مذہبی تعلیم میں اپنے بچّوں کا امتحان لیتا۔ خالد تیر اندازی، شہسواری، تیغ زنی اور جہاز رانی کی تعلیم میں اپنے باپ کی بہترین توقعات پوری کر رہا تھا۔

ناہید بارہ سال کی عمر تک تیر اندازی کے علاوہ سرکش گھوڑوں پر سوار ہونا سیکھ چکی تھی۔ پڑھنے لکھنے میں بھی طلحہ کو اُس کی غیر معمولی ذہانت کا

اعتراف تھا۔

راجہ کے ساتھ ابو الحسن کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ مہارانی ایک مدّت سے سلمٰی کی سہیلی بن چکی تھی۔ وہ ہفتے میں ایک دو مرتبہ پالکی بھیج کر ماں اور بیٹی کو اپنے محل میں بُلاتی۔ راجکماری ناہید سے اس قدر مانوس ہو چُکی تھی کہ خود بھی کبھی کبھی ابو الحسن کے گھر چلی آتی۔

راجکمار عُمر میں خالد سے چار سال بڑا تھا لیکن پھر بھی وہ خالد کو ہر بات میں قابلِ تقلید سمجھتا۔

ایک دِن دلیپ سنگھ نے راجہ کے سامنے فنونِ حرب میں خالد کی غیر معمولی استعداد کی تعریف کی۔ راجہ نے پوچھا۔ ''کیا وہ ہمارے راج کمار کا مُقابلہ کر سکے گا؟''

دلیپ سنگھ نے جواب دیا۔ ''مہاراج! ہمارے راج کمار نازوں کے پلے ہوئے ہیں اور وہ ایک سپاہی کا بیٹا ہے؟''

''لیکن وہ بہت چھوٹا ہے۔'' دلیپ سنگھ نے جواب دیا۔ ''مہاراج! اگر

عرب مائیں بچپن میں اپنے بچّوں کی اِس طرح تربیت نہ کرتیں تو آج وہ آدھی دُنیا پر قابض نہ ہوتے۔ میں نے سُنا ہے کہ عرب مائیں چودہ سال کے بچّوں کو میدانِ جنگ میں بھیج دیتی ہیں۔"

راجہ نے پوچھا۔"خالد کی عُمر کیا ہے؟"

"مہاراج! یہی کوئی بارہ سال ہو گی۔"

"آخر اِن بچّوں میں کیا خوبی ہے۔ جو ہمارے بچّوں میں نہیں؟"

دلیپ سنگھ نے جواب دیا۔"مہاراج! اگر بُرا نہ مانیں تو میں عرض کروں۔"

راجہ نے کہا۔"کہو!"

"مہاراج! ہم میں اور اُن میں ایک بنیادی فرق ہے۔ ہم بے شمار دیوتاؤں کو مانتے ہیں۔ اُن دیوتاؤں کے علاوہ دُنیا کی ہر وہ طاقت جو ہمیں خوفزدہ کر سکتی ہے ہماری نگاہوں میں دیوتا کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ مثلاً ہماری راہ میں اگر کوئی دشوار گُزار پہاڑ آجائے تو ہم اپنی قوّتِ تسخیر کے امتحان کی

بجائے اُسے دیوتا سمجھ کر اُس کی پوجا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن وہ صرف ایک خُدا کو مانتے ہیں اور اُس کے سوا روئے زمین کی کسی بڑی سے بڑی قوّت کے سامنے سر جھُکانا گناہ سمجھتے ہیں۔ اِس کے علاوہ اُن کا ایمان ہے کہ انسان مر کر فنا نہیں ہوتا بلکہ موت کے بعد اُس کی نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ ابو الحسن نے ایک دِن مُجھے بتایا تھا کہ جب خالدؓ، اُن کا بہت بڑا سپہ سالار، شام کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا تو شام کے گورنر نے اُسے لکھا تھا کہ تُم پہاڑ سے ٹکرا رہے ہو۔ تمہارے چالیس ہزار سپاہیوں کے مُقابلے میں میرے پاس اڑھائی لاکھ ایسی فوج ہے جو بہترین ہتھیاروں سے مسلح ہے۔ اِس کے جواب میں مسلمانوں کے سپہ سالار نے لکھا کہ مُجھے تمہاری طاقت کا اندازہ ہے لیکن تُم شاید یہ نہیں جانتے کہ تمہارے سپاہیوں کے دِلوں میں جس قدر زندہ رہنے کی آرزو ہے، میرے سپاہیوں میں موت کی تمنّا اُس سے کہیں زیادہ ہے۔"

راجہ نے کہا۔ "دلیپ سنگھ! میں یہ چاہتا ہوں کہ راج کمار کی سپاہیانہ تربیت ابو الحسن کو سونپ دی جائے۔ تُم اُس سے ملو۔ اگر وہ یہ خدمت قبول

کرے تو ہم ایک معقول معاوضہ دینے کے لیے تیّار ہیں۔"

دلیپ سنگھ کے کہنے پر ابوالحسن نے راجہ کی دعوت خوشی سے قبول کر لی لیکن معاوضہ لینے سے انکار کر دیا۔

دو سال کی تربیت کے بعد ابوالحسن نے راجہ سے کہا۔"اب آپ کا بیٹا فنونِ سپہ گری میں اِس ملک کے بہترین نوجوانوں کا مُقابلہ کر سکتا ہے۔"

راجہ نے پوچھا۔"میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ تیر اندازی اور شہسواری میں خالد کا مدِّ مُقابل ہے یا نہیں؟"

ابوالحسن نے جواب دیا۔"خالد نے اُس عمر میں تیر و کمان سنبھالا تھا جب آپ کا راج کمار کھلونوں سے دِل بہلایا کرتا تھا اور اُس عمر میں گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھنا سیکھا تھا جس عمر میں راج کمار کو نوکر کندھوں پر اُٹھائے پھرتے تھے۔ خالد فطرتاً ایک سپاہی ہے اور راج کمار فطرتاً ایک شہزادہ ہے۔"

"اور راج کمار تیغ زنی میں کیسا ہے؟"

”وہ خالد سے عُمر میں بڑا ہے، اُس کے بازو بھی اُسی قدر مضبوط ہیں۔ میں نے دونوں کا مقابلہ کرا کے نہیں دیکھا لیکن میرا خیال ہے کہ وہ خالد کی نسبت زیادہ آسانی سے تلوار گھما سکتا ہے۔“

راجہ نے بیٹے کو بُلا کر پوچھا۔ ”کیوں راج کمار! تُم اپنے اُستاد کے بیٹے سے تلوار کے دو دو ہاتھ دِکھانے کے لیے تیّار ہو؟“

راج کمار نے جواب دیا۔ ”نہیں پِتا جی! وہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ اگر میں ہار گیا مُجھے شرم آئے گی اور وہ ہار گیا تو بھی مُجھے شرم آئے گی۔“

(۹)

ابوالحسن کی شادی کو اٹھارہ برس گُزر چکے تھے۔ خالد کی عمر سولہ اور ناہید کی عمر چودہ برس تھی۔ خلیفہ ولید کی مسند نشینی کے ساتھ مسلمانوں کی نئی فتوحات کا آغاز ہو چکا تھا۔

ایک دِن سندھی تاجروں کا جہاز آیا۔ اُن کے ساتھ عمّان کا ایک عیسائی بھی تھا۔ سندھ کے تاجروں نے جزیرے کے عربوں سے ترکستان اور شمالی

افریقہ میں مسلمانوں کی شاندار فتوحات کا ذکر کیا۔ عمّان کے تاجر نے اِن تمام باتوں کی تصدیق کی۔ ابو الحسن اور اُس کے چند ساتھی حج کے لیے تیّار تھے۔ اب حج کے اِرادوں کے ساتھ شوقِ جہاد بھی شامل ہو گیا۔

راجہ باہر سے آنے والے تاجروں کی زبانی نئے ممالک کی خبریں نہایت دِلچسپی سے سُنا کرتا تھا۔ مسلمانوں کی تازہ فتوحات کی خبریں سُن کر اُس نے ابو الحسن کو بُلایا اور مسلمانوں کے خلیفہ اور عراق کے گورنر کو سونے اور جواہرات کے چند تحائف بھیجنے کی خواہش ظاہر کی۔

ابو الحسن نے جواب دیا۔ ”میں خوشی سے آپ کے تحالف اُن کے پاس لے جاؤں گا۔“

سندھ کے تاجروں نے اپنا مال فروخت کیا اور نیا خرید کر لوٹ گئے۔ اُن کے جانے کے چند دِن بعد ابو الحسن اور اُس کے ساتھی سفر حج کے لیے تیّار ہو گئے۔ اِس سال سراندیپ کے نَو مُسلموں کے علاوہ حج پر جانے والے عربوں کی تعداد بھی خلافِ معمول زیادہ تھی۔

طلحہ اور اُس کے علاوہ تین اور عرب تاجر حج پر جانے والوں کے گھروں کی دیکھ بھال کے لیے پیچھے رہ گئے۔ بعض عرب اپنے کم سِن بچّوں کو طلحہ کی حفاظت میں چھوڑ کر بیویوں کو ساتھ لے گئے اور بعض اپنے اہل و عیال کو گھروں میں چھوڑ گئے۔

ابو الحسن اپنی بیوی اور بچّوں کو ساتھ لے جانے کا اِرادہ کر چُکا تھا لیکن سفر سے تین دِن قبل سلمیٰ اچانک بیمار ہو گئی اور اُسے یہ اِرادہ ملتوی کرنا پڑا۔

خالد عُقاب کے اُس بچّے کی طرح جو پر نکلنے کے بعد گھونسلے میں پھڑ پھڑا رہا ہو، میدانِ عمل میں اپنے سپاہیانہ جوہر دِکھانے کے لیے بے قرار تھا لیکن ماں کی علالت نے اُسے گھر ٹھہرنے پر مجبور کر دیا۔ ابو الحسن نے وعدہ کیا کہ واپس آتے ہی اُسے عرب کی سیاحت کے لیے بھیج دے گا۔

رُخصت کے دِن سلمیٰ کو سخت بخار تھا لیکن وہ انتہائی تکلیف کے باوجود بستر پر نہ لیٹی۔ شوہر کو الوداع کہنے سے پہلے اُس نے سراپا التجا بن کر کہا۔ ”دیکھیے! میں بالکل تندرست ہوں۔ مُجھے ساتھ لے چلیے۔ اپنے وعدے نہ بھُولیے۔“

ابو الحسن نے مغموم سا ہو کر جواب دیا۔ ”نہیں سلمیٰ! جہاز پر موسمی بخار تمہیں بہت تکلیف دے گا۔ تُم تندرست ہو جاؤ گی تو میں دوسرے سفر میں تمہیں ساتھ لے چلوں گا۔ دیکھو میں تمہاری تیمارداری کے لیے خالد اور ناہید کو چھوڑ کر جارہا ہوں۔ طلحہ بھی تمہارا خیال رکھے گا۔“

اُس نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ ”نہیں نہیں!! مُجھے ضرور لے چلیے۔ میں آپ کے ساتھ ہر تکلیف برداشت کر سکتی ہوں۔“

ابو الحسن نے کہا۔ ”سلمیٰ ضد نہ کرو۔ دیکھو تمہاری نبض کِس قدر تیز ہے۔ بخار سے تمہارا چہرہ سُرخ ہو رہا ہے۔ تُم نے کبھی سمندر کا سفر نہیں کیا۔ میں جلد واپس آجاؤں گا۔“

”نہیں، اِس دفعہ مُجھے معلوم ہو رہا ہے کہ آپ کا سفر بہت لمبا ہے اور میں شاید دیر تک انتظار نہ کر سکوں گی۔“

ابو الحسن نے مغموم صورت بنا کر جواب دیا۔ ”سلمیٰ! تم رو رہی ہو۔ کئی برس ہوئے میں نے تمہیں یہ بتایا تھا کہ مسلمان عورتیں مجاہدوں کو

رُخصت کرتے وقت آنسو نہیں بہاتیں۔"

اِن الفاظ نے سلمیٰ پر جادُو کا اثر کیا۔ اُس نے آنسو پونچھ ڈالے اور مُسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "میرے اِس درجہ مغموم ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ آپ جارہے ہیں۔ بلکہ یہ تھی کہ آپ مُجھے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ آپ اگر ایک بار مُجھے میدانِ جہاد میں لے جاتے تو پھر شاید مُجھے کمزوری کا طعنہ نہ دیتے۔ میں آپ کے ساتھ تیروں کی بارش میں کھڑی ہو سکتی ہوں لیکن آپ کے انتظار میں ہر روز صُبح و شام کوٹھے کی چھت پر چڑھ کر سمندر کی طرف دیکھنا میرے لیے صبر آزما ہو گا۔"

ابوالحسن نے جواب دیا۔ "یہی صبر عورتوں کا جہاد ہے۔ جو کام مرد میدان میں نہیں کر سکتے، وہ عورتیں گھر کی چار دیواری میں بیٹھ کے کر سکتی ہیں۔ عورتیں خالدؓ اور مثنیٰؓ نہیں بن سکتی لیکن اُن کی ماؤں کا رُتبہ حاصل کر سکتی ہیں۔ آج ہمارے سپاہی اپنے گھروں سے کوسوں دور لڑ رہے ہیں اور اُن کے عزائم وہ عورتیں بُلند رکھتی ہیں جو صبر و اِستقلال سے گھروں میں ماؤں، بہنوں اور بیویوں کی ذمّہ داری سنبھالے ہوئے ہیں۔ اُن پر اعتماد کی

بدولت اُن کے دِل میں یہ خیال بے چینی پیدا نہیں کرتا کہ گھر پر اُن کے ننھے بھائیوں اور بچّوں کا کیا حال ہو گا۔ سلمیٰ! تُم ہی بتاؤ کیا وہ سپاہی جسے یہ خیال ہو کہ اُس کی بیوی رو رو کر اندھی ہو گئی ہو گی اور بچّے گلیوں میں ٹھوکریں کھا رہے ہوں گے، ایک بہادر کی طرح مُسکرا کر جان دے سکتا ہے؟ فرض کرو، اگر میں نہ آؤں تو عرب کی دوسری ماؤں کی طرح خالدؒ کو جہاد پر رُخصت نہ کرو گی؟"

سلمیٰ نے جواب دیا۔ "آپ یقین رکھیے! اگر آپ خالدؒ کے لیے ایک بُرا باپ بننا گوارا نہیں کرتے تو میں بھی بُری ماں بننا پسند نہ کروں گی۔"

شام کے وقت ابو الحسن کا جہاز روانہ ہوا۔ "سلمیٰ ناہید کے ساتھ چھت پہ کھڑی سمندر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ضبط کے باوجود اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ناہید نے کہا۔ "امّی جان! آپ نے ابّا جان سے وعدہ کیا تھا کہ آپ ہمارے سامنے آنسو نہ بہائیں گی۔"

سلمٰی نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ ”بیٹی! کاش یہ میرے بس کی بات ہوتی، تمہارے باپ کے مُقابلے میں میرا دِل بہت کمزور ہے۔“

سلمٰی یہ کہہ کر بیٹھ گئی۔ ناہید نے اُس کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”امّی آپ کو ابھی تک بُخار ہے۔ آپ بستر پر لیٹ جائیں۔“

سراندیپ کے دربار میں

مہاراجہ سراندیپ تخت پر رونق افروز تھا۔ تخت سے نیچے دائیں بائیں آبنوس کی کُرسیوں پر چند سردار حسبِ مراتب بیٹھے تھے۔ راجہ کے دائیں ہاتھ سب سے پہلی کُرسی راج کمار اودھے رام کی تھی۔ راج کُمار ایک خُوش شکل اور بارُعب نوجوان تھا۔ کُرسیوں کے پیچھے دو قطاروں میں چند عہدہ دار ہاتھ باندھ کر کھڑے تھے۔ چوب دار دربار میں داخل ہوا اور رسمی آداب بجالانے کے بعد بولا۔ ”مہاراج! دلیپ سنگھ حاضر ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔“

راجہ پریشان سا ہو گیا اور بولا۔ "دلیپ سنگھ آ گیا! ابو الحسن اور اُس کے ساتھی کہاں ہیں؟"

چوب دار نے جواب دیا۔ "مہاراج! اُن میں سے اُس کے ساتھ کوئی نہیں۔ ایک عرب نوجوان ہے اور وہ بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہے۔"

راجہ نے بے قرار ہو کر کہا۔ "بلاؤ اُنہیں جلدی کرو۔"

چوب دار کے واپس جانے کے تھوڑی دیر بعد دلیپ سنگھ ایک بیس بائیس سالہ نوجوان کے ہمراہ داخل ہوا۔ دلیپ سنگھ کے ہاتھوں میں چاندی کا ایک طشت تھا جس میں ایک سونے کی ڈبیا اور ایک خنجر تھا۔ خنجر کے دستے میں بیش قیمت ہیروں کے نگینے جگمگا رہے تھے۔ دلیپ سنگھ دروازے اور تخت کے درمیان مختلف مقامات پر تین بار جھکا۔ پھر آگے بڑھا اور راجہ کے سامنے طشت رکھنے کے بعد ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا لیکن اِس دوران میں راجہ ولی عہد اور باقی حاضرینِ دربار کی نگاہیں زیادہ تر اُس کے نوجوان ساتھی پر مرکوز رہیں۔

یہ زمانہ جس سے ہماری داستان تعلّق رکھتی ہے، عرب کے صحرا نشینوں کی تاریخ کا سنہری زمانہ تھا۔ اسلامی فتوحات کی سیلابی موجوں کے سامنے اِس سے کئی سال قبل کفر کے مضبوط ترین قلعوں کی دیواریں کھوکھلی ہو چُکی تھیں اور اب ایک زبردست ریلا اُنہیں خس و خاشاک کی طرح بہائے لیے جا رہا تھا۔ ترکستان آرمینیا اور شمالی افریقہ کے میدانوں میں اُن کے گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے تھے۔ فتوحات کے سیلاب کی ایک لہر مشرق میں مکران تک پہنچ چکی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب قرب و جوار کے ملک کے باشندے ہر عرب کے چہرے پر سکندر کا بخت، ارسطو کی سی فراست اور سلیمان کا سا جاہ و جلال دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے۔ روئے زمین کی ایک پسماندہ قوم اسلام کی دولت سے مالا مال ہو کر دُنیا کی نگاہوں میں وہ بُلندی حاصل کر چُکی تھی جو آج تک کسی قوم کو نصیب نہیں ہوئی۔

سیلون (سراندیپ) کے راجہ کے دربار میں وہ نوجوان کھڑا تھا جس کے آباو اجداد یرموک اور قادسیہ کی جنگوں میں مشرق اور مغرب کی دو عظیم ترین سلطنتوں کی عظمت خاک میں ملا چکے تھے، وہ اِن نوجوانوں میں سے

تھا جِن کی صورت دیکھنے کے بعد کسی کو اُن کی سیرت کے متعلّق تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ راجہ اور اُس کے درباری ایک نظر میں اُس کی صورت اور سیرت کی ہزاروں خوبیوں کے معترف ہو چکے تھے۔ وہ بے پروائی سے قدم اُٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور دیکھنے والوں کی نگاہیں اُس کے جسم کی ہر جنبش میں ایک غایت درجہ کی خُود اعتمادی دیکھنے لگیں۔ اُس کے ہونٹوں کو جُنبش ہوئی اور تمام حاضرین ہمہ تن گوش بن گئے۔ کُچھ دیر ”السّلامُ علیکم“ کے الفاظ راجہ اور درباریوں کے کانوں میں گونجتے رہے۔ راجکمار ”وعلیکم السّلام“ کہہ کر مُسکراتا ہوا اُٹھا اور تمام سردار اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ راج کمار نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا اور تمام سردار دربار کے آداب کا لحاظ نہ رکھتے ہوئے باری باری آگے بڑھ کر اُس سے مصافحہ کرنے لگے۔ راج کُمار نے اُسے اپنے قریب بِٹھا لیا اور ٹوٹی پھوٹی عربی میں اُس سے باتیں کرنے لگا۔

راج کُمار نے پوچھا۔ ”آپ کا نام؟“

نو وارد نے جواب دیا۔ ”زبیر۔“

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"بصرہ سے۔"

"ابو الحسن اور اُن کے ساتھیوں کا پتہ چلا؟"

زبیر نے جواب دیا۔ "نہیں! مُجھے ڈر ہے کہ وہ راستے میں کسی حادثے کا شکار ہو چکے ہیں۔"

راج کُمار کے چہرے پر پژمردگی چھا گئی۔

راجہ کُچھ دیر یہ فیصلہ کر سکا کہ اُسے راج کُمار کی باتوں پر خوش ہونا چاہیے یا ناراض، حاضرین تخت کی بجائے اُن دو کرسیوں کی طرف دیکھ رہے تھے جن پر راج کُمار اور عرب نوجوان رونق افروز تھے اور راجہ کے لیے یہ نئی بات تھی لیکن اپنے اکلوتے بیٹے کے منہ سے عربی کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ سُننے کی مسرّت اس تلخی پر غالب آ رہی تھی۔ بالآخر اس نے کہا۔ "ہم آپ کو دیکھ بہت خوش ہوئے ہیں۔"

زبیر نے جواب دیا۔ "شکریہ! سر اندیپ کے راجہ کو ہمارے خلیفہ اور

والئی عراق سلام کہتے ہیں۔"

یہ فقرہ نصف عربی اور نصف سراندیپ کی زبان میں ادا کیا گیا۔ راجہ اور ولی عہد کی مُسکراہٹ دیکھ کر تمام درباری ہنس پڑے۔

راجہ نے پوچھا۔ "آپ نے ہماری زبان کہاں سے سیکھی؟"

زبیر نے دلیپ سنگھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ میرے استاد ہیں۔"

راجہ اور درباریوں نے دلیپ سنگھ کو پہلی دفعہ توجّہ کا مستحق سمجھا۔ راجہ نے کہا۔ "ہاں دلیپ! ابوالحسن کا کُچھ پتہ نہیں چلا؟"

دلیپ سنگھ نے جواب دیا۔ "مہاراج! اِس سال ہمارے ملک کا کوئی جہاز عرب کی کسی بندرگاہ تک نہیں پہنچا۔ بصرہ، مکّہ، مدینہ اور دمشق میں ہر جگہ اُن میں سے کسی نہ کسی کے رشتہ دار موجود تھے لیکن سب نے ہی بتایا کہ وہ حج پر نہیں پہنچے۔ واپسی پر میں ہر بندرگاہ سے اُن کا سُراغ لگاتا آیا ہوں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کے ساحل کے قریب اُن کا جہاز

کسی حادثے کا شکار ہو چکا ہے۔ مہاراج نے دمشق کے بادشاہ اور عراق کے حاکم کو جو تحائف بھیجے تھے، وہ بھی اُن کے پاس نہیں پہنچے، پھر بھی وہ آپ کا شکریہ ادا کرتے تھے۔ میں اُن کی طرف سے یہ تحائف آپ کی خدمت میں لایا ہوں۔ اس سونے کی ڈبیا میں ایک ہیرا ہے۔ یہ دمشق کے بادشاہ نے بھیجا ہے اور یہ خنجر عراق کے حاکم نے۔ میں عربی نسل کے آٹھ گھوڑے بھی لایا ہوں۔ چار سفید ہیں جو بادشاہ نے دیے ہیں اور چار مُشکی ہیں جو عراق کے حاکم نے بھیجے ہیں۔ اُنہیں شاہی اصطبل میں پہنچا دیا گیا ہے۔"

راجہ نے جھک کر ڈبیا اُٹھائی اور کھول کر کُچھ دیر چمک دار ہیرا دیکھنے کے بعد خنجر اُٹھا کہ اُس کے دستے کی تعریف کرتا رہا۔ اِس کے بعد اُس نے دونوں تحفے راج کُمار کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "دیکھو راج کُمار! یہ تحفہ اُس بادشاہ کا ہے جس کا لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ جس کی سلطنت میں کئی دریا کئی پہاڑ اور کئی سمندر ہیں۔ جس کے سپاہی پتھر کے قلعوں کو مٹّی کے گھروندے سمجھتے ہیں اور گھوڑوں پر سوار ہو کر دریاؤں کو عُبور کرتے ہیں

اور یہ خنجر مُجھے عراق کے حاکم نے بھیجا ہے جس کے نام سے بڑے بڑے بادشاہ کانپتے ہیں۔"

راج کُمار کسی اور خیال میں تھا۔ اس نے یہ دونوں چیزیں بے پروائی سے دیکھیں اور وزیر کے ہاتھوں میں تھما دیں۔ یہ تحالف جنہیں سراندیپ کا سادہ دِل راجہ روئے زمین کے تمام خزانوں سے زیادہ قیمت سمجھا تھا یکّے بعد دیگرے تمام درباریوں کے ہاتھوں میں گردش کرنے کے بعد پھر راجہ کے پاس پہنچ گئے۔ وہ کبھی خنجر کا دستہ ٹٹولتا اور کبھی ڈبیا کھول کر دیکھتا۔ بالآخر اُس نے زبیر کی طرف دیکھا اور کہا۔ "میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنی آنکھ سے تمہارے بادشاہ کو دیکھوں۔؛

زبیر نے کہا: "ہمارا کوئی بادشاہ نہیں۔"

راجہ نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "ابو الحسن بھی یہی کہا کرتا تھا کہ مسلمان کسی کو بادشاہ نہیں بناتے۔ آہ! بے چارہ کتنا اچھّا آدمی تھا۔ تلوار کا دھنی، بات کا پکّا۔ اُس کی لڑکی کو کس قدر صدمہ ہو گا اور وہ عبد الرحمان اور یوسف کس قدر شریف تھے۔ بھگوان جانے یہ خبر سُن کر اُن کے بال

بچّوں کی کیا حالت ہو گی، آپ ان سے ملے ہیں؟“

”جی نہیں! میں سیدھا آپ کے پاس آیا ہوں۔“ زبیر نے اپنی جیب سے ایک خط نکال کر راجہ کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ خط مجھے بصرہ کے حاکم نے دیا ہے۔“

راجہ نے دلیپ سنگھ کو اشارہ کیا۔ دلیپ سنگھ نے زبیر سے خط لے لیا اور اُسے کھول کر ترجمہ سنانے لگا۔

”مہاراج کو وائی بصرہ سلام کہتے ہیں۔ وہ عرب تاجروں کی بیواؤں اور یتیم بچّوں کے ساتھ نیک سلوک کے ممنون ہیں۔ اُن کی خواہش ہے کہ مہاراج اُن بیواؤں اور یتیم بچّوں کو بصرہ پہنچا دینے کا بندوبست کریں۔ وہ آپ کے ایلچی کے ساتھ اپنی فوج کے ایک سالار زبیر کو ایک جہاز دے کر بھیج رہے ہیں اور اُمّید کرتے ہیں کہ آپ بہت جلد اُن کی روانگی کا بندوبست کر دیں گے۔ والئی بصرہ کا خیال ہے کہ ابوالحسن اور اُس کے ساتھی ہندوستان کے مغربی ساحل پر کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہیں۔ اگر یہ پتہ چلا کہ اُن کا جہاز علاقہ کے بحری لُٹیروں نے غرق کیا ہے تو اُنہیں

سزا دینے میں کسی قسم کی تاخیر نہ ہو گی۔"

خط کا مضمون سُننے کے بعد راجہ گردن جھکائے دیر تک کُچھ سوچتا رہا۔ زبیر نے راج کمار کی طرف دیکھا۔ وہ آب دیدہ ہو کر چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ زبیر نے کہا۔ "آپ بہت پریشان ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو عربوں کے ساتھ بہت اُنس تھا۔"

راج کُمار کے بھنچے ہوئے ہونٹوں پر کپکپی سی طاری ہو گئی۔ اُس نے آنسوؤں کو ضبط کرنے کی ناکام کوشش کی۔ پھر اپنی جگہ سے اُٹھا اور کوئی بات کہے بغیر عقب کے کمرے میں چلا گیا۔

راجہ کو بذاتِ خود ابوالحسن کے ساتھ دِلی لگاؤ تھا۔ اُس کی موت کی خبر اُس کے لیے کم الم ناک نہ تھی لیکن مسلمانوں کے خلیفہ کے ایلچی کی موجودگی کا احساس اُسے انتہائی صبر سے کام لینے پر مجبور کر رہا تھا۔ راج کُمار کے اُٹھ جانے کے بعد اُس نے زبیر اور دلیپ سنگھ کے سوا تمام درباریوں کو رُخصت کا حکم دیا اور زبیر سے کہا۔ "راج کُمار کو ابوالحسن کے ساتھ بے حد اُنس تھا۔ میں بھی اُسے اپنا بھائی سمجھتا تھا۔ مجھے اُس کی موت کا بہت دُکھ

ہے لیکن یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اور اُس کے ساتھی مر چکے ہیں۔ مُمکن ہے کہ اُنہیں راستے میں بحری ڈاکوؤں نے گرفتار کر لیا ہو۔ مُجھے سب سے زیادہ بے چاری ناہید کا دُکھ ہے۔ ابھی وہ اپنی ماں کا غم نہیں بھولی۔ اب یہ صدمہ اُس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گا۔"

زبیر نے سوال کیا۔ "ناہید کون ہے؟"

راجہ نے جواب دیا۔ "وہ ابوالحسن کی اکلوتی بیٹی ہے۔ میں بھی اُسے اپنی ہی بیٹی سمجھتا ہوں۔ بہت اچھّی لڑکی ہے۔" اِس کے بعد راجہ دلیپ سنگھ کی طرف متوجّہ ہوا۔ "دلیپ! اُنہیں مہمان خانے میں لے چلو! اِس بات کا خیال رکھنا کہ اُنہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو، میں راج کُماری کو اُن بچّوں کو تسلّی دینے کے لیے بھیجتا ہوں۔"

زبیر نے کہا۔ "میں سیدھا آپ کے پاس چلا آیا تھا۔ اُن بچّوں کو ابھی تک نہیں دیکھا۔"

"بہت اچھّا۔ دلیپ سنگھ! اُنہیں اُن کے پاس لے جاؤ!"

(۲)

محل کے دروازے پر دلیپ سنگھ اور زبیر کو انیس برس کا ایک نوجوان ملا۔ اُس نے دلیپ سنگھ کو دیکھتے ہی سوال کیا: ”کیا یہ سچ ہے کہ ابّا جان کا جہاز جدّہ نہیں پہنچا؟“

دلیپ سنگھ نے ہاتھ بڑھا کر اُسے گلے لگا لیا اور کہا۔ ”خالد! میں ہر شہر اور ہر بندر گاہ میں اُنہیں تلاش کر چکا ہوں لیکن اُن کا کُچھ پتہ نہیں چلا۔“

خالد نے کہا۔ ”میں ابھی بندر گاہ سے ہو کر آیا ہوں۔ عرب کے چند جہاز ران بتاتے تھے کہ اُن کا جہاز سندھ کے ساحل کے قریب غرق ہو چکا ہے۔ آپ دیبل کے حاکم سے ملتے، شاید کوئی سُراغ مل جاتا۔“

دلیپ سنگھ نے جواب دیا۔ ”سندھ کا راجہ اور اُس کے اہلکار بہت مغرور ہیں۔ مُجھے ڈر تھا کہ دیبل کا سردار مُجھے کوئی تسلّی بخش جواب نہ دے گا۔ اِس لیے میں نے خود وہاں جا کی بجائے مکران کے مسلمان گورنر سے کہا تھا کہ وہ اپنا ایلچی بھیج کر معلوم کریں۔ دمشق میں آپ کے خلیفہ اور بصرہ میں

حجّاج بن یوسف سے ملنے کے بعد میں واپسی پر پھر مکران کے حاکم سے ملا تھا۔ سندھ سے اُن کا ایلچی واپس آ چکا تھا۔ اُس نے مُجھے بتایا کہ دیبل کے حاکم نے اُس جہاز کے متعلّق لاعلمی ظاہر کی ہے۔"

خالد نے کہا۔ "میں بندر گاہ سے سیدھا اِسی طرف آیا ہوں۔ کیا آپ ہمارے گھروں میں یہ خبر پہنچا چکے ہیں؟"

"نہیں! ہم ابھی وہاں نہیں گئے۔ میں اِنہیں مہمان خانے میں ٹھہرا کر تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

خالد زبیر کی طرف متوجّہ ہوا۔ "آپ کی مہمان نوازی ہمارا حق ہے۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔ کم از کم عورتوں اور بچّوں کو تسلّی دینے کے لیے تو۔۔۔۔!"

زبیر نے کہا۔ "چلو دلیپ سنگھ!"

اُس نے جواب دیا۔ "اگر مناسب خیال کریں تو آپ خالد کے ساتھ ہو آئیں میں اتنی دیر میں آپ کے ساتھیوں کو ٹھہرانے کا انتظام کر آؤں۔"

زبیر خالد کے ساتھ چل دیا۔ راستے میں اُس نے پوچھا۔ ”تم ابوالحسن کے بیٹے ہو؟“

”ہاں! لیکن آپ کو کس نے بتایا؟“

”میں تمام راستے دلیپ سنگھ سے تُم لوگوں کے متعلّق پوچھتا آیا ہوں۔ اُس کی باتوں سے تمہاری جو تصویر میرے ذہن میں تھی، تُم اُس سے مختلف نہیں ہو جس صبر و سکون کے ساتھ تُم نے یہ المناک خبر سُنی ہے، میں اُس سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ تُم سچ مچ خالد ہو۔“

خالد نے اپنے ہونٹوں پر ایک مغموم مُسکراہٹ لاتے ہوئے کہا: ”جب ابّا جان حج کے لیے رُخصت ہو رہے تھے تو میں نے بھی ساتھ جانے کے لیے اصرار کیا تھا: امّی کی علالت کی وجہ سے اُنہوں نے مُجھے ساتھ لے جانے سے اِنکار کر دیا۔ میں اُس وقت پہلی بار رویا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اُنہیں بہت دُکھ ہوا تھا۔ اُنہوں نے کہا بیٹا! خالد رویا نہیں کرتے۔ میں نے تمہیں اِس مجاہدِ اعظم کا نام دیا ہے جو زخموں سے چُور ہونے کے باوجود اُف تک نہ کرتا تھا۔

(۳)

شہر کے ایک کونے پر ایک ندی کے پاس عرب تاجروں کے مکانات تھے۔ ندی کے دونوں کناروں پر ناریل کے سرسبز درخت کھڑے تھے۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد خالد نے پتھّر کی ایک چار دیواری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہے ہمارا مکان۔“

چار دیواری کے اندر کیلوں اور ناریل کے درختوں کا ایک گُنجان باغیچہ تھا۔ پتھّر کے چھوٹے سے مکان کے سامنے ایک چبوترے پر بانس کا چھپّر تھا، جیسے ایک سرسبز بیل نے ڈھانپ رکھا تھا۔ ہوا بند ہونے سے فضا میں حرارت بڑھ رہی تھی۔ زبیر کو پسینے میں شرابور دیکھ کر خالد نے اُسے مکان کے اندر لے جانے کی بجائے اُس چبوترے پر بٹھانا مناسب خیال کیا۔

زبیر بید کے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ خالد کے اشارے سے ایک سیاہ فام لڑکا پنکھے سے اُسے ہوا دینے لگا۔ سیاہ فام لڑکا پنکھا ہلانے میں ایک طرح کی مسرّت محسوس کر رہا تھا لیکن زبیر نے خالد سے کہا۔ ”ہمیں اِس گرمی میں

اِسے تکلیف نہیں دینا چاہیے۔ اِسے کہو آرام کرے۔“

سیاہ فام لڑکے نے عربی میں جواب دیا۔ ”آپ ہمارے مہمان ہیں، مُجھے خدمت کے حق سے محروم نہ کیجیے۔“

زبیر نے کہا: ”اوہو! تُم عربی جانتے ہو۔“

لڑکے کی بجائے خالد نے جواب دیا: ”یہ بچپن سے ہمارے ساتھ رہتا ہے۔ اسے ہمارے ابّا جان نے پالا تھا۔“

لڑکے نے مزید تعارف کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”اور میں مسلمان ہوں۔ میرا نام علی ہے۔“

خالد نے سراندیپ کی زبان میں کچھ کہا اور علی پنکھا رکھ کر بھاگتا ہوا پاس ہی ایک ناریل کے اُونچے درخت پر سے چند ناریل توڑ لایا۔

ناریل کا پانی پینے کے بعد زبیر خالد سے کُچھ دیر باتیں کرتا رہا۔ اپنے باپ کے المناک انجام کی خبر کے باوجود خالد عربوں کی روائتی مہمان نوازی کا ثبوت دینے کے لیے زبیر کی ہر بات میں دلچسپی لینے کی کوشش کر رہا تھا۔

تاہم زبیر نے کئی بار محسوس کیا کہ اس کے ہونٹوں پر ایک غمگین مُسکراہٹ آہوں اور آنسوؤں سے کہیں زیادہ جگر دوز تھی۔

باتیں کرتے کرتے خالد نے کئی بار باہر کے پھاٹک کی طرف اُٹھ اُٹھ کر دیکھنے کے بعد علی سے پوچھا۔ ”علی! ناہید! ابھی نہیں آئی۔ جاؤ اُسے بُلا لاؤ۔“

علی اُٹھ کر باہر نکل گیا۔ خالد نے زبیر سے کہا: ”مہارانی اور راجہ کی بیٹی کو میری بہن سے بہت محبّت ہے۔ آج صُبح وہ خود یہاں آکر اُسے اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ اُسے یہ خبر سُن کر بہت صدمہ ہو گا۔ وہ ابھی تک امّی کی قبر پہ ہر روز جایا کرتی ہے اور اب!“

یہاں تک کہہ کہ وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر خاموش ہو گیا۔ زبیر نے مغموم لہجے میں پوچھا۔ ”آپ کی والدہ کب فوت ہوئیں؟“

”اُنہیں فوت ہوئے دو مہینے ہو چکے ہیں۔ ابّا کے حج پر جانے کے بعد وہ کُچھ مہینے موسمی بخار میں مُبتلا رہیں لیکن اُن کی موت کا باعث ابّا جان کا لا پتہ

ہوتا تھا۔ وہ صُبح اور شام مکان کی چھت پر چڑھ کر سمندر کی طرف دیکھا کرتی تھیں۔ جب دُور سے کوئی جہاز نظر آتا تو اُن کے چہرے پر رونق آ جاتی۔ وہ مُجھے خبر لانے کے لیے بندر گاہ کی طرف بھیجتیں اور جب میں مایوس لوٹتا تو دور سے میری شکل دیکھتے ہی اُن کی آنکھیں پتھرا جاتیں۔ زندگی کی آخری شام اُن میں زینے پر پاؤں رکھنے کی ہمّت نہ تھی۔ اُن کے اصرار پر ہم اُن کی چارپائی چھت پر لے گئے۔ وہ تکیے کا سہارا لے کر دیر تک سمندر کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہیں۔ بدقسمتی سے ہمیں اُس دِن کوئی جہاز بھی دِکھائی نہ دیا۔ میں نماز مغرب کی اذان سُن کر نیچے اُترا اور یہاں سے نزدیک ہی ایک مسجد میں چلا گیا۔ جب واپس آیا تو وہ آخری سانس لے چکی تھیں۔ اُن کی آنکھیں کھُلی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دُور اُفق پر کسی جہاز کو دیکھ رہی ہیں۔ ناہید نے مُجھے بتایا کہ اُن کے آخری الفاظ یہ تھے: ”ناہید! تمہارے ابّا ضرور آئیں گے۔ وہ بے وفا نہیں، میں بے وفا ہوں جو اُن کا انتظار نہ کر سکی۔“

زبیر نے اپنی بائیس سالہ زندگی میں تیروں اور نیزوں کے سوا کُچھ نہ دیکھا

تھا۔ وہ ایک نڈر ملّاح تھا اور فقط طوفانوں سے کھیلنا جانتا تھا۔ اُس کی زبان میٹھے اور شیریں الفاظ سے نا آشنا تھی۔ خالد کی باتوں سے بے حد متاثر ہونے کے باوجود وہ تسلّی اور تشفی کے موزوں الفاظ تلاش نہ کر سکا۔ وہ صرف اتنا کہہ کہ خاموش ہو گیا۔ ”خالد! مجُھے اُن کے حسرت ناک انجام کا بہت دُکھ ہے۔ کاش! میں تمہارے حصّے کا بوجھ اُٹھا سکتا۔“

علی بھاگتا ہوا واپس آیا اور کہنے لگا۔ ”وہ آرہی ہیں۔“

زبیر کی نگاہیں نادانستہ باہر کے دروازے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ ناہید آئی اور دور سے اپنے بھائی کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر جھجکی، رُکی اور چہرے پر نقاب ڈال لیا۔ ایک لمحہ کے توقّف کے بعد وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی آگے بڑھی۔

زبیر کو ایک دِل گُداز آواز سُنائی دی۔ ”کیا یہ سچ ہے کہ ابّا جان۔۔۔۔“

فقرے کا آخری حصّہ ہچکیوں میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔ زبیر نسوانی حسن و وقار کی ایک غیر فانی جھلک دیکھ چکا تھا۔ اُس کی نگاہیں اِس کے لیے تیّار نہ

تھیں اور پیشتر اِس کے کہ ناہید کا چہرہ نقاب میں چھپتا، اُس کی نگاہوں کا رُخ بدل چُکا تھا۔ وہ سامنے دیکھنے کی بجائے نیچے دیکھ رہا تھا۔

زبیر میں غایت درجہ کی حیا والدین اور ماحول کی تربیت کا نتیجہ تھی اور اِس کے علاوہ اُس کے کردار کی سب سے بڑی خوبی حد درجہ خود اعتمادی تھی۔ وہ لڑکپن میں اپنے باپ کے ساتھ دور دراز کے مُلک میں چکّر لگا چُکا تھا۔ اوائلِ شباب میں اُسے ایک تجربہ کار جہاز ران مانا جاتا تھا۔ وہ دور دراز کے مُلک میں غیر اقوام کی اُن شوخ و طرّار لڑکیوں کو دیکھ چکا تھا جو متاثر ہونے والی نگاہوں کی تلاش میں پھرتی ہیں۔ شام اور فلسطین میں بے شمار بے باک نگاہیں اُس کے مردانہ حسن کا اعتراف کر چکی تھیں، لیکن اُس دور کے عام نوجوانوں کی طرح وہ نگاہیں نیچی رکھنے کا عادی تھا۔

زبیر جہاز پر سفر کے دوران دلیپ سنگھ سے ہر عرب بچّے کے متعلّق سوالات پوچھ کر اپنے ذہن میں اُن کی خیالی تصویریں بنا چکا تھا۔ دلیپ سنگھ سے ابّوالحسن اور اُس کے بچّوں کے متعلّق جو کُچھ وہ سُن چکا تھا، اُس سے اس کا اندازہ یہ تھا کہ ابّوالحسن کے بچّے شکل و شباہت اور عادات و

اطوار میں باقی تمام بچّوں سے مختلف ہوں گے۔ یہ اُس کی دلچسپی کی پہلی وجہ تھی۔ پھر خالد کی زبانی جو کُچھ اُس نے سُنا، اُس کی دلچسپی میں اضافہ بھی ہو گیا اور اِس کے بعد جب علی ناہید کو بُلانے کے لیے گیا تو سابقہ دلچسپی کے ساتھ ایک ہلکی سی خلش کا بھی اضافہ ہو گیا۔ لیکن اُس کی دلچسپی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اس کی قوم کی ایک ستم رسیدہ لڑکی تھی۔

ناہید نے پھر کہا۔ ”مُجھے جواب دیجیے، کیا یہ سچ ہے؟ آپ مُجھ سے کیا چھپانا چاہتے ہیں۔ میں سُن چکی ہوں۔“

خالد نے اُٹھ کر آگے بڑھتے ہوئے جواب دیا۔ ”ناہید! تقدیر کے سامنے کسی کا بس نہیں چلتا۔“

زبیر نے اُسے تسلّی دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”مُجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے پاس کوئی خوشی کی خبر نہیں لا سکا۔۔۔“

ناہید کوئی اور بات کیے بغیر مکان کی طرف چل دی اور چند قدم آہستہ آہستہ اُٹھانے کے بعد بھاگ کر ایک کمرے میں داخل ہو گئی۔

خالد ایک لمحہ کے لیے تذبذب کی حالت میں کھڑا رہا۔ بالآخر زبیر کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”میں ابھی آتا ہوں۔“ خالد بھاگ کر ناہید کے کمرے میں داخل ہوا۔ ناہید بستر پر منہ کے بل پڑی ہچکیاں بھر رہی تھی۔ خالد نے پیار سے اس کا بازو پکڑ سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”ناہید! صبر سے کام لو۔“

علی زبیر کے پاس تھوڑی دیر بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا کمرے کے دروازے تک پہنچا۔ ناہید کی آہیں سُن کر اُسے زمین کی ہر شے اداس اور غمگین نظر آ رہی تھی۔ وہ سہا اور جھجکتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور ڈرتے ڈرتے خالد کے بازو کو چھو کر بولا۔ ”آپا ناہید کیوں رو رہی ہیں؟“

خالد نے اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں دیکھ کر پیار سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”علی ابّا جان واپس نہیں آئیں گے۔“

کم سِن بچّے کے منہ سے ایک جگر دوز نکلی۔ ”نہیں! نہیں!! یہ نہ کہیے۔ وہ ضرور آئیں گے۔“

خالد نے کہا۔ ”یہ دلیپ سنگھ کے ساتھ آئے ہیں۔ اُن کا جہاز شاید غرق ہو چکا ہے۔“

علی کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے پھوٹ نکلے اور وہ ہونٹ بھی بھینچ بھینچ کر چیخوں کو ضبط کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے کسی ایسی جگہ جانا چاہتا تھا جہاں اُس کی آواز سُننے والا کوئی نہ ہو لیکن باہر نکلتے ہی اُس نے پڑوس کے بہت سے لوگ اپنے گرد جمع کر لیے۔ تھوڑی دیر میں عربوں کے تمام بچّے عورتیں اور مرد خالد کے مکان کے صحن میں جمع ہو گئے۔ لوگوں کا شور و غوغا سن کے خالد باہر نکلا اور بیک وقت کئی زبانیں اُس سے مختلف سوالات پوچھنے لگیں۔

علی نے آگے بڑھ کر سب کو خاموش کیا اور خالد سے پوچھا۔ ”کیا جہاز کے غرق ہونے کی خبر درست ہے؟“ خالد نے اثبات میں سر ہلایا۔

اس نے زبیر کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا یہ خبر آپ لائے ہیں؟“

زبیر نے جواب دیا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں کسی اچھّی خبر کا ایلچی نہ بن

سکا۔"

طلحہ نے پوچھا۔ "جہاز کیسے غرق ہوا؟"

زبیر نے جواب۔ "ہم یہ معلوم نہ کر سکے۔"

زبیر نے بیواؤں اور یتیموں کو فرداً فرداً تسلّی دینے کے بعد عرب واپس جانے کے متعلّق اُن کے ارادے دریافت کیے۔

یتیم بچّوں اور بیواؤں نے یک زبان ہو کر واپس جانے کی خواہش ظاہر کی۔ زبیر دیر تک اُن کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ بالآخر نمازِ عصر کی اذان سُن کر اس نے لوگوں کے ہمراہ مسجد کا رُخ کیا۔

طلحہ کے اصرار پر زبیر نے امام کے فرائض انجام دیے۔ جب وہ مسجد سے نکلا تو دروازے پر راج کمار اور دلیپ سنگھ کھڑے تھے۔ خالد کو دیکھ کر راج کمار کی سیاہ اور چمک دار آنکھیں پُر نم ہو گئیں اور اُس نے آگے بڑھ کر خالد کو گلے لگا لیا۔

دلیپ سنگھ نے زبیر سے کہا۔ "مہاراج نے آپ کو یاد کیا ہے۔ خالد تُم بھی

چلو۔“

زبیر نے کہا۔ ”میں ابھی اُن سے مل کر آیا ہوں۔ کوئی خاص بات تو نہیں؟“

”مہاراج کے دل پر ابوالحسن کی موت کی خبر نے گہرا اثر کیا تھا۔ اس وقت وہ آپ سے زیادہ دیر باتیں نہ کر سکے۔“

زبیر نے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ راج کمار کو بھی اُن کے ساتھ گہری محبّت تھی۔ اُن کے آنسو ابھی تک خشک نہیں ہوئے۔“

دلیپ سنگھ نے کہا۔ ”ہاں راج کمار کو بہت صدمہ ہوا ہے۔ وہ اُنہیں بہت پیار کرتے تھے۔

(۴)

شاہی محل کی طرف جاتے ہوئے زبیر کو لوگوں کا ایک ہجوم جلوس کی شکل میں دکھائی دیا۔ دلیپ سنگھ نے کہا۔ ”مہاراج! آپ کے تحائف اور گھوڑوں کو دیکھ کر پھولے نہیں سماتے۔ ان کے حکم سے گھوڑوں کا جلوس

نکالا گیا۔ گھوڑوں کی لگام تھام کر بازار میں چلنے کی عزّت اُن لوگوں کے حصّے میں آئی ہے جو ہماری ریاست کے سب سے بڑے سردار ہیں۔ اگر انہیں ابّو الحسن کی موت کا غم نہ ہوتا تو شاید خود بھی اس جلوس میں شرکت کرتے۔"

زبیر نے قریب سے دیکھا تو دربار میں سب سے اگلی کرسیوں پر براجمان ہونے ہے والے آٹھ سردار گھوڑوں کی لگامیں تھامے ہجوم کے آگے چلے آرہے تھے۔ گھوڑوں پر جو دوشالے ڈالے گئے تھے وہ بیش قیمت موتیوں سے مرصع تھے۔

راج کمار نے مُسکراتے ہوئے زبیر کی طرف دیکھا اور کہا۔ "کیا آپ کے ملک میں بھی گھوڑوں کی یہ عزّت ہوتی ہے؟"

زبیر نے جواب دیا۔ "نہیں! ہم زیادہ تر اُن کے چارے اور پانی کی فکر کیا کرتے ہیں۔"

دلیپ سنگھ بولا۔ "یہ گھوڑوں کی عزّت نہیں۔ گھوڑے بھیجنے والوں کی

عزّت کی جا رہی ہے۔"

آسمان پر بادل چھا رہے تھے اور ہوا نسبتاً خوشگوار ہو رہی تھی۔ راجہ محل کی دوسری منزل پر ایک دریچے کے سامنے بیٹھا سمندر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ زبیر اور اس کے ساتھیوں کے قدموں کی چاپ سُن کر اُس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا اور اُٹھ کر زبیر کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد خالد کی طرف متوجّہ ہوا۔ "بیٹا مُجھے تمہارے باپ کی موت کا بہت دکھ ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کا جہاز طوفان کے باعث غرق ہو چکا ہے لیکن اگر یہ ثابت ہو گیا کہ راستے میں کسی نے حملہ کر کے ان کا جہاز غرق کر دیا ہے تو میں اس کی سرکوبی کے لیے اپنے تمام ہاتھی اور سارے جہاز بصرہ کے حاکم کے سپرد کر دوں گا۔"

راجہ سامنے کرسیوں کی طرف اشارہ کر کے بیٹھ گیا۔ زبیر اور خالد بھی بیٹھ گئے لیکن دلیپ سنگھ کھڑا رہا۔

راجہ نے دلیپ سنگھ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "بیٹھ جاؤ! تم نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ کل سے تم ہمارے دربار میں تمام سرداروں سے آگے راج کمار کے

پاس بیٹھا کرو۔‘‘

دلیپ سنگھ آگے بڑھ کر راجہ کے پاؤں چھُونے کے بعد کرسی پر بیٹھ گیا اور یہ زبیر سے مخاطب ہوا۔ ’’میں بصرہ کے حاکم کی مرضی کے خلاف کُچھ نہیں کر سکتا لیکن اگر آپ عرب بچّوں کو لاوارث سمجھ کہ یہاں سے لے جانا چاہتے ہیں تو مُجھے بہت افسوس ہو گا۔ میں اُنہیں اپنے بچّے سمجھتا ہوں۔ اگر وہ یہاں رہیں تو ان کی ہر ضرورت ہمارے شاہی خزانے سے پوری ہو گی، آپ ان سے پوچھ لیں اگر اُنہیں وہاں کوئی تکلیف ہو تو بے شک اُنہیں اپنے ساتھ لے جایئے۔‘‘

زبیر نے جواب دیا۔ ’’اُنہیں یہاں کوئی شکایت نہیں اور میں اپنی حکومت اور تمام عربوں کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہماری قوم کے یتیم بچّے اپنے ملک سے اس قدر دور رہیں۔ اُن کی بہتر تعلیم و تربیت وہیں پر ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد اگر وہ پسند کر لیں گے تو اُنہیں یہاں بھیج دیا جائے گا۔‘‘

راجہ نے پوچھا۔ ’’آپ سب کو لے جانا چاہتے ہیں؟‘‘

"نہیں! طلحہ اور چند تاجر یہیں رہیں گے۔" "لیکن خالد اور اس کی بہن بھی تو یہیں رہیں گے نا؟"

"نہیں! یہ بھی میرے ساتھ جائیں گے!"

راج کمار نے مغموم لہجے میں کہا۔ "نہیں! اُنہیں ہم نہیں جانے دیں گے۔ خالد کو میں اپنا بھائی بنا چکا ہوں۔"

"اور ناہید میری بہن ہے۔" پچھلے کمرے کے پردے کی آڑ سے ایک نسوانی آواز آئی اور چودہ پندرہ برس کی ایک لڑکی راجہ کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اُس کا رنگ راج کمار کی طرح سانولا تھا لیکن چہرے کے نقوش اُس کی نسبت تیکھے، آنکھیں خوبصورت اور چمک دار تھیں۔ اُس نے خالد کی طرف دیکھا اور کہا۔ "بھیّا تمہیں ماتا جی بُلاتی ہیں۔"

خالد اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا اور لڑکی نے چلتے چلتے راجہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ "پِتا جی! آپ اِن کی باتیں نہ سُنیں۔"

راجہ نے زبیر کی طرف دیکھ کر کہا۔ "دیکھا آپ نے؟"

زبیر نے کہا۔ ”بہت اچھا، میں اُن کی مرضی پر چھوڑتا ہوں۔“

خالد تھوڑی دیر بعد سر جھکائے واپس آکر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ راجہ نے پوچھا۔ ”بیٹا! اُنہوں نے یہ فیصلہ تُم پر چھوڑ دیا ہے۔ اب تم بتاؤ کیا تُم یہاں رہنا چاہتے ہو یا نہیں۔“

خالد نے جواب دیا۔ ”آپ کے ہم پر بہت احسانات ہیں۔ اگر میرے پیشِ نظر دُنیا کا کوئی آرام ہوتا تو میں آپ کا ساتھ کبھی نہ چھوڑتا لیکن اِس وقت ہماری قوم دور دراز کے مُلک میں جہاد کر رہی ہے اور میری رگوں میں ایک مجاہد کا خون ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ موجودہ وقت کی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے مُجھ سے کم عمر کے لڑکے بھی جہاد پر جا رہے ہیں۔ میں اِس سعادت سے محروم نہیں رہنا چاہتا۔ راجہ کُچھ دیر سر جھکا کر سوچنے کے بعد بولا۔ ”بیٹا! تُم ابو الحسن کے بیٹے ہو۔ اگر تم ارادہ کر چکے ہو تو مُجھے یقین ہے کہ تمہیں دُنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ خوش نصیب ہے وہ قوم جس کی مائیں تمہارے جیسے بچّے جنتی ہیں۔“

خالد نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ آپ مُجھے خوشی سے اجازت دیں۔“

راجہ نے جواب دیا۔ ”ابوالحسن کے بیٹے کی خوشی میری ناراضگی کا باعث نہیں ہوسکتی۔“

قزاق

دس دِن بعد ایک صُبح بندر گاہ پر دو جہاز سفر کے لیے تیّار کھڑے تھے۔ ایک جہاز پر زبیر یتیم بچّوں اور بیواؤں کو لے جارہا تھا اور دوسرے جہاز پر دلیپ سنگھ راجہ کی طرف سے حجاج بن یوسف اور خلیفہ ولید کے لیے ہاتھی، سونا، چاندی اور ہیروں کے مخالف لے کر جارہا تھا۔ ہاتھی تعداد میں دس تھے۔

راجہ اور ولی عہد زبیر اور اُس کے ساتھیوں کو رُخصت کرنے کے لیے بندر گاہ تک آئے۔ راجہ بیواؤں اور یتیم بچّوں میں سے ہر ایک کو گراں قدر

تحالف دے چکا تھا۔ زبیر کو اُس نے کئی چیزیں پیش کیں لیکن اُس نے فقط گینڈے کی ڈھال پسند کی۔ رانی اپنا موتیوں کا بیش قیمت ہار سخت اصرار کے بعد ناہید کو پہنا سکی۔ راج کماری رُخصت کے دِن اُس کے گھر آئی اور بضد ہو کر ناہید کو اپنی ہیرے کی انگوٹھی دے گئی۔

بندر گاہ پر جہاز میں سوار ہونے سے پہلے راج کمار نے آبدیدہ ہو کر خالد کو گلے لگا لیا اور اپنی موتیوں کی مالا اتار کر اُس کے گلے میں ڈال دی۔ جہازوں کے بادبان کھولے گئے اور ہوا کے جھونکے جہازوں کو دھکیلنے لگے۔ شہر کے لوگوں نے اپنے مہمانوں کو آنسوؤں اور آہوں کے ساتھ الوداع کہی۔

عورتوں کے لیے جہاز کے اندر ایک کشادہ کمرے کے علاوہ بالائی تختہ کے ایک حصّے پر بھی چلمنیں ڈال کر پردے کا انتظام کیا گیا تھا۔ خالد اِدھر اُدھر گھوم پھر کر ملّاحوں کے کام میں دلچسپی لے رہا تھا۔ ناہید، علی کے ساتھ تھی۔ جہاز پر کھڑی ناریل کے اُن بُلند قامت اور سر سبز درختوں کو دیکھ رہی تھی جن کی چھاؤں میں اُس نے زندگی کے بہترین دِن گزارے

تھے۔

صُبح شام میں تبدیل ہو گیا اور سر اندیپ کا ساحل اُفق پر ایک ہلکی سی سر سبز لکیر نظر آنے لگا۔ آہستہ آہستہ یہ لکیر بھی شام کے دُھند لکے میں چھُپ گئی۔ وہ آنسو جو دیر سے ناہید کی آنکھوں میں جمع ہو رہے تھے، ٹپک پڑے۔ علی بھی اپنا آبائی وطن چھوڑنے پر قدرے ملول تھا۔ لیکن اس کے دل میں خالد اور ناہید کے کے جانے کی خوشی اِس سے کہیں زیادہ تھی۔

رات کے وقت مطلع صاف تھا۔ بچّے اور عورتیں عرشے پر کھُلی ہوا میں سو گئے۔ ناہید دیر تک آسمان پر چلتے ہوئے ستاروں کو دیکھتی رہی۔ چلمن کی دوسری طرف خالد، زبیر اور ملّاحوں سے باتیں کر رہا تھا۔

ہاشم ایک آٹھ سال کا لڑکا ناہید کے قریب لیٹا ہوا تھا۔ اُس کی ماں فوت ہو چکی تھی اور باپ ابو الحسن کے ساتھ لاپتہ ہو چکا تھا۔ ہاشم اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ناہید نے پوچھا۔ ”کیا ہے ہاشم۔۔۔!“

اس نے سوال کیا۔ ”علی کہاں ہے؟“

”وہ خالد کے ساتھ ملّاحوں سے باتیں کر رہا ہے۔“

”میں اُس سے ایک بات پوچھ کر بھی آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر ہاشم تاریکی میں آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا علی کے پاس پہنچا اور پوچھنے لگا: ”علی! جب جہاز ڈوب جاتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟“

علی نے بھولے پن سے جواب دیا۔ ”سمندر کی تہہ میں چلا جاتا ہے۔“

ملاح اِس جواب پر کھِلکھِلا کر ہنس پڑے۔۔۔۔

ہاشم نے پھر کہا۔ ”واہ! یہ تو مُجھے معلوم تھا۔ میں پوچھتا ہوں، لوگ کہاں جاتے ہیں؟“

”لوگوں کو مچھلیاں کھا جاتی ہیں۔“

”جھوٹ! مچھلیوں کو تو آدمی کھاتے ہیں۔“

علی نے پھر جواب دیا۔ ”زمین پر آدمی مچھلیوں کو کھاتے ہیں لیکن سمندر

میں مچھلیاں آدمیوں کو کھا جاتی ہیں۔“

ہاشم کچھ سمجھا اور کچھ نہ سمجھا اور واپس آ کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

(۲)

چند دِنوں کے بعد یہ جہاز مالابار کے ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے۔ راستے میں سامان خوراک اور تازہ پانی حاصل کرنے کے لیے اُنہیں مغربی ساحل کی مختلف بندر گاہوں پر لنگر انداز ہونا پڑا۔ اس دوران میں اُنہیں کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔ مالابار کی ایک بندر گاہ پر چند عرب تاجروں نے زبیر کا خیر مقدم کیا اور گذشتہ طویل سفر میں تھکے ہوئے مسافروں کو چار دِن کے لیے اپنے پاس ٹھہرا لیا۔ اِن چار دِنوں میں سراندیپ کے راجہ کے گراں قدر تحالف کی خبر دور دور تک مشہور ہو چکی تھی۔

رخصت کے دِن حاکمِ شہر بندر گاہ پر زبیر اور دلیپ سنگھ سے ملا اور اس نے اُنہیں راستے میں بحری ڈاکوؤں کے حملے کے خطرے کے پیش نظر ہوشیار رہنے کی تاکید کی۔ دلیپ سنگھ نے جواب دیا۔ ”آپ فکر نہ کریں

ہمارے جوان پوری طرح مسلح ہیں۔“

تیسرے دِن مستول پر سے دونوں جہانوں کے پہرے داروں نے یکّے بعد دیگرے افق شمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دو جہازوں کی آمد کا پتہ دیا اور جہاز ران پریشان ہو کر تختہ جہاز پر کھڑے ہو گئے۔ دلیپ سنگھ کا جہاز آگے تھا۔ وہ اپنے جہاز کو روکنے کا حکم دے کر زبیر کا جہاز قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ جب دونوں جہاز ایک دوسرے کے بہت تھوڑے فاصلے پر کھڑے ہو گئے تو دلیپ سنگھ نے کہا۔ ”ممکن ہے وہ جہاز بحری ڈاکوؤں کے نہ ہوں، لیکن ہمیں مقابلے کے لیے تیّار رہنا چاہیے۔ آپ اپنا جہاز مغرب کی طرف لے جائیں، میں ان سے نمٹ لوں گا۔“

زبیر نے جواب دیا۔ ”نہیں ہم خطرے میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔“

دلیپ سنگھ نے کہا۔ ”مجھے آپ کی ہمّت پر شبہ نہیں لیکن ہماری سب سے پہلی ذمّہ داری بچّوں کی جان بچانا ہے۔“

زبیر نے جواب دیا۔ ”اگر وہ واقعی بحری ڈاکو ہیں، تو ممکن ہے کہ مغرب کی طرف سے بھی اُنھوں نے ہمارا راستہ روک رکھا ہو۔ اِس صورت میں بھاگ نکلنے کی بجائے لڑنا کم خطرناک ہو گا اور ہم سے یہ بھی ناممکن ہے کہ ہم اپنے دوستوں کی جانیں خطرے میں چھوڑ کر بھاگ جائیں۔“

”آپ کی مرضی۔ تاہم عورتوں کو حکم دیں کہ وہ نیچے چلی جائیں۔“

دلیپ سنگھ یہ کہہ کر اپنے ساتھیوں کو ہدایات دینے میں مصروف ہو گیا۔ زبیر نے خالد سے کہا۔ ”خالد! تُم عورتوں اور بچّوں کو نیچے لے جاؤ۔ دونوں جہازوں کے ملاح کیل کانٹے سے لیس ہو کر دور سے آنے والے جہازوں کو دیکھنے لگے۔ کُچھ دیر کے بعد دلیپ سنگھ ایک جہاز کا سیاہ جھنڈا پہچان کر چلّایا۔ ”یہ بحری ڈاکوؤں کے جہاز ہیں۔ مقابلے کے لیے تیّار ہو جاؤ!“

زبیر نے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”بھائیو! یہ عورتیں اور بچّے ہمارے پاس امانت ہیں۔ میں اُنھیں سلامتی سے بصرہ پہنچانا ہے۔ اگر ہم پر ان کی حفاظت کی ذمّہ داری نہ ہوتی، تو ہمارا طریقِ جنگ اس طریقے سے

مختلف ہوتا جو میں نے اب تجویز کیا ہے۔ میں ایک خطرناک مہم کے لیے تم میں سے دو رضا کار چاہتا ہوں۔“

اس پر سب سے پہلے خالد اور اس کے بعد تمام ملّاحوں نے یکے بعد دیگرے اپنے نام پیش کیے۔ زبیر نے کہا۔ ”اِس کام کے لیے دو بہترین تیراک درکار ہیں۔ میں یہ کام ابراہیم اور عمر کو سونپتا ہوں۔“

زبیر کی ہدایت پر دونوں جہازوں سے دو کشتیاں سمندر میں اُتار دی گئیں اور اُن کے ساتھ بادبان باندھے گئے۔ دلیپ سنگھ کے جہاز پر ہاتھیوں کے لیے خشک گھاس موجود تھی۔ ملاحوں نے اُس کے چند گٹھے اُتار کشتیوں پر لادے۔ ابراہیم اور عمر ہاتھوں میں جلتی ہوئی مشعلیں لے کر کشتیوں پر سوار ہو گئے۔ اِس کے بعد زبیر اور اُس کے ساتھی ترکش اور کمانیں سنبھال کر حملہ آوروں کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگے۔ اگلے جہاز کا رُخ دلیپ سنگھ کے جہاز سے زیادہ زبیر کے جہاز کی طرف تھا۔ عمر اور ابراہیم کی کشتیاں ایک لمبا چکّر کاٹ کر حملہ آوروں کے عقب میں پہنچ چکی تھیں۔

زبیر ایک سِرے سے دوسرے سِرے تک بھاگتا ہوا اپنے ساتھیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ حملہ آور جہاز نے قریب آتے ہی زبیر کے جہاز پہ تیر برسانے شروع کر دیے اور ایک تیر سن سے زبیر کے سر کے قریب سے گزر گیا۔ اِس کے ساتھ ہی اُسے ایک نسوانی آواز سُنائی دی۔ ”آپ کسی محفوظ جگہ بیٹھ جایئے، ہم دُشمن کے تیروں کی زد میں آچکے ہیں۔“

زبیر نے چونک کر نیچے دیکھا۔ ناہید تیر کمان ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔ آنکھوں کے سوا اُس کا باقی چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ زبیر نے کہا۔ ”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ جاؤ نیچے!“

ناہید نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”آپ میری فکر نہ کریں۔ میں تیر چلانا جانتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ کر ایک سپاہی کے قریب بیٹھ گئی۔

کُچھ دیر تیروں کی لڑائی ہوتی رہی۔ لٹیرے زیادہ قریب پہنچ کر جلتے ہوئے تیر پھینکنے لگے۔ دوسری طرف سے زبیر کی ہدایت کے مطابق ابراہیم اور عمر نے اپنی کشتیاں سیدھی لٹیروں کے جہازوں کی طرف چھوڑ دیں اور قریب پہنچ کر جلتی ہوئی مشعلوں سے گھاس کو آگ لگائی اور خود پانی میں

کود گئے۔ لٹیرے جو ہاتھوں میں کمندیں لیے ہوئے اپنے حریف کے جہازوں پر کودنے کے لیے تیّار کھڑے تھے بدحواس ہو کر کشتیوں کی طرف متوجّہ ہوئے۔ ہوا کے جھونکوں نے کشتیوں سے آگ کے شعلوں کو جہازوں کے بادبانوں تک پہنچا دیا۔ آن کی آن میں لٹیروں کے دونوں جہازوں پر آگ بے قابو ہو چکی تھی اور وہ چیختے چِلّاتے سمندر میں چھلانگیں لگا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی دلیپ سنگھ اور زبیر کے آدمی تیر برسا رہے تھے۔ زبیر نے لٹیروں کا ایک جہاز اپنے جہاز کے بالکل قریب آتا دیکھ کر آگ کے خطرہ سے بچنے کے لیے لنگر اٹھانے کا حکم دیا لیکن اتنی میں آٹھ دس لٹیرے کمندیں ڈال کر زبیر کے جہاز پر کودنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ زبیر کے ساتھیوں نے اُنہیں آڑے ہاتھوں لیا۔ لٹیروں کے جہاز سے ایک تیر آیا، اور زبیر کے بائیں بازو میں پیوست ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ناہید کی کمان سے ایک تیز نکلا اور ایک لٹیرے کے سینے میں پیوست ہو گیا۔

زبیر نے مرحبا کہا۔ ناہید نے مُڑ کر اُس کی طرف دیکھا۔ زبیر کمان پھینک

کر بازو سے تیر نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ناہید نے جلدی سے کمان نیچے رکھ کر ایک ہاتھ سے زبیر کا بازو پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے تیر کھینچ کر نکال دیا۔ تیر کے نکلتے ہی زبیر کے بازو سے خون کی دھار بہہ نکلی۔ ناہید نے اس کی قمیص کی آستین اوپر چڑھائی اور جھٹ سے اپنے چہرے کا نقاب اُتار کر زخم پر باندھ دیا۔

زبیر کا جہاز کمندوں کی زد سے نکل چکا تھا اور جلتے ہوئے جہاز کے رہے سہے ملّاح مایوس ہو کر پانی میں چھلانگیں لگا رہے تھے۔ زبیر نے دوبارہ کمان اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”ناہید! اب تُم عورتوں کے پاس جاؤ اور انہیں تسلّی دو کہ ہم خدا کے فضل سے فتح حاصل کر چکے ہیں۔“

ناہید نے چلتے چلتے رُک کر پوچھا۔ ”آپ کو تکلیف تو نہیں؟“

”نہیں یہ بہت معمولی زخم ہے۔ تم میری فکر نہ کرو۔“ یہ کہتے ہوئے ایک لمحے کے لیے زبیر کی نگاہیں غیر ارادی طور پر ناہید کے چہرے پر گڑ گئیں۔ سپاہیانہ وقار اُس کے خدوخال کی دلکشی میں اضافہ کر رہا تھا۔ ناہید نے اچانک محسوس کیا کہ وہ بے نقاب ہے اور وہ تیزی سے قدم اٹھائی ہوئی

نیچے اتر کر عورتوں کے پاس چلی گئی۔

جلتے ہوئے جہاز سے چند آدمی اُتر کر ایک کشتی پر سوار ہوئے اور ایک آدمی جو ڈاکوؤں کا سردار معلوم ہوتا تھا، سفید جھنڈا لہرانے لگا۔ زبیر نے تیر اندازوں کو ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ عمر اور ابراہیم اپنا کام کر کے جہاز کے قریب پہنچ چکے تھے۔ زبیر نے اپنے جہاز کو خطرے سے محفوظ پا کر لنگر ڈالنے اور رسّیوں کی سیڑھی نیچے پھینکنے کا حکم دیا۔ عمر اور ابراہیم جہاز پر چڑھ آئے۔ خالد نے زبیر کو دلیپ سنگھ کے ساتھیوں کی طرف متوجّہ کیا جو ابھی تک سمندر میں غوطے کھانے والے دُشمنوں پر تیروں کی مشق کر رہے تھے۔ زبیر نے اُنہیں بھی ہاتھ کے اشارے سے منع کیا اور لٹیرے قدرے مطمئن ہو کر سیڑھی کے ذریعے جہاز پر چڑھنے لگے۔ سب سے آخر میں لٹیروں کے سردار کی کشتی دونوں جہازوں کے درمیان آ کر رُکی۔ ایک قوی ہیکل اور معمّر آدمی جس کی داڑھی کے آدھے بال سفید ہو چکے تھے، زخمی شیر کی طرح جہاز رانوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اُس کشتی میں زبیر کی نظر ایک نوجوان اور ایک لڑکی پر پڑی۔ دونوں شکل

وصورت اور لباس کے اعتبار سے لٹیروں سے بہت مختلف تھے۔

زبیر نے قوی ہیکل اور بارُعب آدمی کو ڈاکوؤں کا سردار سمجھ کر اُن کی طرف اشارہ کیا اور ملّاح کشتی کو کھیتے ہوئے جہاز کے قریب لے آئے اور یکے بعد دیگرے رسّی کی سیڑھی پر چڑھتے ہوئے اوپر آ گئے۔ لڑکی کے چہرے سے علالت اور تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ خوش وضع اور خوش پوش نوجوان اس کا بازو پکڑ کر سہارا دے رہا تھا اور وہ سنبھل سنبھل کر سیڑھی پر پاؤں رکھ رہی تھی۔

جہاز پر پہنچ کر نوجوان نے ایک اجنبی زبان میں کچھ کہا اور لٹیروں کی طرف گھورنے لگا۔ زبیر نے اس کی زبان پوری طرح سے نہ سمجھتے ہوئے بھی محسوس کیا کہ وہ لٹیروں کے مظالم کی شکایت اور اس کا شکریہ ادا کر رہا ہے۔

زبیر نے اپنی استطاعت کے مطابق سندھ اور سراندیپ کی ملی جلی زبان میں اُسے تسلّی دی۔ نوجوان اور لڑکی اس کے دوستانہ لہجے سے متاثر ہو کر تشکّر آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ لڑکی نے کُچھ کہنا چاہا لیکن

اُس کی سہمی ہوئی آواز گلے میں اٹک کر رہ گئی۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر زبیر کی طرف دیکھنے لگی۔ اُس کی عمر چودہ پندرہ سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔ خوبصورت چہرہ دوپہر کے پھُول کی طرح کملایا ہوا تھا۔ زبیر نے پھر ایک بار اُن دونوں کو تسلّی دی۔ سب سے آخر میں ڈاکوؤں کا سردار جہاز پر پہنچا۔ اُس کی آنکھوں میں ندامت کے آنسوؤں کی بجائے انتقام کی بجلیاں تھیں۔

تھوڑی دیر میں دلیپ سنگھ اپنے جہاز سے اُتر کر کشتی کے ذریعے جہاز پر پہنچ گیا۔ اس نے آتے ہی ڈاکوؤں کے سردار کو مارنے کے لیے چابک اُٹھایا لیکن زبیر نے آگے بڑھ کر اُس کا بازو پکڑ لیا۔ دلیپ سنگھ نے زبیر کی قمیص کی آستین کو خون آلود دیکھ کر پوچھا۔ ”آپ زخمی ہیں۔“

زبیر نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”معمولی زخم ہے۔“

خوش پوش نوجوان نے کُچھ کہہ کر دلیپ سنگھ کو اپنی طرف متوجّہ کیا اور دونوں ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔ اِس کے بعد دلیپ سنگھ نے ڈاکوؤں کے سردار سے چند باتیں کرنے کے بعد عربی زبان میں زبیر کے

ساتھیوں سے کہا۔ ”کشتی میں ایک صندوق پڑا ہوا ہے۔ اُسے اوپر لے آؤ۔“

ملّاحوں نے صندل کی لکڑی کے چھوٹے سے صندوق کو رسّے کے ساتھ باندھ کر اوپر کھینچ لیا۔ دلیپ سنگھ نے ڈھکنا اوپر اُٹھایا اور تمام ملّاح حیران ہو کر سونے موتیوں اور جواہرات سے بھرے ہوئے صندوق کو دیکھنے لگے۔

زبیر کے استفسار پر دلیپ سنگھ نے خوش پوش نوجوان سے چند سوالات اور پوچھے اور اُس نے اپنی آپ بیتی سُنائی۔

(۳)

ان نوجوان کا نام جے رام تھا۔ وہ کاٹھیاواڑ کے ایک عالی نسب راجپوت خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اوائلِ شباب میں اسے شہرت اور ناموری کا شوق سرزمینِ سندھ تک لے گیا۔ برہمن آباد کے ایک میلے میں اُس نے تیر اندازی میں اپنے کمالات دکھا کر سندھ کے راجہ کو اپنا قدردان بنالیا۔

راجہ نے اُسے اپنی فوج میں ایک معمولی عہدہ دے کر اپنے پاس رکھ لیا۔ دو سال کی خدمت گزاری کے بعد جے رام نے دیبل کے نائب حاکم کی جگہ حاصل کر لی۔ دیبل میں آئے ہوئے اُسے ایک ہفتہ نہ ہوا تھا کہ گھر سے اسے اپنے باپ کی وفات اور ماں کی علالت کی خبر ملی اور وہ چند ماہ کی رُخصت لے کر کاٹھیاواڑ پہنچا۔ گھر پہنچنے کے دس دِن بعد اس کی والدہ بھی چل بسی۔ گھر میں اب صرف اس کی ایک چھوٹی بہن مایا دیوی تھی۔ جے رام نے رشتہ داروں کی نصیحت اور مایا دیوی کے آنسوؤں سے متاثر ہو کر واپس سندھ جانے کا خیال چھوڑ دیا، لیکن چار ماہ گھر میں قیام کرنے کے بعد اُسے اپنی پُر سکون زندگی تلخ محسوس ہونے لگی اور ایک دِن اُس نے کاٹھیاواڑ کے راجہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ملازمت کی درخواست کی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سندھ کے راجہ نے اپنا حلقۂ اقتدار وسیع کرنے کے لیے پڑوس کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کر رکھی تھی اور خود مختار سردار اور راجے اسے اپنا طاقت ور ہمسایہ تسلیم کرنے کے ثبوت میں اپنی آمدنی کا کُچھ حصہ اُس کی نذر کیا کرتے تھے۔ کاٹھیاواڑ کے راجہ کو

اگرچہ براہِ راست سندھ کے راجہ سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ تاہم وہ کُچھ سونے اور چاندی کے عوض اسے اپنا دوست بنانا غنیمت سمجھتا تھا۔

جے رام کو اپنے دربار میں کوئی عہدہ دینے کی بجائے اُس نے سندھ میں اُس کے اثر ورسوخ سے فائدہ اٹھانا زیادہ مناسب خیال کیا اور اُسے سونے، جواہرات اور موتیوں کا ایک صندوق دے کر سندھ کے راجہ کی خدمت میں بھیج دیا۔ جے رام کو یقین تھا کہ راجہ داہر اسے واپس نہ آنے دے گا۔ اِس لیے اُس نے اپنی اکیلی بہن مایا دیوی کو گھر پر چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ مایا دیوی بھی اُس کے ساتھ جانے پر بضد تھی۔ اِس لیے یہ دونوں اپنا گھر بار چچازاد بھائی کے سپرد کر کے سندھ کی طرف روانہ ہو گئے۔ لیکن سندھ اور کاٹھیاواڑ کے درمیان اُن کے جہاز کو بحری ڈاکوؤں سے مُقابلہ کرنا پڑا۔ اُس کے ساتھی بہادری سے لڑے لیکن ڈاکوؤں کے سامنے اُن کی پیش نہ گئی۔ ڈاکوؤں نے جواہرات کے صندوق پر قبضہ کر لیا۔ جے رام اور مایا دیوی کے سوا اُن کے باقی ساتھیوں کو سمندر کے کنارے لا کر آزاد کر دیا۔ ڈاکوؤں کا سردار یہ کہتا تھا کہ جے رام اور مایا دیوی راجہ کاٹھیاوار کے عزیز

ہیں اور وہ اُن کی جان بچانے کے لیے ایک معقول رقم ادا کرنے پر آمادہ ہو جائے گا اس لیے وہ کاٹھیاوار کے ساحل کے غیر آباد حصّے پر لنگر انداز ہو کر راجہ سے یہ سودا کرنا چاہتا تھا لیکن اُن کے ایک جاسوس نے اُسے سراندیپ کے جہازوں کی آمد کی خبر کر دی اور اُس نے کاٹھیاواڑ ٹھہرنے کی بجائے مالابار کا رُخ کیا۔

زبیر نے یہ قصّہ سُن کر پھر ایک بار جے رام اور اُس کی بہن کو تسلّی دی اور کہا۔ "یہ لٹیرے جیسے ہمارے مجرم ہیں ویسے ہی آپ کے مجرم ہیں۔ میں نے ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کیا کہ انہیں کیا سزا دی جائے۔ تاہم میں یہ جانتا ہوں کہ آپ کے ملک میں انہیں کیا سزا دی جاتی ہے؟"

جے رام نے جواب دیا۔ "ایسے ظالم ڈاکوؤں کے لیے ہمارے قانون میں اور آپ کے قانون میں رحم کی کوئی گنجائش نہیں ہے تاہم جب اِن لوگوں سے آپ کا مقابلہ ہوا تھا تو مُجھے اور میری بہن کو جہاز کے ایک کونے میں بند کر دیا گیا تھا اور جہاز کو آگ لگ جانے کے بعد یہ لوگ ہمیں وہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ اپنے لیے میں شاید ان سے رحم کی درخواست نہ کرتا

لیکن اپنی بہن کے لیے مجھے عاجز ہونا پڑا اور اِن لوگوں نے ہمیں کشتی پر سوار کرنے سے پہلے یہ وعدہ لیا کہ میں آپ سے ان لوگوں کی جان بخشی کے لیے سفارش کروں گا۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ انہیں آزاد چھوڑ دیا جائے۔ میں انہیں صرف موت کی سزا سے بچانا چاہتا ہوں۔ لیکن ضروری ہے کہ جب تک ان کے راہِ راست پر آ جانے کا اطمینان نہ ہو انہیں قید میں رکھا جائے۔"

مایا دیوی علالت کی وجہ سے دیر تک کھڑی نہ رہ سکی۔ اس نے اپنے بھائی سے کچھ کہا اور پیش تر اس کے کہ وہ کوئی جواب دیتا دلیپ سنگھ نے کہا۔

"ہمیں معلوم نہ تھا کہ آپ کی بہن علیل ہیں۔ خالد بیٹا! انہیں اپنی بہن کے پاس لے جاؤ۔"

خالد آگے بڑھا اور مایا دیوی اپنے بھائی کی طرف دیکھنے لگی۔ جے رام نے دلیپ سنگھ سے پوچھا۔"اس جہاز پر عورتیں بھی ہیں؟"

"جی ہاں۔ آپ کہ بہن کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو گی۔ ہاں بیٹھ جاؤ! تم آرام

کرو۔"

(۴)

جہازوں کی دوبارہ روانگی سے پہلے لٹیروں کے سردار کے سوا باقی سب قیدیوں کو دلیپ سنگھ کے جہاز میں مُنتقل کر دیا گیا۔ زبیر نے دلیپ سنگھ سے تاکید کی کہ جب تک ان کی سزا کا فیصلہ نہ ہو ان کے ساتھ بد سلوکی نہ کی جائے۔ ڈاکوؤں کے سردار کو اس کے ساتھیوں کی نیک چلنی کی ضمانت کے طور پر زبیر نے اپنے جہاز پر ٹھہرالیا۔ جے رام نے اپنی بہن کی علالت کے پیشِ نظر زبیر کے جہاز پر رہنا پسند کیا۔

خالد نے مایا دیوی کو ناہید لے پاس پہنچا دیا۔ ناہید نے اسے ایک بستر پر لٹا دیا اور عرب عورتیں اس کے گرد جمع ہو گئیں۔ پہلی ملاقات میں میزبانوں اور مہمانوں کے درمیان فقط اشاروں سے ہمدردی اور تشکّر کے جذبات کی ترجمانی ہوئی۔

دلیپ سنگھ نے اپنے جہاز پر جانے سے پہلے جے رام سے کہا۔ "آپ کو

شاید کھانے کی تکلیف ہو۔ میں ایک مدّت مسلمانوں کے ساتھ رہ کر چھوت چھات کا قائل نہیں رہا۔ ہم سب ایک ہی دستر خوان پر کھا لیتے ہیں۔ میرے ساتھ جتنے آدمی ہیں اُن میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو مسلمانوں کے ساتھ نہ کھا چکا ہو۔ تاہم میرا ایک آدمی جسے میں اس جہاز میں چھوڑ رہا ہوں آپ دونوں کے لیے کھانا تیار کرے گا اور آپ کے میزبان آپ کی مرضی کے بغیر آپ کو دستر خوان پر بیٹھنے پر مجبور نہیں کریں گے۔“

دلیپ سنگھ نے چند باتیں زبیر کو سمجھائیں اور اتر کر اپنے جہاز پر چلا گیا۔ اس کے پہنچنے سے پہلے اُس کے ساتھی اپنے کند اُستروں سے پانچ سفید ریش لٹیروں کے سر اور داڑھیاں، مونچھیں اور بھنویں مونڈ چکے تھے۔ ایک ڈاکو جو شکل و صورت سے زیادہ معمّر معلوم ہوتا تھا اُس کی صرف آدھی داڑھی، ایک مونچھ اور آدھا سر صاف کرنے پر اکتفا کیا گیا تھا۔ ناہید اور دوسری عرب عورتوں نے دل و جان سے مایا دیوی کی تیمار داری کی۔ موسمی بخار کے لیے ناہید سراندیپ سے چند جڑی بوٹیاں اپنے ساتھ

لائی تھی۔ اُن کے استعمال سے مایا دیوی تین چار دِن میں تندرست ہو گئی۔

زبیر نے اپنے بازو کے زخم کو معمولی سمجھ کر شروع شروع میں چنداں پروا نہ کی لیکن مرطوب ہوا کے باعث زخم میں تیسرے دِن پیپ پڑ گئی اور اُسے درد کی شدّت اور بخار کی وجہ سے چند دِن بستر پر لیٹنا پڑا۔

دلیپ سنگھ کئی بار اپنا جہاز چھوڑ کر اُس کی تیمارداری کے لیے آیا۔ علی، خالد اور ہاشم دوسری عرب عورتوں کو ہر آن اُس کی حالت سے باخبر رکھتے۔ جے رام ہر وقت کے پاس بیٹھا رہتا۔ مایا دیوی ایک عورت کی ذکاوت جس کی بدولت ناہید کے مغموم اور پریشان رہنے کی وجہ سمجھ چکی تھی۔ وہ اپنے بھائی کی موجودگی میں کبھی کبھی زبیر کو دکھا آتی اور واپس آکر اشاروں اور عربی کے چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں جنہیں وہ دِن رات عرب عورتوں کی صحبت میں رہ کر یاد کر چکی تھی، ناہید کو تسلّی دیتی۔

ایک شام زبیر کی حالت قدرے مخدوش تھی۔ دلیپ سنگھ آیا اور زخم کی مرہم پٹّی کرنے کے بعد چلا گیا۔ رات کے وقت مطلع ابر آلود تھا اور ہوا

تیز تھی۔ ملّاح اپنی اپنی جگہ پر متعیّن تھے۔ جے رام، خالد اور علی زبیر کی تیمارداری کر رہے تھے۔

عرب عورتیں عشاء کی نماز کے لیے اُٹھیں اور مایا دیوی اپنے بھائی سے زبیر کا حال پوچھنے چلی گئی۔ جب ناہید نماز سے فارغ ہو کر زبیر کی صحت کے لیے دُعا کر رہی تھی خالد نے آکر بتایا کہ زبیر بے ہوش ہے۔

ایک عمر رسیدہ عورت نے کہا۔ ”ہمارے تمام آدمی آندھی کی وجہ سے جہاز پر مصروف ہیں۔ ہمیں اُن کے پاس ضرور جانا چاہیئے۔“

تمام عورتیں اُٹھ کر زبیر کے پاس پہنچیں۔ مایا دیوی نے اُنہیں اپنے بھائی کی طرف اشارہ کیا اور وہ اور باہر نکل گیا۔ جے رام نے کئی راتیں آنکھوں میں کاٹی تھیں۔ وہ باہر نکلتے ہی جہاز کے ایک کونے میں لیٹ کر گہری نیند سو گیا۔

آدھی رات کے وقت زبیر کا بخار قدرے کم ہوا اور ناہید اور مایا دیوی کے علاوہ باقی عورتیں اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ خالد اور علی وہیں لیٹ

گئے۔

رات کے تیسرے پہر زبیر نے آنکھیں کھولیں اور شمع کی روشنی میں مایا دیوی اور ناہید کو دیکھ کو پوچھا۔ ”آپ یہاں؟ جائیں آرام کریں۔“

ناہید کا مُرجھایا ہوا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا اور اُس نے سوال کیا۔ ”اور آپ اب کیسے ہیں؟“

”میں اب ٹھیک ہوں۔ مُجھے پانی دیجئے۔“

مایا دیوی نے اٹھ کر صراحی سے پانی کا پیالہ بھرا اور ناہید کے ہاتھ میں دے دیا۔ ناہید نے ہچکچاتے ہوئے ایک ہاتھ سے زبیر کے سر کو سہارا دے کر اٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے پانی کا پیالہ اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

زبیر نے پانی پی کر پھر تکیے پر سر رکھ دیا کے ناہید سے کہا۔ ”ان کے بھائی نے میرے لیے بہت تکلیف اٹھائی۔ وہ اب کہاں ہیں؟“

”وہ باہر سو رہے ہیں۔“

”آپ بھی جا کر سوئیں۔ مجھے اب آرام ہے۔ دلیپ سنگھ کے نئے مرہم نے بہت فائدہ کیا ہے۔“

(۵)

چند دنوں کے بعد زبیر چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔ عربوں کا اخلاق جے رام کو بہت متاثر کر چُکا تھا۔ زبیر نے اُس کا انس، انتہائی درجے کی عقیدت اور محبّت کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ وہ زبیر سے عرب کے تازہ حالات کے متعلّق کافی واقفیت حاصل کر چکا تھا۔ عربوں کے نئے دین میں انسانی مساوات کے تخیّل نے اُسے شروع شروع میں بہت پریشان کیا لیکن زبیر کی تبلیغ سے وہ میری اِس بات کا قائل ہو گیا کہ دُنیا بھر میں قیامِ امن کے لیے تمام اقوام کسی ایسے دین کو قبول کرنا ضروری ہے جو ہر انسان کو مساوی حقوق دیتا ہو۔ جو تمام انسانوں کو رنگ و خون اور نسل سے نہیں بلکہ اعمال سے پہنچتا ہو۔ ابتدا میں اُس نے کھانے پینے کے معاملے میں مسلمانوں کی چھوت سے پرہیز کیا۔ لیکن چند دن زبیر کی صحبت میں رہ کر اسے چھوت اور اچھوت کا امتیاز مضحکہ خیز نظر آنے لگا اور ایک دن وہ اپنی بہن سے

مشورہ کیے بغیر زبیر کے دستر خوان پر بیٹھ گیا۔

مایا دیوی میں اپنے بھائی سے بھی پہلے ایک ذہنی انقلاب آ چکا تھا اور اِس انقلاب کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ اپنے بھائی کی طرح اسلام سے واقف ہو چکی تھی بلکہ اُس کی وجہ عربوں کا وہ اخلاق تھا جس نے ایک غیّور راجپوت لڑکی کو یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ ایک اجنبی قوم کے انسانوں کے رحم پر ہے۔ مسلمان ملّاح اسے دیکھتے اور آنکھیں جھکا لیتے۔ پہلے ہی دِن وہ یہ یہ محسوس کرنے لگی کہ اُن سب کی نگاہیں اس کے بھائی کی نگاہوں سے مختلف نہیں۔

ناہید کی تیمار داری نے بھی اُسے بہت متاثر کیا۔ ان سب سے زیادہ وہ خالد کے طرزِ عمل سے متاثر تھی۔ نہ جانے کیوں اُس کی نگاہیں اُسے دیکھنے اور کان اُس کی آواز کو سُننے کے لیے بے قرار رہتے اور جب وہ سامنے آتا اُسے آنکھ اُٹھانے کی جرأت نہ ہوتی۔ وہ بے پروائی سے مُنہ پھیر کر گُزر جاتا اور وہ دیر تک اپنے دِل کی دھڑکنیں سُنتی رہتی۔ کبھی طرح طرح کے خیالات سے پریشان ہو کر وہ اپنے آپ کو کوستی۔

رات کے وقت وہ اپنے ہم عمر لڑکے سے مرعوب ہونے کے بجائے اسے نفرت اور حقارت سے دیکھنے کا ارادہ لے کر سوتی لیکن صبح کی اذان کے بعد جب عرب نماز کے لیے کھڑے ہوتے۔ وہ اِن ارادوں کے باوجود اُٹھ کر عرشے پر چلی جاتی اور ایک طرف کھڑی ہو کر نیلگوں سمندر کی لہروں سے دِل بہلانے کی کوشش کرتی لیکن جلد ہی اُکتا کر مُنہ پھیر لیتی اور نمازیوں کی طرف دیکھتی غیر شعوری طور پر اُس کی نگاہیں خالد پر مرکوز ہو جاتیں۔ خالد کی وجہ سے اُسے دوسرے نمازیوں کا رکوع و سجود پسند آتا۔ نماز کے بعد خالد کے ہاتھ بُلند ہوتے دیکھ کر اُسے ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنے کا طریقہ دلکش معلوم ہوتا۔

اسلام کے ساتھ اُس کی پہلی دلچسپی اِس لیے تھا کہ یہ خالد کا دین تھا۔ عربی زبان وہ اس لیے سیکھنے کی کوشش کرتی تھی کہ یہ خالد کی زبان تھی۔

گنگو اور اُس کی سرگزشت

ڈاکوں کے سردار کو پا بہ زنجیر رکھا گیا تھا۔ دلیپ سنگھ کی ہدایت تھی کہ اِس پر کسی قسم کا اعتبار نہ کیا جائے۔ اِسے دونوں وقت کھانا پہنچانے کا کام علی کے سپُرد تھا اور علی کو ہر وقت یہی فکر رہتی کہ شاید اُس کا پیٹ نہیں بھرا اور ہر کھانے پر بُوڑھے سردار کو علی کے اصرار پر ایک دو لُقمے زیادہ ہی کھانے پڑتے۔

زبیر کا سلوک بھی اُس کی توقّع کے خلاف تھا۔ زبیر دِن میں ایک دو دفعہ ضرور اُس کے پاس آتا۔ پہلی بار اُس نے اپنی ٹوٹی پھوٹی سندھی میں باتیں

کرنے کی کوشش کی لیکن اُسے جلد ہی یہ معلوم ہو گیا کہ وہ عربی میں بے تکلّفی سے بات چیت کر سکتا ہے۔

ایک دِن اس نے زبیر سے کہا۔ "موت کے اِنتظار میں جینا میرے لیے بہت صبر آزما ہے۔ اگر آپ مُجھ پر رحم نہیں کرنا چاہتے تو میں چاہتا ہوں کہ مُجھے جو سزا ملنی ہے جلد مل جائے۔"

زبیر نے جواب دیا۔ "مُجھے تمہارے بڑھاپے پر ترس آتا ہے لیکن تمہیں اُس وقت تک قید سے نہیں چھوڑا جا سکتا، جب تک مُجھے یقین نہ ہو کہ تُم آزاد ہو کر پھر یہی پیشہ اختیّار نہ کر لو گے۔" اُس نے جواب دیا۔ "میرے جہاز غرق ہو چکے ہیں اور اب میں بڑھاپے کے باقی دِن کسی جنگل میں چھُپ کر گزارنے کے سوا اور کر ہی کیا سکتا ہوں۔"

"ڈاکو ہر جگہ خطرناک بن سکتا ہے۔ تم سمندر میں جہازوں کو لوٹتے تھے۔ خشکی پر لوگوں کے گھروں میں ڈاکے ڈالو گے۔ اگر میں تمہیں بصرہ لے جاؤں تو وہاں غالباً تمھارے ہاتھ کاٹے جائیں گے اور اگر تمہارا فیصلہ جے رام پر چھوڑوں تو باقی عمر تمہیں قید خانے کی کوٹھری میں گزارنی پڑے

گی۔"

ڈاکوؤں کے سردار نے جواب دیا۔ "میں آپ کی حکومت کے متعلّق کچھ نہیں جانتا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ دیبل کی حکومت کو مُجھے سزا دینے کا کوئی حق نہیں۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ اِس لیے کہ میں گذشتہ چند برس جو کچھ سمندر میں اپنے جہاز پر سوار ہو کر کرتا رہا ہوں۔ وہی کچھ سندھ کا راجہ تخت پر بیٹھ کر کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اُس کے اہل کار کمزور اور غریب آدمیوں کو لوٹتے ہیں اور میرے ساتھی چھوٹی چھوٹی کشتیوں کی بجائے صرف بڑے بڑے جہازوں کو لوٹتے ہیں۔ ہمارا پیشہ ایک ہے لیکن نام ہمارے مختلف ہیں۔ میں ایک ڈاکو ہوں اور وہ ایک راجہ۔ اس کی طرح اُس کا باپ بھی راجہ تھا لیکن میرا باپ میری طرح ایک ڈاکو نہ تھا۔ میں خود بھی ایک ڈاکو نہ بنتا لیکن ظلم نے مُجھے ایسا بنا دیا۔ خیر اِن باتوں کے ذکر سے کوئی فائدہ نہیں۔ آپ غالب ہیں اور میں مغلوب۔ لیکن میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ آپ

مجھے سندھ کی حکومت کے رحم و کرم پر چھوڑنے کی بجائے خود جو سزا دینا چاہیں دے لیں۔“

زبیر نے کہا۔ ”میں تمہاری سر گزشت سننا چاہتا ہوں۔“

ڈاکوؤں کے سردار نے قدرے تامّل کے بعد مختصر الفاظ میں اپنی سر گزشت یوں بیان کی :

(۲)

”میرا نام گنگو ہے۔ میں دریائے سندھ کے کنارے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا۔ اپنے باپ کی طرح میرا بھی پیشہ ماہی گیری تھا۔ بیس سال کی عُمر میں میرے سر سے والدین کا سایہ اُٹھ گیا۔ ہمارے گاؤں میں ایک لڑکی تھی۔ اُس کا نام لاجونتی تھا اور وہ تھی بھی لاجونتی۔ اُس کی آنکھیں ہرنی کی آنکھوں سے زیادہ دلفریب اور اُس کی آواز کوئل کی آواز سے زیادہ میٹھی تھی۔ لوگ اُسے جل پری کہا کرتے تھے۔ گاؤں میں کوئی نوجوان ایسا نہ تھا جو لاجو پر جان دینے کے لیے تیّار نہ ہو۔ لیکن وہ

صرف مُجھے چاہتی تھی۔ اُس کا باپ ایک سادہ دِل آدمی تھا۔ برسات میں ایک دفعہ دریا زوروں پر تھا، تو اُس نے شرط لگائی کہ میں لاجو کی شادی اُس کے ساتھ کروں گا جو تیر کر دریا عبور کرے گا۔ ہمارے گاوں میں اچھے اچھّے تیراک تھے لیکن برسات میں دریا کا بہاؤ دیکھ کر کسی کو پانی میں کودنے کی ہمّت نہ ہوئی۔ میں لاجو کے لیے جان تک قربان کرنے کو تیّار تھا۔ میں نے یہ شرط پوری کی اور چند دِنوں کے بعد میری اور اُس کی شادی ہو گئی۔

ہم دونوں خوش تھے اور زیادہ وقت کشتی پر گزارتے تھے۔ میں مچھلیاں پکڑا کرتا تھا۔ وہ کھانا پکایا کرتی تھی۔ رات کے وقت ہم ہنستے ہنستے اور گانے گاتے، تاروں کی چھاؤں میں سو جاتے۔ عجیب دِن تھے وہ بھی۔“

یہاں تک کہہ کر گنگو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور دیر تک ہچکیاں لینے کے بعد اُس نے پھر اپنی داستان شروع کی۔

”لیکن ایک دِن ایسا آیا کہ مُجھے لاجو سے جُدا ہونا پڑا۔ ہمیشہ کے لئے مُجھے معلوم نہ تھا کہ ایک نیچ ذات اور کمزور آدمی کے لیے ایک خوبصورت

بیوی رکھنا پاپ ہے۔ ہمارے گاؤں سے ایک کوس کے فاصلے پر ہمارے علاقے کے سردار کا شہر تھا۔ ایک دِن وہ چند سپاہیوں کے ساتھ دریا پر آیا اور مجھے پار لے جانے کے لیے کہا۔ کشتی پر سوار ہو کر وہ لاجو کو بُری طرح گھور رہا تھا۔ اس سے پوچھنے پر میں نے اسے بتایا کہ یہ میری بیوی ہے۔ وہ بولا۔ ”یہ کسی ماہی گیر کی بیوی معلوم نہیں ہوتی۔ تُم اِسے کہاں سے لائے؟“ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوسرے کنارے پہنچ کر اس نے مُجھے بتایا کہ میں شام تک واپس آ جاؤں گا۔ تُم اتنی دیر میرا انتظار کرو۔ لیکن وہ شام سے پہلے ہی واپس آ گیا اور میں نے اُسے دوسرے کنارے پہنچا دیا۔ وہ میرا نام پوچھ کر چلا گیا۔ اِس کے بعد وہ ہمارے گاؤں کے ماہی گیروں کا شکار دیکھنے کے بہانے کبھی کبھی ہمارے گاؤں میں چلا آتا۔ گاؤں کے لوگ اُسے اپنے ساتھ بے تکلّفی سے پیش آتا دیکھ کر خوش ہوتے لیکن لاجو نے ایک دِن مُجھ سے کہ اُس کی نیّت درست نہیں۔ وہ میری طرف بہت بُری نظروں سے دیکھتا ہے۔

ایک شام لاجو حسبِ معمول کشتی پر کھانا پکا رہی تھی۔ وہ گھوڑے پر آیا اور

مُجھ سے کہنے لگا۔ ''تمہارے پاس کوئی تازہ شکار ہو تو لاؤ۔ میں نے تھوڑی دیر پیشتر دو مچھلیاں پکڑی تھیں۔ وہ میں نے اُسے پیش کیں۔ اُس نے مجھے مچھلیاں اُٹھا کر اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ شہر دور نہ تھا۔ اور میں نے لاجو سے کہا۔ میں کھانا تیّار ہونے تک آجاؤں گا۔

میں اُس کے گھوڑے کے پیچھے چل رہا تھا کہ راستے میں جھاڑیوں کی آڑ سے چند آدمی نمودار ہوئے اور مُجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے اُن کی گرفت سے آزاد ہونے کی جدوجہد کی۔ لیکن کسی نے میرے سر پر لاٹھی ماری اور میں تیورا کر گر پڑا۔ اِس کے بعد جب مُجھے ہوش آیا تو میں ایک تاریک کوٹھری میں پڑا ہوا تھا۔

(۳)

دو دن میں بھوک اور پیاسا جان کُنی کی حالت میں وہاں پڑا رہا۔ تیسرے دِن کوٹھری کا دروازہ کھلا اور لاجو نتی کے ساتھ تین آدمی جن میں سے ایک کھانا اور پانی اُٹھاتے ہوئے تھا، اور دو کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھیں، کوٹھری میں داخل ہوئے۔ لاجو کا رنگ زرد تھا اور اُس کی آنکھیں

دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آنسوؤں کا تمام ذخیرہ ختم ہو چکا ہے۔ اس کی نگاہ پڑتے ہی بھوک اور پیاس بھول گئی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ بھاگ کر اُس سے لپٹ جاؤں۔ لیکن میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ لاجو نے سپاہیوں کی طرف دیکھا اور وہ تلواروں سے میری رسیاں کاٹ کر باہر نکل گئے۔

میں نے پوچھا۔ "لاجو! تُم یہاں کیسے پہنچیں؟" اور وہ ہونٹ بھینچ کر اپنی چیخوں کو ضبط کرتے ہوئے مُجھ سے لپٹ گئی لیکن اچانک اُس نے خوفزدہ ہو کر مُجھے چھوڑ دیا اور دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ اُس نے مُجھے بتایا کہ میرے چلے آنے سے تھوڑی دیر بعد چند آدمیوں نے کشتی پر حملہ کیا اور اسے پکڑ کر سردار کے پاس لے آئے۔ اُسے میرا حال معلوم نہ تھا اور وہ بے غیرتی کی زندگی پر موت کو ترجیح دینا چاہتی تھی لیکن سردار نے اُسے میری قید کا حال بتا کر یہ دھمکی دی کہ تو اگر اس کے محل میں بے حیائی کی زندگی بسر کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوئی تو تیرا شوہر اِس کوٹھری میں بھوکا اور پیاسا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے گا۔

اب وہ میرے پاس آئی تھی، یہ بتانے کے لیے کہ گنگو تم آزاد ہو۔ تم جاؤ اور یہ سمجھو کہ تمہاری لاجو مر گئی۔ وہ اپنی عصمت سے میری آزادی کا سودا کرنا چاہتی تھی لیکن میں نے اُسے غَلَط سمجھا۔ میں نے سمجھا کہ وہ ایک غریب ملّاح کی کشتی چھوڑ کر محلوں میں رہنا چاہتی ہے۔ میں نے اُسے بُرا بھلا کہا، گالیاں دیں اور اُن ظالم ہاتھوں سے چند تھپڑ بھی مارے لیکن وہ پتھّر کی مورتی کی طرح کھڑی یہ سب کُچھ برداشت کرتی رہی۔ اُس نے صرف یہ کہا: ”گنگو! میں بے عزّتی کی زندگی پر موت کو ترجیح دوں گی لیکن میں یہاں اِس لیے آئی ہوں کہ مُجھے تمہاری جان اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ بھگوان کے لیے تُم جاؤ! یہ موقع نہ گنواؤ۔ مُمکن ہے کہ تم آزاد ہو کر مُجھے اِس ظالم کے پنجے سے چھُڑانے کی کوئی تدبیر سوچ سکو۔“

اُس کے آنسوؤں اور آہوں نے میری غَلَط فہمی دور کر دی۔ میں نے اُسے پھر گلے لگا لیا اور اُس سے وعدہ کیا کہ میں جلد آؤں گا۔ میں اِس محل کی اینٹ سے اینٹ بجادوں گا۔“

قید خانے کا دروازہ پھر کھلا، سپاہیوں کی بجائے وہ ظالم بھیڑیا اندر داخل

ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں ننگی تلوار نہ ہوتی تو میں یقیناً اُس پر حملہ کر دیتا۔ اس نے آتے ہی لاجو سے کہا۔ ”اب بتاؤ کیا فیصلہ کیا تم نے؟ اِس کی زندگی تمہارے ہاتھ میں ہے۔“

لاجو نے جواب دیا۔ ”اگر میں آپ کی شرط مان لوں، تو اِس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ زندہ اور سلامت شہر سے نکل جائیں گے؟“

اُس نے کہا۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں۔“

لاجو آنسو بہاتی ہوئی اُس کے ساتھ چلی گئی اور مُجھے چار سپاہی شہر سے باہر لے آئے۔ اُن کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھیں۔ مُجھے سردار کے وعدے پر اعتبار نہ تھا۔ شہر سے باہر نکل کر جب ہم اُس جنگل میں پہنچے جو دریا کے کنارے دور تک پھیلا ہوا تھا تو ایک شخص نے پیچھے سے اچانک مُجھ پر وار کیا۔ مُجھے پہلے ہی اس حملے کی توقع تھی اس لیے میں نے ایک طرف کود کر اپنے آپ کو بچا لیا۔ اس پر چاروں آدمی مُجھ پر ٹوٹ پڑے لیکن میں بھاگنے میں ان سے تیز تھا۔ میں جلد ہی جنگل میں پہنچ کر ایک جھاڑی کے نیچے چھپ گیا۔ وہ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر تلاش کرنے کے بعد مایوس ہو کر

واپس چلے گئے۔

شام ہو رہی تھی، میں چھُپتا چھپاتا دریا کے کنارے پہنچا۔ میری کشتی جل رہی تھی اور دریا کے کنارے وہ چاروں سپاہی کھڑے تھے۔ اِن واقعات نے میرے جیسے امن پسند آدمی کو ایک بھیڑیا بنا دیا۔ میری گاؤں کی طرف بھاگا۔ میری آواز میں ایک اثر تھا اور آن کی آن میں چند نوجوان لاٹھیاں اور کلہاڑیاں لے کر میرے ساتھ نکل آئے۔ ہمیں دیکھ کر سپاہی سراسیمہ ہو کر بھاگے لیکن ہم نے کسی کو بچ نکلنے کا راستہ نہ دیا اور چاروں کو مار کر اُن کی لاشیں دریا میں پھینک دیں۔ آدھی رات تک میں نے ماہی گیروں کی بیس پچیس بستیوں سے کوئی دو سو جوان اکٹھے کر لیے اور تیسرے پہر سردار کے محل پر دھاوا بول دیا۔ شہر کے لوگ پہلے ہی اُس کے مظالم سے تنگ تھے کوئی اُس کی مدد کے لیے نہ نکلا۔ اس کے چند سپاہیوں نے مقابلہ کیا لیکن اکثر نے بھاگ کر لوگوں کے گھروں میں پناہ لی۔ ہم نے سردار کو پکڑ لیا اور اُس سے لاجو کے متعلّق پوچھا وہ ہر سوال پر صرف یہ جواب دیتا تھا۔ ”میں بے قصور ہوں۔ بھگوان کے لیے مُجھے

چھوڑ دو۔" میں نے مشعل دِکھا کر اُسے زندہ جلا دینے کی دھمکی دی تو وہ مُجھے محل کی نچلی منزل کے ایک کمرے میں لے گیا۔ فرش پر لاجو کی لاش دیکھ کر میری چیخ نکل گئی۔ وہ ہاتھ باندھ کر یہ کہہ رہا تھا۔ میں نے اِسے نہیں مارا۔ اِس نے خود مکان کی چھت سے چھلانگ لگا دی تھی۔ تُم سپاہیوں سے پوچھ سکتے ہو۔ بھگوان کے لیے مُجھ پر دیا کرو، میں نے جلتی ہوئی مشعل اُس کی آنکھوں میں جھونک دی اور کلہاڑی کی پے در پے ضربوں سے اُسے ٹکڑے کر دیے۔

اس کے بعد میں ایک ڈاکو تھا۔ میرے دِل میں کسی کے لیے رحم نہ تھا۔ میں نے کئی سرداروں کو لوٹا اور جب راجہ کی فوجوں نے زمین ہمارے لیے تنگ کر دی۔ میں نے دریا کے راستے سمندر کا رُخ کیا۔ دیبل کی بندر گاہ سے ہم نے رات کے وقت دو جہاز چوری کیے۔ اِس کے بعد میں اب تک کئی جہاز لوٹ چکا ہوں۔ میں ہر اُس شخص کو اپنا دُشمن سمجھتا ہوں، جو راجوں اور سرداروں کے ساتھ تعاون کرتا ہے۔ مُجھے ہر دولت مند انسان میں اُس سردار کی روح نظر آتی ہے۔ مُجھے ہر اونچے ایوان میں لاجو نتی

جیسی مظلوم لڑکیوں کی روحیں انتقام کے لیے پکارتی سُنائی دیتی ہیں۔"

زبیر نے کہا۔ "مجھے اِس لڑکی کی دردناک موت کا سخت افسوس ہے اور سردار سے جنگ کرنے میں بھی شاید تم حق بجانب سمجھے جاسکو گے لیکن تُم ایک انسان کے ظُلم کا بدلہ دوسرے انسان سے کیسے لے سکتے ہو؟ تُم نے ہمارے جہاز پر حملہ کیا اور اُس پر کوئی سردار سوار نہ تھا۔ اس پر چند یتیم بچّے اور عورتیں تھیں۔"

گنگو نے جواب دیا: "مجھے افسوس ہے لیکن دوسرے جہاز پر سراندیپ کے راجہ کا جھنڈا لہرا رہا تھا اور آپ اُس کے معاون تھے۔ تاہم اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ کے جہاز پر عورتیں اور بچّے سوار ہیں تو میں حملہ نہ کرتا۔ چند ماہ ہوئے میں نے اِسی سمندر میں آپ کے ملک کا ایک جہاز دیکھا تھا لیکن میں نے اُسے صرف اِس لیے چھوڑ دیا کہ اس پر مردوں کے علاوہ چند عورتیں بھی تھیں۔"

خالد یہ سُن کر چلّا اٹھا۔ "کیا اُس پر سراندیپ کے چند ملّاح تھے؟"

"ہاں!"

"وہ تو ابّا کا جہاز تھا اور ابھی تک اُس کا کوئی پتہ نہیں۔ تُم جھوٹ کہتے ہو تُم اُن کا جہاز غرق کر چکے ہو۔"

گنگو نے جواب دیا۔ "اگر میں اِس جہاز کو غرق کر چکا ہوتا۔ تو مُجھے آپ کے سامنے اس کا ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔"

"اس جہاز پر ہاتھی بھی تھے؟"

"ہاں!"

"تمہیں اِس کے متعلّق بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں غرق ہوا؟"

"نہیں مُجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ جہاز دیبل تک صحیح سلامت پہنچ گیا تھا۔"

زبیر نے پوچھا۔ "اِس سمندر میں تمہارے سوا لٹیروں کا کوئی اور گروہ بھی ہے؟"

”ہاں!“

”کیا یہ مُمکن ہے کہ دیبل کے حاکم نے وہ جہاز لوٹ لیا ہو؟“

”ہاں! میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ خشکی کے ڈاکو سمندر کے لٹیروں سے زیادہ بے رحم ہیں۔“

(۴)

اس گفتگو کے بعد گنگو کے ساتھ زبیر کی دلچسپی بڑھ گئی۔ جے رام عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ گنگو کی سر گزشت نے زبیر کی طرح اُسے بھی متاثر کیا لیکن ایک وفادار سپاہی کی طرح وہ راجہ کو نکتہ چینی سے بُلند سمجھتا تھا۔ وہ رعایا کے کسی فرد کا یہ حق تسلیم کرنے کے لیے تیّار نہ تھا کہ وہ کسی ذاتی رنجش کی بنا پر راجہ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دے۔ وہ راجاؤں کی تقدیس کے مُقابلے میں رعیّت کی کمتری کا قائل تھا۔ تاہم جب زبیر نے گنگو سے پُر امن رہنے کا وعدہ لے کر اُس کی زنجیریں کھلوادیں، تو اُس نے مزاحمت نہ کی۔

چند دِن زبیر کی صحبت میں رہ کر گنگو نے اپنے خیالات میں ایک عجیب تبدیلی محسوس کی۔ زبیر نے چند ملاقاتوں میں روم اور ایران کے خلاف مسلمانوں کی ابتدائی جنگوں کا ذکر کر کے اس پر یہ ثابت کر دیا تھا کہ دُنیا میں صرف اسلام ایک ایسا نظام پیش کرتا ہے جو جبر واستبداد کی حکومتوں کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ گنگو ایک ڈاکو کی زندگی اختیار کرنے کے بعد سماج کے تمام مذہبی عقائد سے کنارہ کش ہو چکا تھا۔ اُس کے لیے دُنیا ایک وسیع جھیل تھی، جس میں بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو نگلتی ہیں، وہ خود کو ایک چھوٹی مچھلی سمجھتے ہوئے ہر بڑی مچھلی کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے تیّار تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ اُس کی ہمدردی کی پہلی وجہ یہ تھی کہ وہ روئے زمین کی بڑی مچھلیوں کے خلاف برسرِپیکار تھے۔ ایک دِن زبیر نے اُسے کہا کہ تُم ظُلم کے خلاف جنگ کرنا چاہتے ہو لیکن تمہارے ہتھیار اپنے دشمن کے ہتھیاروں سے مختلف نہیں۔ اُنھوں نے تمہاری کشتی جلائی تھی اور تُم اُن کے جہاز جلاتے ہو۔ دونوں کا اصول ظلم ہے جس طرح کئی بے گناہ اُن کے ظُلم کا شکار ہوتے ہیں۔ اِسی طرح کئی بے گناہ تمہارے ظُلم کا شکار ہوتے ہیں۔ تم خود تسلیم کر چکے ہو کہ تُم دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

تُم دونوں میں کسی کے پاس عدل و انصاف اور امن کے لیے کوئی قانون نہیں۔ اور جب تک تم میں سے ایک کے پاس ایسا قانون نہیں، تمہاری تلواریں آپس میں ٹکراتی رہیں گی۔ ایک تلوار کند ہو گی تو تم دوسری اُٹھا لو گے۔ ایک کمان ٹوٹے گی تو تم دوسری بنا لو گے۔ لیکن ظُلم کے مُقابلے میں حق و انصاف پر لڑنے والے انسان اپنے حریف کی تلوار کُند ہی نہیں کرتے بلکہ اُسے ہمیشہ کے لیے چھین لیتے ہیں۔ ایران اور روم پر عربوں کی فتح دراصل نظامِ باطل پر نظامِ حق کی فتح تھی۔ ظُلم پر انصاف کی فتح تھی، ایران مِصر اور شام کے وہ لوگ جو کل تک حق پرستوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے، آج افریقہ اور ترکستان سے ظُلم کی طاقتوں کو مٹانے کے لیے ہمارے دوش بدوش لڑ رہے ہیں۔"

گنگو نے متاثر ہو کر پوچھا۔ "کیا میں بھی آپ لوگوں کا ساتھ دے سکتا ہوں؟"

زبیر نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "ایک ڈاکو کی حیثیت سے نہیں۔ ہمارا کام بھٹکے ہوئے قافلوں کو لوٹنا نہیں بلکہ اُنہیں سلامتی کا راستہ دکھانا

ہے۔ وہ انسان جو خود ایک غَلَط مسلک پر کاربند ہو، ایک صحیح اصول کا علم بردار نہیں ہو سکتا۔“

گنگو نے نادم سا ہو کر کہا۔ ”اگر میں آپ کو یقین دِلاؤں کہ میں ایک لٹیرے کی زندگی سے توبہ کرتا ہوں تو آپ مُجھ پر یقین کر لیں گے؟“

”میں خوشی سے تُم پر اعتبار کروں گا۔“

”اور آپ مُجھے آزاد بھی کر دیں گے۔“ زبیر نے جواب دیا۔ ”اگر تم توبہ کے لیے یہ شرط پیش کرو، تو اِس کا مطلب یہ ہو گا کہ تُم اِس لیے توبہ نہیں کر رہے کہ تُم اپنے افعال پر نادم ہو اور اپنی اصلاح کرنا چاہتے ہو بلکہ اِس لیے کہ تُم آزاد ہونا چاہتے ہو۔“

”لیکن میری توبہ سے آپ یہ خیال تو نہیں کریں گے کہ میں بزدل ہوں۔“

”نہیں توبہ کرنا بہت بڑی جرأت کا کام ہے۔“

”تو میں آپ سے ایک ڈاکو کا پیشہ ترک کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔“

”مُجھے تم پر یقین ہے اور اگر تُم اپنے ساتھیوں کی ذمّہ داری لینے کے لیے تیّار ہو تو میں تم سب کو آزاد کر دوں گا اور جس جگہ کہو تمہیں اُتار دوں گا۔“

گنگو نے جواب دیا۔ ”میرے ساتھیوں نے صرف میری وجہ سے یہ پیشہ اختیار کیا تھا۔ اُن میں سے اکثر ایسے ہیں جو میری رہنمائی کے بغیر ایسی جرأت نہیں کر سکتے۔ اگر آپ اُنہیں سندھ کے کسی غیر آباد حصّے پر اُتار دیں تو پھر ماہی گیروں کا پیشہ اختیار کر لیں گے۔ وہ مدّت سے میرے ساتھ ہیں اور اُنہیں کوئی پہنچانے گا بھی نہیں۔ لیکن اُن میں چار آدمی خود سر ہیں۔ اُن کے متعلّق میں آپ کو یقین نہیں دِلا سکتا۔ مُجھے خود اپنے اوپر اعتماد نہیں اگر آپ نے مُجھے آزاد کر دیا تو ممکن ہے کہ کسی ظالم سردار کو دیکھ کر میں صبر نہ کر سکوں اور پھر اُسی ظلم پر اُتر آؤں۔ اگر آپ مُجھے اپنے ساتھ لے چلیں تو مُمکن ہے کہ آپ کے مُلک میں رہ کر میں بھی آپ جیسا انسان بن جاؤں۔ وہ چار آدمی جِن کا میں نے ذکر کیا ہے اگر میری طرح اُس جہاز پر ہوتے تو مُجھے یقین ہے، کہ آپ کی باتیں اُنہیں بھی متاثر

کر تیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنے ساتھیوں سے مل لوں۔"

(۵)

اگلے دِن یہ جہاز ایک ٹاپو کے کنارے لنگر انداز ہوئے۔ زبیر گنگو کو ساتھ لے کر دلیپ سنگھ کے جہاز پر چلا گیا۔ گنگو نے اپنے ساتھیوں کے سامنے سندھی زبان میں ایک مختصر تقریر کی۔ رہائی کا مژدہ سُن کر قیدیوں کے چہرے خوشی سے چمک اُٹھے لیکن جب گنگو نے یہ بتایا کہ وہ لوٹ مار سے توبہ کرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے اُن کا ساتھ چھوڑ چکا ہے تو بعضوں کی خوشی غم میں تبدیل ہو گئی۔ گنگو نے یکے بعد دیگرے سب سے قسمیں لیں لیکن تین آدمی جن میں سے ایک وہ بھی تھا جس کے آدھے سر اور داڑھی اور مونچھوں پر دلیپ سنگھ کے ساتھی اپنے استروں کی دھار کی آزمائش کر چکے تھے۔ متذبذب سے ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

گنگو نے اُن سے مخاطب ہو کر کہا: "کالو، واسو اور موتی! تُم کچھ عرصہ میرے ساتھ رہو گے۔"

اس کے بعد اُس نے زبیر سے مخاطب ہو کر کہا۔ "میں اُن کے پُر امن رہنے کی ضمانت دیتا ہوں۔" زبیر نے دلیپ سنگھ سے چند باتیں کرنے کے بعد ملّاحوں کو قیدیوں کی زنجیریں کھول دینے کا حکم دیا۔

کالو، واسو، موتی اور گنگو زبیر کے ساتھ دوسرے جہاز پر چلے آئے، واسو کا عجیب و غریب حلیہ دیکھ کر تمام عرب اُس کے گرد جمع ہو گئے۔ علی نے بے اختیار ایک قہقہہ لگایا اور عورتوں میں یہ خبر پہنچانے کے لیے بھاگا اور جب واپس آیا تو اُس کے ساتھ اُس کے علاوہ چند اور بچّے بھی تھے۔ تمام لوگ حیران ہو کر اُسے دیکھنے لگے۔ ہاشم نے آگے بڑھ کر معصومانہ انداز میں پوچھا۔ "تمہارے چہرے کے بائیں طرف بال نہیں اُگتے؟"

تمام عرب ہنس پڑے۔ علی کا قہقہہ سب سے بُلند تھا، گنگو کے ہنستے ہوئے ہاشم کو گود میں اُٹھا لیا۔ شام کے وقت خالد نے زبیر سے کہا۔ "ناہید کا خیال ہے کہ گنگو کو ابّا جان کے جہاز کا ضرور علِم ہو گا۔ وہ بذاتِ خود گنگو سے چند سوالات پوچھنے پر اصرار کر رہی ہے۔"

زبیر نے جواب دیا۔ "میرے خیال میں ہمیں گنگو کی باتوں پر اعتبار کرنا

چاہیے۔"

خالد نے کہا۔ "لیکن ناہید یہ کہتی ہے کہ اگر اِسے علم نہ بھی ہو اتو بھی وہ پتہ لگانے میں تمہاری مدد کر سکتا ہے۔ کل اُنہیں کوئی خواب نظر آیا تھا اور وہ یہ کہتی ہیں کہ ابّا جان زندہ ہیں۔"

"پوچھنے میں کوئی حرج نہیں لیکن بہتر یہ ہو گا کہ وہ اگر کوئی شک وشُبہ ظاہر نہ کریں۔ جاؤ اپنی بہن کو لے آؤ، میں گنگو کو بُلاتا ہوں۔"

دلیپ سنگھ نے گنگو کو بُلا لیا اور ناہید کے ساتھ مایا دیوی بھی آگئی۔ ناہید کے چہرے پر ایک سیاہ نقاب تھا۔ اُس نے مایا دیوی کے کان میں کُچھ کہا، اور مایا دیوی کے اثبات میں سر ہلانے پر اپنا ہار اُتار کر اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔

مایا دیوی نے ہار گنگو کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ "آپ نے چند دِن قبل ان کے باپ کے جہاز کا ذکر کیا تھا۔ اگر آپ اُن کے باپ کا پتہ لگا سکیں تو یہ آپ کا انعام ہے۔"

گنگو نے رنج وندامت سے آبدیدہ ہو کر یکے بعد دیگرے خالد اور زبیر کی

طرف دیکھا اور پھر ناہید سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”بیٹی! میں اتنا گرا ہوا نہ تھا!“

ناہید نے اُس کے آنسوؤں سے متاثر ہو کہا۔ ”آپ کو غَلَط فہمی ہوئی۔ مُجھے آپ پر شک نہیں۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ آپ ہماری مدد کریں۔“

”اِس کے لیے مُجھے ہار دینے کی ضرورت نہ تھی۔ میں زبیر کے احسان کا بدلہ نہیں اُتار سکتا۔ اگر کوئی لُٹیرا اِس جہاز کو لوٹتا تو مُجھے ضرور معلوم ہو جاتا۔ لیکن مُجھے شک ہے کہ وہ جہاز دیبل کی بندر گاہ کے آس پاس شہر کے حاکم نے لوٹا ہے۔“

ناہید نے کہا۔ ”میرا دِل گواہی دیتا ہے کہ میرا باپ زندہ ہے۔“

گنگو نے جواب دیا۔ ”اگر وہ زندہ ہے تو سندھ کے کسی ایسے قید خانے میں ہو گا جہاں سے لوگ موت سے پہلے باہر نہیں نکلتے۔ لیکن میں اُس کے سُراغ لگانے کی ذمّہ داری لیتا ہوں۔ اگر اُن کا پتہ مل گیا تو میں مکران کے حاکم کے پاس اطلاع بھیج دوں گا۔“

یہ کہہ کر وہ زبیر سے مخاطب ہوا۔ ”آپ مجُھے دیبل کے آس پاس اُتار دیں۔ جے رام اگر میری مدد کرے تو میں بہت جلد اُن کا پتہ لگا سکوں گا۔“

مایا دیوی نے کہا۔ ”میں اپنے بھائی کی طرف سے تمہاری مدد کا وعدہ کرتی ہوں۔ دیبل کا حاکم اُن کا دوست ہے اور وہ اُن سے کوئی بات نہیں چھپائے گا۔“

گنگو نے کہا۔ ”حاکم کسی کے دوست نہیں ہوتے اور دیبل کے حاکم کو تو میں اچھّی طرح جانتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ زبیر سے مخاطب ہوا۔ آپ دیبل کی بندرگاہ پر ٹھہرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟“

زبیر نے جواب دیا۔ ”میرا ارادہ نہ تھا لیکن جے رام کے مجبور کرنے پر میں ایک دو دِن ٹھہرنے کا ارادہ کر چکا ہوں۔“

گنگو نے کُچھ سوچ کر جواب دیا۔ ”مجُھے معلوم نہیں کہ سندھ کے راجہ اور دیبل کے حاکم پر جے رام کا کتنا اثر ہے۔ ورنہ میں آپ کو سندھ کے ساحل

پر اترنے کا مشورہ نہ دیتا۔“

زبیر نے جواب دیا۔ ”ہمارے ساتھ سندھ والوں کے تعلقات اس قدر بُرے نہیں پچھلے دِنوں ابو الحسن کے متعلّق پوچھنے کے لیے والئ مکران وہاں گیا تھا۔ راجہ اُس کے ساتھ غرور سے ضرور پیش آیا لیکن اُس پر دست درازی نہیں کی۔“

گنگو نے جواب دیا۔ ”اس کا جہاز خالی ہو گا لیکن آپ کے جہاز پر ہاتھی ہیں اور وہ اپنی فوجی طاقت بڑھانے کے لیے ہاتھیوں کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اِس کے علاوہ آپ کے ساتھ عورتیں ہیں۔ جن کے لیے اُس کے دِل میں کوئی عزّت نہیں۔“

دیبل

گنگو، کالو، واسو اور موتی کے علاوہ باقی تمام قیدی دیبل سے چند کوس دور ایک غیر آباد مقام پر اُتار دیے گئے۔ گنگو، ابوالحسن کا سُراغ لگانے کا بیڑا اُٹھا چکا تھا، اِس لیے اُس نے ایک گجراتی تاجر کے بھیس میں اپنے باقی ساتھیوں کے ہمراہ دیبل کی بندر گاہ پر اُترنے کا فیصلہ کیا۔ جے رام اِس مہم میں گنگو کی مدد کرنے کا وعدہ کر چکا تھا۔ تاہم اُس نے زبیر کو بار بار یقین دِلانے کی کوشش کی تھی کہ حکومت سندھ ایسا نہیں کر سکتی۔ اگر ابوالحسن کا جہاز دیبل کے آس پاس لوٹا گیا ہے تو دیبل کے حاکم اور راجہ کو یقیناً اُس کی خبر نہیں ہو گی۔

زبیر نے جواب دیا۔ ”مجھے خود یہ شُبہ نہیں۔ لیکن میں ناہید کے شُبہات دور کرنا چاہتا ہوں۔“

شام سے کُچھ دیر پہلے یہ جہاز دیبل کی بندر گاہ پر لنگر انداز ہوئے، مایا دیوی نے تمام عرب عورتوں کو اپنے گھر لے جانے پر اصرار کیا۔ جے رام نے تمام ملّاحوں کو دعوت دی۔ لیکن گنگو نے دلیپ سنگھ کے کان میں کُچھ کہا اور اُس نے جے رام کو مشورہ دیا۔ ”آپ کئی ماہ کے بعد میں واپس جارہے ہیں ممکن ہے کہ آپ کی جائے قیام بھی کسی اور کا قبضہ ہو۔ یہ بھی مُمکن ہے کہ دیبل کا حاکم اُنہیں شہر میں جانے کی اجازت دینے میں کوئی عُذر پیش کرے۔“

جے رام نے جواب دیا۔ ”اُسے کیا عُذر ہو سکتا ہے۔ وہ خود آپ کا میزبان بننے پر اصرار کرے گا۔ اگر آپ میری مدد نہ کرتے تو کاٹھیاوار کے بیش قیمت تحائف راجہ کے پاس نہ پہنچ سکتے۔ اب تو راجہ پر بھی آپ کا حق ہے۔“

زبیر نے جواب دیا۔ ”آپ شہر کے گورنر سے مل آئیں۔ پھر ہمیں آپ

کے ساتھ چلنے میں کوئی اعتراض نہ ہو گا۔"

مایا دیوی نے کہا۔ "بھیا آپ جائیں۔ اگر آپ کے مکان پر کوئی اور قابض ہوا تو یہ بہت بُری بات ہو گی۔ آپ مہمانوں کو ٹھہرانے کا انتظام کرائیں۔ میں اتنی دیر بہن ناہید کے پاس ٹھہروں گی۔"

جے رام نے بندر گاہ سے ایک آدمی بُلا کر اُسے تحائف کا صندوق اُٹھانے کا حکم دیا اور سیدھا دیبل کے گورنر پرتاپ رائے کے محل میں چلا گیا۔ پرتاپ رائے نے کاٹھیاواڑ کے تحائف کے ذکر کے سوا اُس کی باقی سرگزشت بے توجہی سے سُنی لیکن جب اُس نے یہ بتایا کہ اُسے ڈاکوؤں سے بچا کر یہاں پہنچانے والے سراندیپ کے جہاز ہیں تو اُس نے چونک کر سوال کیا۔ "کیا یہ جہاز وہی تو نہیں جن پر سراندیپ کے راجہ نے عربوں کو ہاتھی بھیجے ہیں؟"

"ہاں! لیکن آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا۔"

"یہ بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے میرے سوال کا جواب دو! اُس پر عرب بچّے

اور عورتیں بھی ہیں؟“

”ہاں!“

”یہ جہاز بحری ڈاکوؤں کے دو جہازوں کو ڈبو چکے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ کہ وہ اچھّی طرح مسلّح ہیں۔ وہ بندر گاہ سے روانہ تو نہیں ہو گئے۔“

”نہیں! میں مسافروں کو اپنے پاس ایک دو دِن مہمان رکھنا چاہتا ہوں۔ اُنہوں نے مُجھ پر بہت احسان کیے ہیں۔ میں آپ سے یہ پوچھنے آیا تھا کہ آپ کو اُن کے ٹھہرنے پر کوئی اعتراض تو نہیں؟“

”اعتراض! نہیں۔ وہ باقی تمام عُمر ہمارے مہمان رہیں گے۔ میں مہاراج سے اُن کے جہاز لُوٹنے اور اُنہیں گرفتار کرنے کی اجازت حاصل کر چکا ہوں۔“

اگر اس محل پر بجلی گِر پڑتی، تو بھی شاید جے رام اس قدر بدحواس نہ ہوتا۔ وہ ایک لمحہ کے لیے ایک بے جان مجسّمہ کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ بالآخر اُس نے سنبھل کر کہا۔ ”آپ مذاق کرتے ہیں؟“

پرتاپ رائے نے ذرا تلخ لہجے میں جواب دیا۔ ”میں بچّوں کے ساتھ مذاق کرنے کا عادی نہیں۔ ہمیں سندھی تاجروں سے اُن جہازوں کی آمد کی اطلاع مل گئی تھی اور مہاراج کا حکم یہی ہے کہ ان جہازوں کو چھین لیا جائے۔ مہاراج تحائف کا یہ صندُوق دیکھنے سے زیادہ اِس بات سے خوش ہوں گے کہ آپ مال و متاع سے بھرے ہوئے دو جہاز یہاں لے آئے ہیں۔“

جے رام نے چلّا کر کہا۔ ”نہیں! یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ وہ میرے مہمان ہیں۔ وہ میرے دوست اور محسن ہیں۔“

پرتاپ رائے نے ڈانٹ کر کہا۔ ”ہوش سے بات کرو تمہیں معلوم نہیں تم کہاں کھڑے ہو؟“

جے رام نے کہا۔ ”یہ انسانیت کے خلاف ہے۔ تم ایک ایسی قوم کی دُشمنی مول لو گے جو سندھ میں کئی سلطنتیں پاؤں تلے روند چُکی ہے۔ مہاراج کو اِس قسم کا مشورہ دینے والے نے ان کے ساتھ اچھّا نہیں کیا۔ میں جانتا ہوں۔ مہمان کی رکھشا ایک راجپوت کا دھرم ہے۔“

"راجہ کے باغی ہو کر تم کہیں نہیں جا سکتے۔" یہ کہتے ہوئے پرتاپ رائے نے پہرہ داروں کو آواز دی اور آن کی آن میں چار سپاہیوں نے ننگی تلواروں سے اُس کے گرد گھیرا ڈال لیا۔

جے رام کو اپنی تلوار بے نیام کرنے کا موقع نہ ملا۔ پرتاپ رائے نے کہا۔ """تمہیں کچھ دیر میری قید میں رہنا پڑے گا۔ بندر گاہ سے واپس آ کر میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔ کل تمہیں مہاراج کے پاس روانہ کر دیا جائے گا۔ اگر تم اپنے مہمانوں کی جاں بخشی کروا سکو تو میں اُنہیں رہا کر دوں گا لیکن تمہاری خوشی کے لیے میں راجہ کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا۔"

سپاہیوں نے جے رام کو محل کی ایک کوٹھری میں بند کر دیا۔ جے رام دروازے کو دھکّے دینے، دیواروں سے سر پٹخنے اور شور مچانے کے بعد خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ اُسے اپنی بہن کا خیال آیا، اور وہ پھر اُٹھ کر دروازے سے ٹکریں مارنے لگا۔ اُس نے تلوار نکالی لیکن مضبوط کواڑ پر چند ضربیں لگانے کے بعد وہ بھی ٹوٹ گئی۔ اس نے ٹوٹے ہوئے پھل کی نوک اُٹھا کر اپنے سینے میں گھونپنے کا ارادہ کیا لیکن کسی خیال نے اُس کا ہاتھ

روک لیا وہ اُٹھ کر بے قراری سے کوٹھری میں ٹہلنے لگا۔ پھر اُسے ایک خیال آیا اور اس نے پہرہ داروں کو آوازیں دیں۔ اُنہیں طرح طرح کے لالچ دیے لیکن کسی نے اُس کے حال پر توجّہ نہ دی۔ اس نے راجہ کے پاس شکایت کرنے کی دھمکیاں دیں، لیکن جواب میں پہرہ داروں کے قہقہے سُنائی دیے۔

(۲)

جے رام کے شہر جانے سے کُچھ دیر بعد گنگو اور اُس کے تین ساتھی شام کے دُھندلکے میں زبیر سے رُخصت ہو کر شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ شہر میں داخل ہوتے ہی انہیں پندرہ بیس سوار اور اُن کے پیچھے قریباً ڈیڑھ سو پیدل سپاہی بندرگاہ کا رُخ کرتے ہوئے دِکھائی دیے۔ گنگو کا ماتھا ٹھنکا اور وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ سوار اور پیدل گزر گئے تو گنگو نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”شہر کا سردار مسلّح سپاہی لے کر بندرگاہ کی طرف جا رہا ہے۔ اُن کی رفتار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کی نیّت ٹھیک نہیں۔ ہمیں واپس چلنا چاہیئے۔“

کالو نے کہا۔ ”اگر وہ واقعی کسی بُری نیّت سے جا رہے ہیں تو ہم لوٹ کر کیا کر سکتے ہیں۔ اُنہیں تو جہازوں کے لنگر اُٹھانے اور بادبان کھولنے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ ہمیں اپنی فکر کرنی چاہیئے۔“

گنگو نے کہا۔ ”اگر تُم میرا ساتھ چھوڑنا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی۔ لیکن میں ضرور جاؤں گا۔ اور داسو، موتی، تُم بھی اگر چاہو تو جا سکتے ہو۔“

اُن دونوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ ”نہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں۔“

کالو نادم سا ہو کر بولا۔ ”میں بھی آپ کے ساتھ ہوں، لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں؟“

گنگو نے جواب دیا۔ ”یہ ہم وہاں پہنچ کر دیکھیں گے۔“

موتی نے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ جے رام نے اپنے محسنوں کو دھوکا دیا ہے۔“

گنگو نے جواب دیا۔ ”ہو سکتا ہے لیکن اگر اس کی نیّت بُری ہوتی تو اپنی بہن کو یہاں کیوں چھوڑ جاتا۔“

واسو نے کہا۔ ”یہ سمجھنا مُشکل نہیں۔ وہ اپنی بہن کو اِس لیے اُن کے پاس چھوڑ گیا تھا کہ وہ اُس کے جانے کے بعد بندر گاہ پر ٹھہرنے کا ارادہ تبدیل نہ کر دیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ لڑکی بھی اِس سازش میں شریک تھی۔ دیکھنے میں وہ کتنی بھولی بھالی ہے۔ وہ جہاز پر اس لڑکی کو اپنی بہن کہا کرتی تھی۔“ گنگو نے کہا۔ ”اور جے رام خالد کو چھوٹا بھائی کہا کرتا تھا اور جب زبیر بیمار تھا، وہ دِن رات اُس کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ جھوٹا، مکّار، دغا باز۔ کاش وہ میرے ہاتھ چڑھ جائے۔ لیکن وہ لڑکی۔۔۔۔ کالو وہ ہمارے ہاتھ سے نہ جائے اُسے پکڑ کر ہم بہت سے کام نکال سکتے ہیں۔ چلو جلدی کرو۔ یہ باتوں کا وقت نہیں۔“ گنگو اور اُس کے ساتھی پوری رفتار سے بندر گاہ کی طرف بھاگنے لگے۔

(۳)

عرب ملّاح جہاز پر نمازِ مغرب ادا کرنے کے بعد دُعا کر رہے تھے کہ دلیپ سنگھ نے اپنے جہاز سے اُن کے جہاز پر پہنچ کر انہیں بندر گاہ کی طرف متوجّہ کیا۔ زبیر اور اُس کے ساتھی ساحل پر مسلّح سپاہی دیکھ کر

بہت پریشان ہوئے۔ چار آدمی ایک کشتی میں سوار ہو کر جہاز پر پہنچے اور ان میں سے ایک نے سندھی زبان میں کہا۔ ”دیبل کے حاکم سردار پرتاپ رائے آپ لوگوں کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ وہ اِن جہازوں کے افسروں سے ملنا چاہتے ہیں۔“

دلیپ سنگھ نے پرتاپ رائے کے پیام رساں سے پوچھا۔ ”لیکن جے رام کہاں ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”وہ مہاراج پرتاپ رائے سے مل کر آپ لوگوں کی دعوت کا انتظام کرنے کے لیے اپنی قیام گاہ پر چلے گئے ہیں۔ مہاراج خود آپ کے استقبال کے لیے آئے ہیں۔“

دلیپ سنگھ نے زبیر سے عربی میں کہا۔ ”یہ ضرور کوئی فریب ہے لیکن ہمارے لیے جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔“

زبیر نے جواب دیا۔ ”میں خود حیران ہوں کہ دیبل کا حکمران اتنے سپاہی ساتھ لے کر کیوں آیا ہے لیکن مجھے جے رام سے فریب کی توقّع نہیں۔

اُس کی بہن اِس جہاز پر ہے۔"

ایلچی نے پھر پوچھا۔ "میں مہاراج کے پاس کیا جواب لے جاؤں؟"

زبیر نے کہا۔ "ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔"

زبیر اور دلیپ سنگھ کشتی میں سوار ہو کر ساحل پر پہنچے۔ دلیپ سنگھ پرتاپ رائے کے سامنے جھک کر آداب بجالایا، لیکن زبیر کی گردن میں خم نہ آنے پر پرتاپ رائے نے کہا۔ "تو تم عرب کے باشندے ہو۔ تم میں سے کسی کو بڑوں کا ادب کرنا نہیں آتا۔"

دلیپ سنگھ نے جواب دیا۔ "اِن کے مذہب میں انسان کے آگے جھکنا پاپ ہے۔"

پرتاپ رائے نے جواب دیا۔ "ہمارے پاس رہ کر اسے انسانوں کے سامنے جھکنا بھی آجائے گا۔"

دلیپ سنگ نے پوچھا۔ "آپ کا مطلب؟"

پرتاپ رائے نے جواب دیا۔ ”کُچھ نہیں۔ تمہارے جہازوں پر کیا ہے؟“

دلیپ سنگھ نے کہا۔ ”جے رام نے آپ کو سب کُچھ بتا دیا ہو گا۔ آپ ہم سے کیوں پوچھتے ہیں؟“

”جے رام نے جو کُچھ بتایا ہے اگر وہ صحیح ہے تو یہ جہاز یہاں سے نہیں جا سکتے۔“

”جہاز یہاں سے نہیں جاسکتے۔ وہ کیوں؟“

”یہ راجہ کا حکم ہے۔“

دلیپ سنگھ نے چاروں طرف دیکھا، زبیر اور اُس کے گرد مسلّح سپاہیوں کا گھیرا تنگ ہو چکا تھا۔ اُس نے عربی زبان میں زبیر کو صورتِ حالات سے آگاہ کیا اور زبیر کے سمجھانے پر وہ پرتاپ رائے سے مخاطب ہوا: ”یہ سندھ کے نادار ملّاحوں کی کشتیاں نہیں جن پر آپ دست درازی کر سکیں۔ یہ عربوں کے جہاز ہیں۔ اِن پر اُس قوم کی بیٹیاں سوار ہیں جو سرکشوں اور باغیوں کے مُقابلے میں آندھی کی طرح اُٹھتی ہے اور بادل

کی طرح چھا جاتی ہے۔ جو آسمان سے بجلیاں گرتی دیکھ کر نہیں ڈرتے، وہ اُن کی تلوار سے پناہ مانگتے ہیں۔"

پرتاپ رائے نے غضب ناک ہو کر تلوار نکال لی۔ دلیپ سنگھ اور زبیر نے تلواریں کھینچنے کی کوشش کی لیکن کئی ننگی تلواریں اور چمکتے ہوئے نیزوں نے اُن کے ہاتھ روک لیے۔ پرتاپ رائے نے کہا۔ "تُم سندھی معلوم ہوتے ہو لیکن تمہاری رگوں میں کسی بُزدل غدّار اور کمینے آدمی کا خون ہے۔"

دلیپ سنگھ نے جواب دیا۔ "دُنیا میں سب سے بڑی غدّاری اور کمینگی اپنے مہمان کو دھوکا دینا ہے اور مُجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ تم۔۔۔۔"

دلیپ سنگھ کا فقرہ پورا نہ ہوا تھا کہ پرتاپ رائے کی تلوار کی نوک اُس کے سینے میں اُتر گئی اور وہ تیورا کر زمین پر گر پڑا۔ زبیر نے جھُک کر اُسے ہاتھوں کا سہارا دیا۔ اُس نے ایک جھرجھری لے کر زبیر کی طرف دیکھا اور کہا "زبیر! تمہارے ساتھ میرا سفر ختم ہوا۔ میں دِل پر ایک بھاری بوجھ لے کر جا رہا ہوں۔ میں جہالت کی گود میں پلا۔ ابوالحسن نے مُجھے انسان

بنایا اور تُم نے میرے دِل میں اسلام کے لیے ایک تڑپ پیدا کی لیکن نہ معلوم کیوں میں اب تک اپنے ضمیر کی آواز بُلند کرنے سے جھجکتا رہا۔ میں لوگوں کی نظروں سے چھُپ کر نمازیں پڑھ چکا ہوں۔ روزے رکھ چکا ہوں لیکن اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرنے سے جھجکتا رہا۔ اب میں ارادہ کر رہا تھا کہ بصرہ پہنچ کر مسلمان ہونے کا اعلان کروں، لیکن خُدا کو یہ منظور نہ تھا۔ مُجھے ناہید کا افسوس ہے۔ خُدا اُسے بے رحم دُشمن کے ہاتھوں سے بچائے۔ میرے دوست مجھے بھول نہ جانا! میرے لیے دُعا کرنا!!"

دلیپ سنگھ نے پھر ایک جھر جھری لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ چند بار کلمۂ توحید دہرایا۔ اُس کی آواز خفیف اور مدھم ہوتی گئی۔ ہونٹ کپکپائے، بھنچے اور ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ بصرہ کے مسافر کی پتھرائی ہوئی آنکھیں کسی ایسی منزل کو دیکھ رہی تھیں جس کے مسافر واپس نہیں آتے۔ دلیپ سنگھ دائمی نیند کی گود میں جا چکا تھا۔ زبیر نے "اِنّا لِلّٰہِ و اِنّا اِلیہ راجعون" کہا اور دلیپ سنگھ کا سر زمین پر رکھ کر حقارت سے پرتاپ رائے کی طرف دیکھنے لگا۔

سپاہی کشتوں پر سوار ہو کر تیر برساتے ہوتے جہازوں کا رُخ کر رہے تھے اور جہازوں سے تیروں کا جواب تیروں میں آرہا تھا۔ زبیر کے لیے فرار کی تمام راہیں بند تھیں۔ پرتاپ رائے کے اشارے سے آٹھ دس سپاہی اُس پر پل پڑے اور اُسے رسّیوں سے جکڑ کر زمین پر ڈال دیا۔ زبیر حسرت سے اپنے جہازوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

(۴)

جہاز پر ناہید کے علاوہ دوسری عرب عورتیں بھی مردوں کے شانہ بشانہ لڑ رہی ہیں۔ ہاشم دیر تک دوسرے بچّوں کے ساتھ ایک کونے میں چھُپ کر نہ بیٹھ سکا۔ وہ اوپر آکر خالد کے قریب کھڑا ہو گیا اور پوچھنے لگا۔ یہ ہمیں کتنی بار بحری ڈاکوؤں سے مُقابلہ کرنا پڑے گا؟"

خالد نے کمان میں تیر چڑھاتے ہوئے مُڑ کر دیکھا۔ ہاشم کے قریب مایا دیوی حیران و ششدر کھڑی تھی۔ اُس نے کہا۔ "مایا دیوی! تُم ہاشم کو نیچے لے جاؤ!"

مایا دیوی ہاشم کو اُٹھا رہی تھی کہ ایک سنسناتا ہوا تیر آیا اور ہاشم کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ مایا دیوی نے بھاگ کر اُسے ایک کونے میں لِٹا دیا اور تیر نکالنے کی کوشش کرنے لگی۔ ہاشم ایک ہلکی سی آہ اور معمولی سی کپکپاہٹ کے بعد ٹھنڈا ہو گیا۔ مایا دیوی سِسکیاں لیتی ہوئی اُٹھی، لیکن پیچھے سے ایک مضبوط ہاتھ کی گرفت میں بے بس ہو کر رہ گئی۔

"کون ہے؟ گنگو!" اُس نے چاند کی دھیمی روشنی میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں! میں ہوں۔ کالو! اُٹھا لو اِسے، اگر شور مچائے تو گلا گھونٹ دینا۔"

کالو مایا دیوی کو اُٹھا کر جہاز کی پچھلی طرف رسّی کی ایک سیڑھی سے اُتر کر ایک کشتی پر سوار ہو گیا۔

گنگو نے آگے بڑھ کر خالد کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اب مقابلے کرنے سے کُچھ نہیں ہو گا۔ اُن کی تعداد ہم سے بہت زیادہ ہے اور عقب سے بھی دو جہاز ہم پہ حملہ کرنے کے لیے آ رہے ہیں۔ میری کشتی

جہاز کے پیچھے کھڑی ہے، میں تمہیں اور ناہید کو بچا سکتا ہوں۔"

خالد نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "ہم اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔"

"لیکن تُم نہیں جانتے کہ وہ لوگ تمہاری بہن کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔"

"لیکن میں جہاز کی تمام عورتوں کو اپنی بہنیں سمجھتا ہوں۔ اب جے رام کی دغابازی سے مُجھے کسی پر اعتماد نہیں رہا۔"

ایک تیر ناہید کو لگا اور وہ پسلی پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی۔ خالد نے آگے بڑھ کر اُسے اُٹھانے کی کوشش کی لیکن اُس نے کہا۔ "میں ٹھیک ہوں۔ خالد! تُم میری فکر نہ کرو۔"

خالد نے اُس کے اصرار کے باوجود اُسے اُٹھا کر ہاشم کے قریب بِٹھا دیا۔ ہاشم کی لاش دیکھ کر ناہید کو اپنا زخم بھول گیا۔ اُس نے ہاشم کو جھنجوڑا، آوازیں دیں اور انتہائی کرب کی حالت میں بولی۔ "ہاشم تُم اوپر کیوں

آئے؟“

گنگو نے بے خبری کی حالت میں ناہید کی پسلی سے تیر نکال کر پھینک دیا اور واسو سے کہا۔ ”اِسے اُٹھالو!“

واسو ناہید کو اٹھانے کے لیے جھکا لیکن خالد نے آگے بڑھ کر اُسے پیچھے دھکیل دیا اور کہا۔ ”تُم جے رام اور یہ سپاہی مختلف راستوں سے آئے تھے لیکن تُم سب کا مقصد ایک ہے۔ جاؤ ہم تمہیں ایک دفعہ معاف کر چکے ہیں۔“

گنگو نے کہا۔ ”بیٹا اگر باتوں کے لیے وقت ہوتا، تو میں تمہارا شک دور کرنے کی کوشش کرتا لیکن ہم پر دشمن کا گھیرا تنگ ہو رہا ہے اور اگر ہم نے چند اور لمحات ضائع کر دیے تو بھاگنے کے تمام راستے بند ہو جائیں گے۔ افسوس میں تمہیں سوچنے کی مہلت بھی نہیں دے سکتا۔ بیٹی مُجھے معاف کرنا۔“

یہ کہتے ہوئے گنگو نے اچانک ایک چھوٹا سا ڈنڈا خالد کے سر پر دے مارا۔

خالد لڑکھڑایا لیکن گنگو نے اُٹھا کر اُسے کندھے پر رکھ لیا۔ واسو نے ناہید کو اٹھا لیا او گنگو نے موتی سے کہا: ”تم یہ کمانیں اُٹھا لو، یہ ہمیں کام دیں گی۔“

حملہ آور کمندیں ڈال کر جہازوں پر سوار ہو رہے تھے اور تیروں کی لڑائی تلواروں کی لڑائی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اِس ہنگامے میں کسی کو ناہید خالد اور مایا دیوی کے اغوا کیے جانے کا پتہ نہ چلا۔ جب تک یہ لوگ کشتی پر سوار ہوئے، چند کشتیاں عقب سے بھی جہازوں ے قریب پہنچ چکی تھیں۔ گنگو اور اُس کے ساتھیوں نے سندھی زبان میں ہاؤ ہو کر کے حملہ آوروں کو شک نہ ہونے دیا اور بچتے بچاتے جہازوں سے ایک طرف نکل گئے۔

گنگو کے کہنے پر مایا دیوی نے اپنا دوپٹہ پھاڑ کر ناہید کے زخم پر پٹّی باندھ دی۔ خالد کو اپنے ساتھ دیکھ کر اب اُسے بھی خیال نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ گنگو پانی سے کپڑا بھگو بھگو کر خالد کے ماتھے پر رکھ رہا تھا اور مایا دیوی کو وہ شخص جو چند لمحے پیشتر ایک بدترین دشمن کی صورت میں نمودار ہوا تھا ایک غمگسار نظر آ رہا تھا۔ کشتی خطرے کی حد سے دور آ چکی تھی اور مایا

گنگو سے ہم کلام نہ ہونے کا ارادہ کرنے کے باوجود بار بار یہ پوچھ رہی تھی۔ ”اِسے زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟ یہ کیسے بے ہوش ہوا؟“

ناہید انتہائی رنج و ملال کی وجہ سے کسی سے ہم کلام نہ ہوئی۔ وہ تشویش کی حالت میں اپنے بھائی کی طرف دیکھتی اور جب گنگو یہ کہتا۔ ”بیٹی! تُم فکر نہ کرو تمہارے بھائی کو ابھی ہوش آ جائے گا۔ میں تمہارا دُشمن نہیں۔ میں سمندر کے دیوتا کی قسم کھاتا ہوں۔“ تو ناہید خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی۔

پھر وہ مایا دیوی سے مخاطب ہوا۔ ”مایا! تُم ایک راجپوت لڑکی ہو۔ راجپوت جھوٹی قسمیں نہیں کھاتے۔ میں تُم سے پوچھتا ہوں، کیا تمہیں یہ شک تھا کہ تمہارا بھائی اِن لوگوں کو دھوکا دے گا۔“

”نہیں نہیں! میرا بھائی ایسا نہیں۔ میں بھگوان کی قسم کھاتی ہوں۔“

”اور اگر یہ ثابت ہو گیا تو؟“

”تو میں۔۔۔ میں کنوئیں میں چھلانگ لگا دوں گی۔ آگ میں جل جاؤں

گی۔ اپنا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ ڈالوں گی۔ بھگوان کے لیے ایسا نہ کہو۔" مایا دیوی کی ہچکیوں نے ناہید کو متاثر کیا اور اُس نے کہا۔ "مایا! تُم اِن باتوں کی پروانہ کرو۔ مُجھے تم پر یقین ہے اور اگر تمہارے بھائی نے ہمارے ساتھ دھوکا بھی کیا ہو تو اِس میں تمہارا کیا قصور؟"

"میں پھر کہتی ہوں میرا بھائی ایسا نہیں۔ اُس کی رگوں میں ایک راجپوت کا خون ہے۔ وہ اِس قدر احسان فراموش نہیں ہو سکتا۔"

ناہید نے کہا۔ "اِس وقت ہمارا دُشمن وہ ہے جس نے ہمیں زبردستی جہاز پر سے اُتارا ہے اور کہیں کسی نامعلوم جگہ پر لے جا رہا ہے۔" گنگو نے کہا۔ "بیٹی! کاش میں تمام بچّوں اور عورتوں کو اپنے ساتھ لا سکتا لیکن اِس کشتی پر صرف اتنی سواریوں کی جگہ تھی اور تم جوان ہو اور میں تمہیں ایک بے رحم دُشمن کے ہاتھوں سے بچانا چاہتا ہوں۔ اور مایا دیوی تم شاید باقی سب کو بچا سکو۔ میں تمہاری آزادی کے بدلے باقی لوگوں کو آزاد کروانا چاہتا ہوں۔"

خالد نے ہوش میں آ کر آنکھیں کھولیں اور حیران ہو کر سب کی طرف

دیکھا۔ گذشتہ واقعات یاد آتے ہی وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور دُکھتے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”ہمارا جہاز کہاں ہے؟ ہم کہاں جا رہے ہیں۔“ گنگو! گنگو! دغا باز فریبی! تُم نے ہمارے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا؟ وہ کیا کہیں گے؟ تُم ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟“

گنگو نے ٹھنڈے دِل سے جواب دیا۔ ”خالد! یہ میری عمر میں پہلا موقع ہے کہ مُجھے کسی کی گالی پر غصّہ نہیں آیا۔ تُم مُجھے جو جی میں آئے کہو لیکن میں نے بُرا نہیں کیا۔ میں صرف مایا کو لینے آیا تھا لیکن تمہاری بہن کو زخمی دیکھ کر یہ گوارا نہ کر سکا کہ اِسے دُشمن کے رحم پر چھوڑ دوں۔“

خالد نے حقارت سے مایا دیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”میں اب سمجھا جے رام نے ایک طرف سے ہم پر حملہ کرنے کے لیے سپاہی بھیج دیے اور دوسری طرف سے تمہیں مایا دیوی کو لینے کے لیے بھیج دیا۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ لیٹروں کے سردار تُم نہ تھے، جے رام تھا۔“

”تُم درست کہتے ہو لیکن میں توبہ کر چکا ہوں اور جے رام نے توبہ نہیں کی۔ ممکن ہے وہ اپنی بہن کی خبر سُننے کے بعد توبہ کرے۔“

”تو تم ہمیں اُس کے پاس نہیں لے جارہے ہو؟“

”تُم دیکھ سکتے ہو بندرگاہ کس طرف ہے اور ہم کس طرف جارہے ہیں؟“

”تم ہمیں کہاں لے جاؤ گے؟“

”کسی ایسی جگہ جہاں راجہ کے سپاہی نہ پہنچ سکیں۔“

خالد نے کہا۔ ”اگر تمہاری نیّت بُری نہیں تو ہمیں اپنے ساتھیوں کے پاس چھوڑ آؤ۔“

گنگو نے کہا۔ ”تمہارے ساتھی تھوڑی دیر میں دیبل کے قید خانے میں ہوں گے۔ تُم قید ہونے کی بجائے قید سے باہر رہ کر اُن کی زیادہ مدد کر سکتے ہو۔“

خالد نے قدرے پُر اُمّید ہو کر پوچھا۔ ”تم سچ مُچ اُن کی مدد کرنا چاہتے ہو؟“

گنگو نے جواب دیا۔ ”بیٹا مُجھے تم سے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہ تھی! اگر

میں تمہارا دُشمن ہوتا تو یقیناً اِس قدر ٹھنڈے دِل سے یہ گالیاں نہ سنتا۔"

اگلے دِن کشتی دریائے سندھ کے دہانے پر پہنچ گئی۔ گنگو کو اپنے ساتھی مچھلیاں پکڑتے ہوئے مل گئے۔

قیدی

اگلے دِن کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور پہرے دار نے جے رام کو ہاتھ باندھ کر پرنام کیا اور کہا: ”آپ کو سردار پرتاپ رائے بلاتے ہیں۔

جے رام پہرے دار کے طرزِ عمل میں اِس تبدیلی پر حیران تھا۔ وہ چُپکے سے اُس کے ساتھ ہو لیا۔ پرتاپ رائے اپنے دیوان خانے کے برآمدے میں آبنوس کی ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے سامنے چاندی کے ایک طشت میں سراندیپ کے راجہ کے دو تحائف پڑے ہوئے تھے، جو گذشتہ شام عربوں کے جہاز سے لوٹے گئے تھے۔

اس نے جے رام کو دیکھتے ہی جواہرات کے انبار کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔ ”جے رام! مہاراج سراندیپ کے تحائف دیکھ کر کاٹھیاواڑ کے راجہ کے تحائف کی نسبت زیادہ خوش ہوں گے۔ اِن میں ایک ایک ہیرا تمہارے صندُوق کے سارے مال سے زیادہ قیمتی ہے۔“

جے رام نے اُس پر قہر آلود نگاہ ڈالی اور اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔

پرتاپ رائے نے کہا۔ ”لیکن تمہارا چہرہ زرد اور تمہاری آنکھیں سُرخ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے تم رات بھر نہیں سوئے۔ کوٹھری میں بہت گرمی ہو گی۔ بندرگاہ سے واپس آکر مُجھے تمہارا خیال نہ آیا۔ ورنہ تمہیں اتنی دیر وہاں رکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ میں نے مہاراج کی خدمت میں ایلچی بھیج دیا ہے۔ چند دِنوں تک قیدیوں کے متعلّق اُن کا حکم آجائے گا۔“

جے رام نے کہا۔ ”تو آپ نے اُنہیں قید کر لیا ہے۔“

”ہاں! میں نے تمہیں کل بھی بتایا تھا کہ یہ راجہ کا حکم ہے۔“

”آپ نے اُنہیں لڑ کر قید کیا یا میزبان بن کر؟“

پرتاپ رائے نے جواب دیا۔ ”تم ابھی بچّے ہو۔ لڑائی میں سب کُچھ جائز ہے۔“

”میری بہن کہاں ہے؟“

”کون؟“

”میری بہن۔“

”کہاں تھی؟“

”آپ مُجھے بنانے کی کوشش نہ کریں۔ ایک راجپوت کی عزّت پر ہاتھ ڈالنا اِس قدر آسان نہیں جس قدر آپ سمجھتے ہیں۔ میں پہلے آپ کے راجہ کا ملازم تھا اور اب میں کاٹھیاواڑ کے راجہ کے سفیر کی حیثیت میں یہاں آیا ہوں۔ اگر آپ نے میری بہن کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھا تو یاد رکھیے میں کاٹھیاواڑ سے لے کر راجپوتانہ تک آگ کی دیوار کھڑی کر دوں گا اور مہاراج اپنے ہزاروں سپاہیوں کی جانیں ضائع کرنے کے بجائے دیبل کے ایک مغرور حاکم کو ہمارے حوالے کر دینا زیادہ مناسب سمجھیں گے۔

رہے عرب، وہ مہمان تھے۔ مُجھے افسوس ہے کہ وہ میری وجہ سے اِس مُصیبت میں مبتلا ہوئے۔ مُمکن ہے کہ ان کے متعلّق میری پکار ہندوستان کے کسی گوشے میں سُنی جائے لیکن اُن کے بازو بہت لمبے ہیں۔ وہ جب چاہیں گے آپ کا گلا دبوچ لیں گئے۔"

پرتاپ رائے کو معلوم تھا کہ بعض اوقات راجہ کے غَلَط احکام بجالانے کا خمیازہ اہلکاروں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ حاکم خطرے کے وقت اپنا قصور اہل کاروں کے سر تھوپ دیتے ہیں۔ عربوں کے متعلّق وہ اپنے راجہ کی طرح مطمئن تھا لیکن وہ کاٹھیاواڑ کے سفیر کی بہن کی ذمّہ داری لینے کو تیّار نہ تھا۔ اُس نے کہا۔

"جے رام! مُجھے تمہاری بہن کے متعلّق کوئی علم نہیں۔"

"آپ جھوٹ کہتے ہیں۔ میں اُسے جہاز پر عرب عورتوں کے پاس چھوڑ آیا تھا۔"

"عورتیں جو جہاز پر تھیں۔ وہ سب ہماری قید میں ہیں۔ اگر تمہاری بہن

اُن میں ہے تو میں ابھی تمہارے ساتھ مل کر اِس سے معافی مانگتا ہوں۔ چلو!"

بہن کو تلاش کرنے کی خواہش جے رام کے تمام ارادوں پر غالب آگئی اور وہ پرتاپ رائے کے ساتھ چل دیا۔ راستے میں اس نے پوچھا۔ "عرب ملّاحوں کے ساتھ آپ نے کیا سلوک کیا؟"

پرتاپ رائے نے جواب دیا۔ "وہ سب آخری وقت تک لڑتے رہے۔ عورتوں اور بچّوں کے علاوہ ہم صرف پانچ آدمیوں کو زندہ گرفتار کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ دوسرے جہاز پر سراندیپ کے ملّاؤں نے معمولی مزاحمت کی لیکن جلد ہی ہتھیار ڈال دیے۔"

"تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے بیک وقت سراندیپ اور عرب کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا ہے۔"

"میں نے صرف راجہ کے احکام کی تعمیل کی ہے اور جب تک میں اِس عہدے پر ہوں، میں ایسے احکام کی تعمیل کرتا رہوں گا۔ میرے خط کے

جواب میں راجہ نے اگر تمہیں بُلا بھیجا اور تُم نے اُن سے قیدیوں کو رہا کرنے کی اجازت حاصل کرلی، تو مُجھے خوشی ہو گی۔ میں خواہ مخواہ کی ذمّہ داری سے بچ جاؤں گا۔“

محل سے نکل کر چند قدم کے فاصلے پر جے رام اور پرتاپ رائے قید خانے کی چار دیواری میں داخل ہوئے۔ پہرہ داروں نے پرتاپ رائے کا اشارہ پا کر عربوں کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ عورتوں نے اپنے چہرے ڈھانپ لیے۔ عرب ملّاحوں نے جے رام کو دیکھتے ہی مُنہ پھیر لیے۔ زبیر ایک کونے میں دیوار کے سہارے بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے نفرت اور حقارت سے جے رام کی طرف دیکھا اور اپنے ساتھیوں کی طرح منہ پھیر لیا۔

جے رام نے پرتاپ رائے کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”میری بہن یہاں نہیں، وہ کہاں ہے؟“

پرتاپ رائے نے ایک پہرہ دار کو آواز دے کر اندر بلایا اور اُس سے پوچھا۔ ”کیا تمام عورتیں اِسی کمرے میں ہیں یا سراندیپ کے ملّاحوں کے کمرے میں بھی کوئی ہے؟“

”نہیں مہاراج! تمام عورتیں یہیں ہیں۔“

جے رام نے بدحواس ساہو کر زبیر کی طرف دیکھا اور ٹوٹی پھوٹی عربی میں کہا۔ ”زبیر! میری طرف اِس طرح نہ دیکھو۔ میں بے قصور ہوں۔ تمہیں معلوم ہے میری بہن کہاں ہے؟“

زبیر کے مُنہ سے اچانک ایک بھوکے شیر کی گرج سے ملتی جُلتی آواز نکلی۔ ”تُم میری توقّع سے کہیں زیادہ ذلیل ثابت ہوئے ہو۔ تم جھوٹ سے حقیقت پر پردے نہیں ڈال سکتے۔ لیکن یاد رکھو، اگر ناہید کا بال بھی بیکا ہوا، تو خُدا کی زمین پر تمہیں کوئی ایسا خطّہ نہیں ملے گا جو ہمارے اِنتقام سے پناہ دے سکے۔ ناہید کو اُڑانے کے لیے تُم نے اپنی بہن کو جہاز پر چھوڑا تھا۔ تمہاری تدبیر کامیاب تھی۔ تم نے اپنے اِس حلیف کو ہمارا میزبان بنا کر بھیجا اور مُجھے جہاز سے بُلوا لیا اور خود پیچھے سے جہاز پر پہنچ کر نہ معلوم کس بہانے سے ناہید کو کہیں لے گئے لیکن اگر صلح اور جنگ کے لیے تُم لوگوں کے اصول یہی ہیں تو یاد رکھو کہ تمہارے راجہ کے دِن گنے جاچکے ہیں۔“

پرتاپ رائے نے اچانک سپاہی کے ہاتھ سے کوڑا چھین کر زبیر کے منہ پر

دے مارا اور دوسری ضرب کے لیے تیّار تھا کہ جے رام نے آگے بڑھ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پرتاپ رائے نے ہاتھ چھُڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”تم راجہ کی توہین برداشت کرسکتے ہو، میں نہیں کرسکتا۔“

جے رام نے کہا۔ ”میں تم سے آخری بار پوچھتا ہوں کہ میری بہن اور اِس عرب لڑکی کو تُم نے کہاں چھپایا ہے؟“

اِس سوال نے پرتاپ رائے کا غصّہ ٹھنڈا کر دیا اور تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولا: ”کیا یہ مُمکن نہیں کہ ہمارے حملے کے وقت اُسے انتقامی جذبے کے ماتحت جہاز سے نیچے پھینک دیا گیا ہو۔“

جے رام نے جواب دیا۔ ”یہ لوگ دُشمنی میں شرافت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ میری بہن کے ساتھ عرب لڑکی کا غائب ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اِس سازش کی تہہ میں کسی تمہارے جیسے کمینے آدمی کا دماغ کام کر رہا ہے۔“

زبیر نے پھر جے رام سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”تُم اِن باتوں سے مُجھے بے

وقوف نہیں بنا سکتے۔ ناہید، خالد اور تمہاری بہن بیک وقت جہاز سے غائب ہوئے ہیں اور وہ یقیناً تمہاری قید میں ہیں۔ مجھے تُم سے کسی نیکی کی توقّع نہیں لیکن ہم اتنا ضرور چاہتے ہیں کہ ہمیں سندھ کے راجہ کے سامنے پیش کیا جائے اور جب تک وہ ہمارا فیصلہ نہیں کرتا، ناہید اور خالد کو ہمارے ساتھ رکھا جائے۔" پرتاپ رائے نے چونک کر کہا۔ "میں اب سمجھا جے رام اگر اِن لڑکیوں کے ساتھ زبیر سے کوئی آدمی بھی غائب ہوا ہے تو یہ معاملہ صاف ہے، کل رات بندرگاہ سے ایک سرکاری کشتی بھی غائب ہو گئی ہے لیکن وہ زیادہ دور نہیں جاسکتے۔ تُم میرے ساتھ آؤ!"

پرتاپ رائے اور جے رام قید خانے سے باہر نکل کر گھوڑوں پر سوار ہوئے اور اُنہیں سرپٹ دوڑاتے ہوئے بندرگاہ پر پہنچے۔ بندرگاہ کے پہرے داروں نے شام کے وقت کشتی غائب ہو جانے کے متعلّق پرتاپ رائے کے بیان کی تصدیق کی، اور مایا کے متعلّق جے رام کی تشویش بڑھنے لگی۔ پرتاپ رائے نے چند کشتیاں اور جہاز شمال اور مغرب کے ساحل کے ساتھ ساتھ دیکھ بھال کے لیے روانہ کر دیے اور جے رام کو تسلّی دی

کہ وہ زیادہ دور نہیں جاسکتے۔ جے رام پرتاپ رائے کے ساتھ واپس شہر چلا آیا۔

سہ پہر تک اپنے مکان میں مایا کے متعلّق کوئی خبر نہ پا کر اُس نے بندرگاہ پر جانے کا ارادہ کیا لیکن پرتاپ رائے کا سپاہی آیا اور اُسے اپنے ساتھ اُس کے محل کی طرف لے گیا۔

(۲)

پرتاپ رائے کے محل کے پائیں باغ میں زبیر اور علی ناریل کے دو درختوں کے ساتھ جکڑے ہوئے تھے۔ پرتاپ رائے، اُس کے چند سپاہی اور دو جلّاد ہاتھ میں کوڑے لیے اُن کے پاس کھڑے تھے۔ علی اور زبیر کی جھُکی ہوئی گردنیں اور عریاں سینوں پر ضربوں کے نشانات یہ ظاہر کر رہے تھے کہ انہیں ناقابلِ برداشت جسمانی اذیت پہنچائی جا چکی ہے۔ ایک سپاہی نے جے رام کی آمد کی اطلاع دی، اور پرتاپ رائے کا اشارہ پا کر جلّاد زبیر اور علی پر کوڑے برسانے لگے۔ زبیر ایک چٹّان کی طرح کھڑا تھا لیکن علی کی قوّتِ برداشت جواب دے چکی تھی اور کوڑے کی ضرب

کے ساتھ اُس کے منہ سے چیخیں نکل رہی تھیں۔

باہر کے دروازے میں پاؤں رکھتے ہی علی کی چیخ وپکار نے جے رام کو متوجّہ کیا اور اُس نے بھاگ کر دونوں جلّادوں کو یکے بعد دیگرے پیچھے دھکیل دیا اور پرتاپ رائے کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ ”یہ ظلم ہے۔ یہ پاپ ہے۔ آپ نے مُجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ نے اِن کا فیصلہ راجہ پر چھوڑ دیا ہے۔“

پرتاپ رائے نے علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”یہ لڑکا سپاہیوں نے شہر سے تلاش کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمہاری بہن کے ساتھ ہی جہاز پر سے روپوش ہوا تھا، اور اِس کے باقی ساتھی شہر کے آس پاس کہیں چھُپے۔ ہوتے ہیں۔“

جے رام نے آگے بڑھ کر علی سے پوچھا۔ ”تم کہاں تھے؟ میری بہن کہاں ہے؟“

علی نے سراپا التجا بن کر اُس کی طرف دیکھا، اور پھر گردن جھکالی۔

جے رام نے کہا۔ ”اگر تمہیں مایا دیوی کے متعلّق کُچھ معلوم ہے تو بتا دو۔ میں تمہیں بچا سکتا ہوں۔“

علی نے دوبارہ گردن اُٹھائی اور چلّا چلّا کر کہنا شروع کیا۔ ”مُجھے معلوم نہیں۔ میں سچ کہتا ہوں۔ مُجھے اُن کے متعلّق معلوم نہیں۔ میں نے جہاز پر سے کودتے سے پہلے اُنہیں تلاش کیا تھا لیکن مُجھے معلوم نہیں کہ وہ کیسے غائب ہوئے۔“

جے رام نے پوچھا۔ ”تم شہر میں کیسے پہنچے؟“

میں جہاز سے کود کر سمندر کے کنارے ایک کشتی میں چھُپ گیا تھا۔ آج میں شہر پہنچا اور سپاہی مُجھے پکڑ کر یہاں لے آئے۔ تُم سب ظالم ہو۔ میں نے تمہارا کوئی قصور نہیں کیا۔“

جے رام نے زبیر کی طرف دیکھا لیکن حیرانی، غصّہ، ندامت اور افسوس کے جذبات کے ہیجان میں وہ اُس سے مخاطب ہونے کے لیے موزوں الفاظ تلاش نہ کر سکا۔ اُس کی آنکھیں ایک بار اُٹھیں اور جھک گئیں۔

ہونٹ کپکپائے اور ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے۔ اُس نے پرتاپ کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ ”آپ انہیں چھوڑ دیں۔ مُجھے اِن پر کوئی شُبہ نہیں۔“

پرتاپ رائے نے کہا۔ ”میں اُنہیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ اگر تمہاری بہن جہاز پر تھی تو اِن کو یہ علم ہو گا کہ وہ کہاں ہے۔ تم شاید اب تک مُجھے مجرم خیال کرتے ہو اور میں اِن لوگوں کی زبان سے تمہیں یقین دِلانا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ تمہاری بہن کو اِن لوگوں نے چھُپا رکھا ہے اور اگر وہ زندہ نہیں تو اُنہوں نے جہاز پر حملہ ہونے سے پہلے اُسے سمندر میں پھینک دیا ہو گا۔ اب یا اِنہیں اپنے جُرم کا اقبال کرنا پڑے گا اور یا تُم کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ تمہاری بہن جہاز پر تھی ہی نہیں اور تُم نے مُجھے مرعوب کرنے کے لیے یہ بہانہ تلاش کیا تھا۔“

پرتاپ رائے نے پھر جلّادوں کو اشارہ کیا اور وہ زبیر اور علی بر پھر کوڑے برسانے لگے۔ جے رام چلّایا۔ ”ٹھہرو! ٹھہرو! یہ بے قصور ہیں۔ یہ ظُلم ہے۔ انہیں چھوڑ دو۔“ لیکن اُس کی چیخ و پکار بے اثر ثابت ہوئی۔ اُس نے

آگے بڑھ کر ایک جلّاد کے مُنہ پر گھونسا رسید کیا، لیکن پرتاپ رائے کے اشارے سے چند سپاہیوں نے اُسے پکڑ کر پیچھے ہٹا دیا۔ وہ سپاہیوں کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا۔ علی چیخیں مارنے کی بجائے نیم بے ہوشی کی حالت میں آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ زبیر ہر کوڑے کی ضرب کے بعد جے رام کی طرف دیکھتا اور آنکھیں بند کر لیتا۔ بالآخر علی کے کراہنے کی آواز بند ہو گئی اور گردن اُٹھانے اور آنکھیں کھولنے کے لیے زبیر کی طاقت بھی جواب دے گئی۔۔

پرتاپ رائے نے ایک سپاہی کو گرم لوہا لانے کا حکم دیا۔ جے نام پھر چلّایا۔ ”پرتاپ تُم ظالم ہو، کمینے ہو۔ مُجھے جو سزا چاہو دے لو لیکن اِن پر رحم کرو۔“

پرتاپ رائے نے گرج کر کہا۔ ”مُجھے تمہاری بد زبانی کی پروا نہیں۔ میں تمہارا فیصلہ مہاراج پر چھوڑوں گا لیکن اِس وقت اِن کی جان میرے قبضے میں ہے۔ میں اِن کی آنکھیں نکلوا دوں گا۔ اِن کی بوٹیاں نوچ ڈالوں گا۔ یہ نامُمکن ہے کہ یہ زندہ بھی رہیں اور تم مہاراج کے پاس جا کر اپنی بہن کے

اغوا کیے جانے کی ذمّہ داری بھی مُجھ پر ڈالو۔ اگر تمہاری بہن جہاز پر سے غائب ہوئی ہے تو میں ضرور اِس کا پتہ لگاؤں گا۔ اِس کے لیے اگر مُجھے اِن تمام بچّوں اور عورتوں کے ساتھ یہی سلوک کرنا پڑا تو بھی دریغ نہیں کروں گا۔"

سپاہی نے لوہے کی سلاخ پرتاپ رائے کے ہاتھ میں دے دی اور وہ زبیر کی طرف بڑھا۔ جے رام نے بُلند آواز میں کہا۔ "نہیں نہیں! ٹھہرو! میری بہن جہاز پر نہ تھی۔ میں اکیلا آیا تھا۔ میں فقط اِن کی جان بچانا چاہتا تھا۔"

پرتاپ رائے نے جواب دیا۔ "لیکن مُجھے کیوں کر یقین آئے کہ تُم راجہ کے سامنے ایسی کہانیاں بیان کر کے اُسے میرے خلاف نہیں بھڑکاؤ گے۔"

"پرتاپ میں وعدہ کرتا ہوں۔ ایک راجپوت کا وعدہ۔ مُجھ پر اعتبار کرو۔"

"تمہیں یہ گواہی بھی دینی پڑے گی کہ جہاز پر سے کوئی بھی لڑکی غائب نہیں ہوئی۔"

"اگر تم انہیں چھوڑ دو تو میں یہ وعدہ کرنے کے لیے بھی تیّار ہوں۔"

"انہیں چھوڑنا نہ چھوڑنا راجہ کا کام ہے۔ میں صرف یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ اِن کے ساتھ آئندہ کوئی سختی نہیں کی جائے گی۔ تمہیں راجہ کے سامنے بھی ماننا پڑے گا کہ تُم نے اِن لوگوں کو چھُڑانے کی نیّت سے مجھ پر دباؤ ڈالا اور اپنی بہن کو ایک بہانا بنایا تھا۔"

جے رام نے شکست خوردہ سا ہو کر جواب دیا۔ "میں اِس کے لیے بھی تیّار ہوں۔"

پرتاپ رائے نے لوہے کی سلاخ پھینکتے ہوئے کہا۔ "تُم نے مجُھے خواہ مخواہ پریشان کیا۔"

(۳)

زبیر نے ہوش میں آکر آنکھیں کھولیں وہ علی کے قریب قید خانے میں پڑا ہوا تھا۔ جے رام ٹھنڈے پانی کی بالٹی سے رومال بھگو بھگو کر اس کے زخموں پر رکھ رہا تھا۔ ایک عورت علی کو ہوش میں لانے کی کوشش کر

رہی تھی۔ زبیر ہوش میں آتے ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جسے رام نے پانی کا کٹورا بھر کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ زبیر کے دِل میں ایک لمحہ کے لیے پھر ایک بار غصّہ اور حقارت کے جذبات بیدار ہوئے لیکن جے رام کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس نے پانی کے چند گھونٹ پی لیے۔ جے رام نے فقط اتنا کہا۔ ''زبیر! مُجھے افسوس ہے۔'' اور اس کی خوبصورت آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ زبیر نے اپنے چہرے پر ایک مغموم مُسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ ''جے رام! تم میرے لیے ایک معمّا ہو۔ تم نے دیبل کے حاکم سے ساز باز کر کے ہمیں اِس حالت تک پہنچایا۔ اِس کے بعد تم میرے لیے جلّادوں سے نبرد آزما ہوئے۔ اب تم آنسو بھی بہا رہے ہو آخر ان سب باتوں کا مطلب کیا ہے؟''

جے رام کے ہونٹوں سے درد کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی۔ ''زبیر مُجھے پر اعتبار کرو۔ میں تمہارا دوست ہوں۔ تم نے میری جان بچائی تھی اور ایک راجپوت احسان فراموش نہیں ہو سکتا۔ دیبل کے سردار نے میرے ساتھ دھوکا کیا۔ تمہارے جہازوں پر حملہ کرنے سے پہلے مُجھے

ایک کوٹھری میں بند کر دیا۔ تُم مُجھ سے بد ظن ہو۔ مُجھے دغا باز سمجھتے ہو لیکن میں بے قصور ہوں۔ اگر بھگوان نے موقع دیا تو میں یہ ثابت کر سکوں گا۔"

زبیر نے کہا۔ "اگر تُم اِس سازش میں شریک نہیں تو میں پوچھتا ہوں کہ ناہید اور خالد کہاں ہیں؟"

جے رام نے جواب دیا۔ "اگر تم مایا کے متعلّق کُچھ نہیں جانتے تو میں خالد اور ناہید کے متعلّق کیا بتا سکتا ہوں۔ میں تُم سے کہہ چکا ہوں کہ میں ساری رات کوٹھری میں بند رہا۔ تم جہاز پر تھے۔ بندر گاہ سے ایک کشتی بھی اُس رات غائب ہو چکی ہے۔ اگر تُم نے لڑائی سے پہلے انہیں کہیں بھیج دیا ہے، تو بھگوان کے لیے مُجھ سے نہ چُھپاؤ۔ مُجھے یقین ہے کہ تُم نے اُنہیں پرتاپ رائے کے ظالم ہاتھوں سے بچانے کی نیّت سے کہیں بھیجا ہو گا۔ مُجھے صرف اتنا بتا دو کہ مایا زندہ ہے اور کسی محفوظ جگہ پر ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تُم پر کوئی آنچ نہ آنے دوں گا۔ میں پرتاپ رائے کو یقین دِلا چُکا ہوں کہ میری بہن میرے ساتھ نہ تھی۔ ورنہ وہ آج تمہیں زندہ نہ چھوڑتا۔"

زبیر نے جواب دیا۔ ”کاش میں تُم پر اعتبار کر سکتا۔ تُم دونوں ناہید کو چھُپا کر مایا کی ذمّہ داری ہمارے سر اِس لیے تھوپ رہے ہو کہ ہم راجہ سے ناہید اور خالد کے متعلّق سوال کر سکیں۔“

جے رام نے کہا۔ ”زبیر مُجھ پر اعتبار کرو۔ مجُھے تم سے جھوٹ بولنے میں کوئی فائدہ نہیں۔ اگر تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو مایا اور ناہید سے متعلّق کوئی علم نہیں تو یہ پرتاپ رائے کی شرارت ہے۔ آج وہ میرے سامنے تُم دونوں کو اِس لیے سزا دے رہا تھا کہ میں آئندہ مایا اور ناہید کا نام نہ لوں۔ میں یہ وعدہ کرتا ہوں اور تم نہیں جانتے کہ ایک راجپوت بھائی کے لیے اپنی بہن کے متعلّق اِس قسم کا وعدہ کرنا کس قدر صبر آزما ہے۔“

زبیر نے جواب دیا۔ ”تمہاری مہربانی کا شکریہ۔ اِس وقت ہم پر تمہاری تلواروں کا پہرہ ہے۔ ہمارے لیے تمہارے جھوٹ اور سچ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں سچ بولنے کا انعام دے سکتا ہوں نہ جھوٹ بولنے کی سزا۔ صرف یہ جانتا ہوں کہ ہم تمہاری وجہ سے اِس مُصیبت میں گرفتار ہوئے اور جب تک میں ناہید کو نہیں دیکھتا، مُجھے نہ تُم پر اعتبار آسکتا ہے اور نہ

دیبل کے حاکم پر۔ اگر مُستقبل کے حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ تُم اِس معاملے میں بے قصور تھے تو میں تُم سے اِس بد گمانی کے لیے معذرت کر لوں گا۔ اگر دیبل کا حاکم قصور وار ہے تو تمہاری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ہماری آواز راجہ کے کانوں تک پہنچ جائے۔ میں تمہیں یقین دِلاتا ہوں کہ مُجھے اور میرے ساتھیوں کو خالد، ناہید اور تمہاری بہن کے متعلّق کوئی علم نہیں۔ دوسرے جہاز سے سراندیپ کے ملّاحوں نے ہمارے جہاز کے چند آدمیوں کو ایک کشتی پر سوار ہوتے دیکھا تھا۔ وہ کشتی جنوب کی طرف غائب ہو گئی تھی۔ اگر انہیں اِس کشتی پر اغوا کیا گیا ہے تو معاملہ صاف ہے۔ کشتی ہمارے جہازوں سے نہیں بلکہ بندر گاہ سے غائب ہوئی ہے اور اِس بات کا علم بندر گاہ والوں کو ہونا چاہیے کہ وہاں سے کشتی کون لایا۔"

جے رام نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "پرتاپ! کمینہ! مکّار! ظالم! بزدل! زبیر بھگوان کے لیے میری خطا معاف کر دو۔ میں نے تُم پر شک کیا۔ میں نادم ہوں۔"

زبیر کو اِن الفاظ سے زیادہ جے رام کی پُر نم آنکھوں نے متاثر کیا اور اُس

نے جے رام کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”جے رام! تُم جاؤ! اُنہیں تلاش کرو۔ پرتاپ رائے ظالم بھی ہے اور مکّار بھی۔ اُسے اپنے دِل کا حال نہ بتانا۔ ورنہ تم اپنی بہن کو تلاش نہ کر سکو گے اور نہ راجہ ہی کے کانوں تک یہ خبر پہنچ سکے گی۔“

جے رام اُٹھ کر قید خانے کی کوٹھری سے باہر نکل آیا۔ پہرے داروں نے دروازہ بند کر دیا۔ چند قدم دور جانے کے بعد جے رام نے واپس آ کر ایک پہرہ دار کو سراندیپ کے ملّاحوں کی کوٹھری کا دروازہ کھولنے کے لیے حکم دیا۔

اُن لوگوں سے چند سوالات پوچھنے کے بعد جب وہ باہر نکلا تو اُس کے دِل پر ایک بھاری بوجھ تھا۔ سراندیپ کے ملّاح زبیر کے بیان کی حرف بہ حرف تصدیق کر چکے تھے اور اُسے افسوس تھا کہ اُسے زبیر کی باتوں پر شک کیوں گزرا۔

مایا کی پریشانی

تین ہفتوں کے بعد ناہید ایک اُجڑے ہوئے قلعے کے ایک کمرے میں بستر پر لیٹی تھی۔ برہمن آباد سے بیس کوس کے فاصلے پر ایک گھنے جنگل میں یہ قلعہ کسی زمانے میں گنگو اور اُس کے ساتھیوں کی قیام گاہ تھی۔ چند دِنوں سے گنگو اور اُس کے ساتھی پھر اِن پُرانے کھنڈروں کو آباد کر چکے تھے۔

ناہید کے زخم اور بخار سے گنگو کو سخت تشویش تھی اور یہی وجہ تھی کہ اس نے ناہید کے شفایاب ہونے تک ایسی جگہ کو اپنی قیام گاہ بنایا تھا، جو گردو پیش کے خطرات سے محفوظ تھی۔ گنگو لوٹ مار کی قسم کھا چکا تھا۔ اُسے

ایک خاص مقصد کے لیے اپنے ساتھیوں کے لیے گھوڑوں اور دوسرے ساز و سامان کی ضرورت تھی۔ جہاز غرق ہو جانے کے بعد اُس کے پاس صرف چار بیش قیمت ہیرے رہ گئے تھے جنہیں وہ ہر وقت اپنے پاس رکھتا تھا۔ وہ ایک گجراتی تاجر کا بھیس بدل کر برہمن آباد پہنچا۔ وہاں پر صرف دو ہیرے بیچنے سے اُسے اِس قدر رقم مل گئی جو اُس کے تمام ساتھیوں کو گھوڑے تلواریں اور کھانے پینے کا سامان مہیّا کرنے کے لیے کافی ثابت ہوئی۔

گنگو جو دیبل کے آس پاس اگر کوئی اس قسم کی جائے پناہ مل جاتی تو وہ یقیناً اُسے اپنی سرگرمیوں کا مرکز بناتا لیکن وہاں کوئی موزوں جگہ نہ ہونے کے علاوہ گنگو کو بھی یقین تھا کہ قیدیوں کو برہمن آباد یا اَروَر میں راجہ کے سامنے ضرور پیش کیا جائے گا۔ چند دِنوں سے گنگو کے ساتھی دیبل اور برہمن آباد کے درمیان تمام راستوں پر پہرہ دے رہے تھے۔ گنگو کی نیّت کے متعلّق خالد کے تمام شکوک رفع ہو چکے تھے۔ مایا دیوی بھی دِن رات ناہید کی تیمار داری کر کے گنگو کو کسی حد تک اپنی نیک نیّتی کا ثبوت

دے چکی تھی۔ ناہید کے شُبہات دُور کر چکی تھی لیکن خالد پر اُس کی کسی بات کا اثر نہ ہوا۔ اس کے لیے گویا وہ تھی ہی نہیں۔ وہ تیمارداری کے لیے ناہید کے پاس بیٹھتا۔ وہ اُس کے سامنے ناہید کے زخم کی مرہم پٹّی کرتی۔ اُسے دوائی کھلاتی، اُس کا سر دباتی اور خالد کو اپنی طرف متوجّہ کرنے کے لیے اپنے ارادوں کے خلاف کئی بار یہ الفاظ دُہراتی۔ آپ کی بہن کی طبعیت اب ٹھیک ہے۔ زخم جلد ہی اچھّا ہو جائے گا۔۔۔۔۔ بہن ناہید اب تندرست ہے، آپ پریشان نہ ہوں۔۔۔۔ خدا آپ کی مدد کرے گا لیکن خالد کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ یہ محسوس کرتی کہ خالد کی آنکھیں اور کان اُس کے لیے بند ہو چکے ہیں۔ دریائے سندھ کے دہانے سے اِس مقام تک کشتی کے طویل سفر میں بھی یہی حالت تھی۔ دریا میں وہی پانی تھا جسے وہ سمندر میں دیکھ چکی تھی۔ ہر صبح وہی سورج نمودار ہوتا اور شام کے وقت انہی چاند اور ستاروں کی محفل سجتی تھی لیکن خالد کے طرزِ عمل میں تبدیلی کے بعد اُس کے لیے کائنات کی تمام رنگینیاں پھیکی پڑ چکی تھیں۔ اگر خالد اس کی مُسکراہٹ کا جواب مُسکراہٹ سے دے سکتا۔ اگر وہ فقط ایک بار پوچھ لیتا کہ مایا تم کیسی ہو۔ اگر اُس کے ہاتھ مایا کی

آنکھوں سے بے بسی کے آنسو پونچھنے کے لیے معمولی سی آمادگی ظاہر کرتے تو بھائی کی جدائی کے احساس کے باوجود وہ اِس بات پر خوش ہوتی کہ قدرت نے دیبل سے اُن کے راستے جُدا نہیں کیے۔ وہ جہاز پر سفر کے دوران میں اکثر یہ سوچا کرتی تھی کہ کاش خالد کے ساتھ اُس کا سفر ختم نہ ہو۔ کاش کوئی طوفان جہاز کا رُخ بدل دے اور وہ خالد کے ساتھ کسی ایسے جزیرے میں پہنچ جائے جہاں صاف اور شفاف پانی کی ندیاں بہتی ہوں۔ آبشاریں محبّت کے گیت گاتی ہوں۔ سدا بہار درخت لہلہاتے ہوں۔ گہری جھیل میں کنول کھلتے ہوں۔ دیبل کی بندرگاہ کی پہلی جھلک دیکھنے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے اُس کے سپنوں کی رنگین دُنیا درہم برہم ہوئی لیکن قُدرت نے جب اُنہیں جہاز کی بجائے ایک کشتی پر سوار کر دیا تو مایا دیوی پھر سپنوں کی ایک نئی دُنیا آباد کرنے لگی۔ لیکن دیبل کے حادثے نے ایک جیتے جاگتے نوجوان کو ایک پتھّر کا مجسّمہ بنا دیا تھا۔ محبّت اور وفا کی دیوی کی ملتجی اور متمنّی نگاہوں کے جواب میں خالد کی آنکھوں میں نفرت اور حقارت کے سوا کُچھ نہ تھا۔

اُن لوگوں میں صرف ناہید ایسی تھی جسے یقین تھا کہ دیبل کے حادثے سے مایا دیوی کا کوئی تعلّق نہیں۔ وہ ایک عورت کی ذکاوتِ حس سے مایا کی ذہنی کشمکش کا اندازہ کر چکی تھی۔ اُسے جب بھی موقع ملتا، وہ خالد کے سامنے مایا کی پاکیزگی، اُس کی معصومیت اور اُس کی حیا کا ذکر چھیڑ دیتی۔ خالد گفتگو کا موضوع بدلنے کی کوشش کرتا تو وہ کہتی۔ ”خالد! تمہارا دِل بہت سخت ہے۔ تُم دیکھتے نہیں اِس کا سرخ و سفید چہرہ دوپہر کے پھول کی طرح مُرجھا گیا ہے۔ اِس کا بھائی بُرا سہی لیکن میرا دِل گواہی دیتا ہے کہ وہ معصوم ہے۔ وہ تمہیں اپنی آخری پناہ خیال کرتی ہے۔ تم اُسے تسلّی دے سکتے ہو۔ وہ اب یہاں تک کہہ چکی ہے کہ اگر اُس کا بھائی واقعی اِس سازش میں شریک تھا تو وہ اُس کے پاس جانے سے مرنا بہتر سمجھتی ہے۔“

اور وہ جواب دیتا۔ ”میں دوپہر کے وقت چراغ کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ میں جو کُچھ دیکھ چکا ہوں اِس کے بعد اُس لڑکی کے متعلّق اپنی رائے بدلنا میرے بس کی بات نہیں۔“

(۲)

چند دِن اِس قلعے میں رہنے کے بعد ناہید چلنے پھِرنے کے قابل ہو گئی لیکن تیر کا زخم ابھی تک مندمل نہیں ہوا تھا۔ خالد کبھی کبھی سواروں کی کسی ٹولی کے ساتھ گشت کے لیے چلا جاتا۔

ایک شام مختلف اطراف سے سپاہیوں کی تمام ٹولیاں واپس آ گئیں لیکن خالد اور اُس کے چار ساتھی واپس نہ آئے۔ ناہید نمازِ مغرب کے بعد اپنے بھائی کی خیریت کے لیے دُعا کر رہی تھی۔ گنگو اپنے چند ساتھیوں کو خالد کی تلاش میں روانہ کر کے ایک اُونچے درخت پر چڑھ کر اُس کی راہ دیکھ رہا تھا۔ مایا قلعے سے باہر نکل کر گھنے درختوں میں سے اِدھر اُدھر جھانک رہی تھی۔ اچانک اُسے دور سے گھوڑوں کی ٹاپ سُنائی دی۔ اُس کا دِل دھڑکنے لگا اور وہ تیزی سے قدم اُٹھاتی ہوئی آگے بڑھی۔ اُس کا دامن ایک جھاڑی کے کانٹوں سے اُلجھ گیا۔ وہ کانٹوں کو الگ کر رہی تھی کہ جھاڑیوں کے عقب سے خالد اور دوسرے سوار نمودار ہوئے۔ خالد نے گھوڑا روکتے ہوئے پوچھا۔ ”میری بہن کیسی ہے؟“

کانوں کے راستے یہ الفاظ مایا کے دِل میں اُتر گئے۔ وہ خالد کی طرف دیکھنے لگی۔ خار دار جھاڑی کی چند شاخیں جو اُس نے بڑی مُشکل سے اپنے دامن سے جُدا کی تھیں اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پھر اُس کے دامن میں اُلجھ گئیں۔

خالد نے پھر کہا۔ ”بتاؤ میری بہن ٹھیک ہے نا؟“

مایا نے چونک کر جواب دیا۔ ”وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ نے بہت دیر لگائی۔“

”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“

”میں۔۔۔ کچھ نہیں!“ یہ کہہ کر مایا پھر اپنے دامن کو کانٹوں سے چھُڑانے لگی۔ لیکن اُس کی نگاہیں خالد پر گڑی ہوئی تھیں۔ خالد گھوڑے سے اُترا اور اُس کے ساتھی دزدیدہ نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور مُسکراتے ہوئے آگے نکل گئے۔ خالد شاخوں کو ایک ایک کر کے اُس کے دامن سے الگ کرنے لگا۔ مایا کا تنفّس تیز ہو رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں

تشکّر کے آنسو اُمڈنے لگے۔ اُس نے اپنا کانپتا ہاتھ خالد کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔

خالد نے ایک شاخ اُس کے دامن سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ ”اِسے پکڑو۔“

اُس نے جلدی سے شاخ کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن ایک تیز کانٹا اُس کی انگلی میں پیوست ہو گیا اور شاخ اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پھر اُس کے دامن میں اُلجھ گئی۔ مایا کانٹے کی تکلیف کے باوجود مُسکرائی۔ تشکّر کے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی مُسکراہٹ نے اُس کا چہرہ شبنم آلود پھول سے کہیں زیادہ دِلفریب بنا دیا۔ خالد نے اُس کی طرف دیکھا اور آنکھیں جھکاتے ہوئے کہا۔ ”لاؤ میں نکال دوں۔“

مایا نے کُچھ کے بغیر اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ خالد کانٹا نکال کر جھاڑی کی طرف متوجّہ ہوا۔ اُس نے پوچھا۔ ”تُم یہاں کیوں آئیں؟“

مایا نے جواب دیا۔ ”قلعے میں گرمی تھی اور میں ذرا ہوا خوری کے لیے نکل آئی تھی۔“ لیکن اُس کا دِل کہہ رہا تھا۔ کیا سچ مُچ تم میرے یہاں آنے کی

وجہ نہیں سمجھ سکے۔ کاش میں تمام عمر کانٹوں میں اُلجھی رہوں اور تُم نکالتے رہو۔

خالد نے جواب دیا۔ ”لیکن اِس وقت درختوں کے نیچے تو زیادہ حبس ہے؟“

مایا نے پریشان سی ہو کر خالد کی طرف دیکھا لیکن کُچھ سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ”میں دریا کی طرف جا رہی تھی۔“

”دریا دوسری طرف ہے۔“

”میں بھی اُسی طرف جا رہی تھی لیکن۔۔۔“

”لیکن کیا؟“

”گھوڑوں کی ٹاپ سُن کر اِس طرف لوٹ آئی۔ آج آپ نے بہت دیر کی میں۔۔۔ بہت پریشان تھی۔“

”میں تمہاری پریشانی کی وجہ نہیں سمجھ سکا۔ اگر میں زبیر اور اپنے

دوسرے ساتھیوں کی طرح قید میں ہوتا تو تمہیں بہت اطمینان ہوتا لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں اب بھی قید میں ہوں۔ میں تمہارے بھائی کی طرح اپنی بہن کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

مایا کے دِل پر ایک چرکا لگا۔ وہ دیر تک بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ اُس نے خلافِ معمول خالد کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھا اور اُس کی چمکتی ہوئی پُتلیوں پر پھر ایک بار پانی کے دُھندلے نقاب چھا گئے۔ یہ نقاب اُبھر کر چھلکتے ہوئے آنسوؤں میں تبدیل ہو گئے۔ پلکیں اُنہیں زیادہ سہارا نہ دے سکیں۔ دو چمکتے ہوتے موتی رُخساروں پر ہلکی ہلکی لکیریں چھوڑتے ہوئے ہونٹوں پر آرُکے۔ مایا نے اپنا چہرہ دوپٹے میں چھپا لیا۔

"چلو اب دیر ہو رہی ہے۔" خالد کی آواز سُن کر مایا نے چونک کر چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔ اُس کا دامن کانٹوں سے الگ ہو چکا تھا اور خالد گھوڑے کی باگ پکڑ کر جانے کے لیے تیّار کھڑا تھا۔ وہ بولی:

"آپ جایئے! میں خود آ جاؤں گی۔ لیکن میں آپ سے آخری بار صرف ایک بات کہنا چاہتی ہوں کہ میں بے قصور ہوں۔ اگر میرا بھائی اس

سازش میں شریک تھا تو بھی یہ انصاف نہیں کہ اُس کے باپ کی سزا مجھے ملے۔“

خالد نے جواب دیا۔ ”میں تمہیں سزا نہیں دینا چاہتا۔ تمہیں بہت جلد تمہارے بھائی کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔ تمہارا بھائی بھی تم سے دُور نہیں۔ وہ یہاں سے چار کوس دور دریا کے کنارے ایک ٹیلے پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ وہ راجہ سے انعام حاصل کرنے کے لیے قیدیوں کو برہمن آباد لے جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ دیبل کا حاکم بھی ہے۔ کل تک وہ برہمن آباد پہنچ جائیں گے۔ شاید آج رات ہی تمہارے بھائی کے پاس ہمارا پیغام پہنچ جائے اور اگر اُس نے قیدیوں کو چھوڑنا منظور کر لیا، تو تمہیں اُس کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔ میں شروع سے اِس بات کا حامی نہ تھا کہ تمہیں یہاں رکھا جائے۔ ہمارا اخلاق ہمیں یہ اجازت نہیں دیتا کہ ہم ایک بے بس عورت پر ہاتھ اُٹھائیں۔ تم اطمینان رکھو۔“

”آپ کو کس نے بتایا کہ میرا بھائی قیدیوں کو لے جا رہا ہے۔ کیا یہ مُمکن نہیں کہ پرتاپ کے ساتھ وہ بھی ایک قیدی کی حیثیت میں جا رہا ہو۔“

"میں آج خود اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ وہ ایک مُشکی گھوڑے پر سوار تھا اور قیدی بیل گاڑیوں پر بھی پابہ زنجیر تھے۔ چلو اب دیر ہو رہی ہے۔ گنگو میرا انتظار کر رہا ہو گا۔"

"آپ جائیں! میں ابھی آتی ہوں۔"

(۳)

خالد گھوڑے کی باگ پکڑ کر پیدل چلتا ہوا قلعے کے دروازے تک پہنچا۔ گنگو باہر اُس کے انتظار میں کھڑا تھا۔

اُس نے مُسکراتے ہوئے پوچھا۔ "خالد! مایا کو کہاں چھوڑ آئے؟"

خالد نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "وہ آ رہی ہے۔"

"رات ہو رہی ہے۔ تُم اُسے ساتھ کیوں نہ لے آئے؟"

"آپ لے آئیں، وہ کہتی تھی تُم جاؤ۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

گنگو نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ عورت بھی عجیب مخلوق ہے۔ وہ چھپ

چھپ کر تمہاری راہ دیکھ سکتی ہے۔ تمہارے لیے کانٹوں میں اُلجھ سکتی ہے لیکن تُم ذرا اُس کی طرف مائل ہوئے اور وہ وحشی ہرنی کی طرح کترا کر بھاگی۔"

خالد نے جواب دیا۔ "میرے دِل میں شاعری کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اب آپ بتائیں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ آپ دیبل کے قافلے کی خبر سُن چُکے ہوں گے۔"

"ہاں میں سُن چکا ہوں۔ اُن کے ساتھ دو سو مسلح سپاہی ہیں۔ ہم مُٹھّی بھر آدمیوں کے ساتھ اُن پر حملہ نہیں کر سکتے۔ میں جے رام کو یہاں لانے کی تجویز سوچ چکا ہوں۔"

"دیکھا اِس لڑکی کی باتوں میں آ کر ناہید جے رام کے متعلّق اپنے خیالات بدل چُکی تھی اور آپ بھی متاثر ہو رہے تھے۔"

گنگو نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "بیٹا! تُم مُجھ سے زیادہ متاثر تھے۔ بہر حال مُجھے اب یقین ہو چکا ہے کہ مایا معصوم ہے۔"

"اور اِس کے باوجود آپ جے رام کو مایا کے قتل کی دھمکی دینا چاہتے ہیں۔"

"تمہارے ساتھیوں کو آزاد کرانے کی اِس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں۔"

"لیکن اگر جے رام نے اپنے راجہ کی خوشی پر اپنی بہن کو قربان کر دیا تو؟"

"مجھے ایسی اُمّید نہیں لیکن اگر جے رام اِس قدر ذلیل ثابت ہوا تو مایا جیسی لڑکی کو ایسے ظالم بھائی کے ہاتھوں سے بچانا ہمارا فرض ہے۔ وہ خود بھی جے رام کی بجائے تمہاری پناہ کو ترجیح دے گی۔ چند دِنوں تک تمہاری بہن سفر کے قابل ہو جائے گی اور ہم تمہیں مکران کی حدود کے اندر پہنچا دیں گے۔"

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے ساتھیوں کو مصیبت میں چھوڑ کر چلے جائیں۔"

"تم وہاں جا کر اُن کی زیادہ مدد کر سکو گے۔ عربوں کے علاوہ سراندیپ

کے ملّاحوں کو بھی قید میں رکھے جانے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ تمہارے جہازوں کے لوٹے جانے کی خبر سندھ سے باہر نکلے۔ اگر یہ خبر ہاں تک پہنچ گئی تو تمہاری قوم اِسے خاموشی سے برداشت نہیں کرے گی لیکن تُم اُس وقت تک نہیں جاسکتے۔ جب تک کہ ناہید تندرست نہیں ہوتی۔ اگر جے رام ہمارے قابو میں آگیا تو یہ مُمکن ہے کہ ہم کم از کم زبیر کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو جائیں۔"

"اگر یہ ہو سکے، تو بہت اچھّا ہو گا۔ میں عرب میں کسی کو نہیں جانتا مُمکن ہے کہ بصرہ اور دمشق میں میری آواز پر کوئی توجّہ نہ دے لیکن زبیر وہاں ہزاروں آدمیوں کو جانتا ہے۔ ہاں! آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آج رات میرے ذمّہ کیا کام ہے؟"

گنگو نے جواب دیا۔ "تُم آرام کرو، لیکن مایا دیوی ابھی تک نہیں آئی۔ شاید وہ دوسرے راستے قلعے میں پہنچ گئی ہو۔"

"میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر خالد بھاگتا ہوا قلعے میں داخل ہوا۔

تھوڑی دیر بعد اُس نے واپس آکر گنگو کو اطلاع دی کہ وہ اندر نہیں پہنچی

گنگو نے کہا۔ ”تُم اُسے کتنی دور چھوڑ آئے تھے؟“

”اُن جھاڑیوں کے پیچھے کوئی سو قدم کے فاصلے پر۔“

”تُم نے اُس کے ساتھ کوئی سخت کلامی تو نہیں کی؟“

”نہیں! لیکن اُسے میری ہر بات پر آنسو بہانے کی عادت ہو چکی ہے۔ ہاں میں ایک غَلَطی کر چکا ہوں۔“

”وہ کیا ہے؟“

”میں نے اُسے بتا دیا تھا کہ اُس کا بھائی یہاں سے چار کوس پر ہے۔“

”رات کے وقت اِس جنگل کو عُبور کرنا ایک عورت کا کام نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے گنگو نے اپنے ساتھیوں کو آواز دے کر بُلایا اور جنگل میں مایا کو تلاش کرنے کا حکم دے کر خالد سے کہا۔ ”میرے خیال میں وہ ابھی تک اُس خار دار جھاڑی سے باتیں کر رہی ہو گی۔ تُم اِس طرف جاؤ۔ میں دریا

کی طرف جاتا ہوں۔ مجھے اس پر شک نہیں لیکن مایوسی کی حالت میں عورت توقّع کے خلاف بھی بہت کُچھ کر گزرتی ہے۔ میں جاتا ہوں۔ کہیں دریا کے کنارے ہماری کشتی اُس کی تباہی کا باعث نہ ہو۔"

(۴)

خالد کے جانے کے بعد مایا کُچھ دیر اُس خار دار جھاڑی کے قریب کھڑی رہی۔ وہ کانٹے جو اُس کے دامن کھینچ کر خالد کے ہاتھوں تک لے گئے تھے، اس کے لیے مہکتے پھولوں سے کم نہ تھے۔ وہ اُن چند لمحات کا تصوّر کر رہی تھی، جب خالد اُس سے اِس قدر قریب تھا۔ اُس کے الفاظ اُس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ وہ یکے بعد دیگرے زہر اور شہد کے گھونٹ اپنے حلق سے اُتار رہی تھی۔ اُس کا دِل خالد کے متعلّق متضاد خیالات کی رزم گاہ تھا۔ وہ کبھی اُسے قہر و غضب کا پیکر مجسّم اور کسی ایثار و محبّت کا دیوتا خیال کرتی۔ تھوڑی دیر وہاں کھڑی رہنے کے بعد وہ اپنے دِل پر ایک نا قابلِ برداشت بوجھ محسوس کرنے لگی اور چاند کی روشنی میں درختوں اور جھاڑیوں سے بچتی ہوئی دریا کی طرف چل دی۔

دریا کے کنارے ایک کشتی کھڑی تھی۔ وہ کشتی جس نے اُنہیں سمندر سے یہاں تک پہنچایا تھا۔ جِس پر سفر کرتے ہوئے اُس نے پہروں آسمان کے ستاروں سے باتیں کی تھیں اُس نے کشتی کے ایک سِرے پر بیٹھ کر نیچے پاؤں لٹکا دیے۔ پانی کی لہریں اُس کے پاؤں کو چھُو رہی تھیں۔ آس پاس جنگل میں گیدڑوں اور بھیڑیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مایا نے اپنے دِل سے سوال کیا۔ "اگر کوئی بھیڑیا اِس طرف آ جائے تو؟" اور پھر خود ہی جواب دیا۔ "اگر بھیڑیا آ جائے تو میں بھاگنے کی کوشش نہ کروں گی۔ میں کشتی سے اُتر کر اُس کے سامنے کھڑی ہو جاؤں گی اور پھر جب وہ صُبح کے وقت میری لاش دیکھے گا تو اُس کی کیا حالت ہو گی؟ وہ کہے گا، مایا! تُم اِدھر کیوں آئیں میں تو تمہارے ساتھ مذاق کرتا تھا۔ میں جانتا تھا، تُم بے قصور ہو۔ مایا مُجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہیں پہچاننے میں غَلَطی کی۔ نہیں! نہیں! وہ شاید یہ نہ کہے۔ وہ کہے گا۔ یہ دیوانی تھی۔ یہ پگلی تھی۔ ہاں میں سچ مُچ پگلی ہوں۔ اُس کے دِل میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں۔ وہ میرا دامن کانٹوں سے چھڑا رہا تھا اور میں سمجھ رہی تھی کہ مُجھے دُنیا کی بادشاہت مل گئی۔۔۔ میں دریا کے کنارے ریت کے گھروندے بنا رہی تھی۔ اُس کا

دل پتھّر کا ہے۔ وہ ظالم ہے۔ اسے کسی پر اعتبار نہیں، اور ہو بھی کیونکر، میرے بھائی نے اِن لوگوں کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا۔ کاش! وہ میرا بھائی نہ ہوتا۔ کاش اُس نے جہاز ہی پر مُجھے بتا دیا ہوتا کہ وہ اُن کے ساتھ یہ دھوکا کرنے والا ہے اور وہ چھپ چھپ کر خالد کو نہ دیکھتی۔ اب وہ مُجھے بھائی کے پاس بھیجنے والے ہیں لیکن اگر اِس کا انجام یہی تھا تو قُدرت نے مُجھے اُس کے جہاز پر کیوں پہنچایا؟ اور پھر جب ہم دیبل سے جُدا ہونے والے تھے، قُدرت ہمیں یہاں کیوں لے آئی؟ میں اب تک اُس کی نفرت کے باوجود اُسے محبّت کی نگاہوں سے کیوں دیکھتی رہی۔ میں نے مایوسی کی آندھیوں میں کھڑی ہو کر اُمّید کے چراغ کیوں جلائے۔۔۔۔ ہاں میں مجبور تھی۔۔۔۔ یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔۔۔۔ میں اب بھی بے بس ہوں۔۔۔۔۔ میرا کوئی نہیں۔۔۔ میرا کوئی نہیں۔۔۔ میں اپنے بھگوان کو پکار چکی ہوں، جس کی وہ دِن میں پانچ بار عبادت کرتا ہے لیکن میرے لیے آنسوؤں اور آہوں کے سوا کُچھ نہیں۔۔۔ آنسو اور آہیں۔ کاش میں پیدا ہی نہ ہوتی۔ کاش! سمندر کی لہریں مُجھ پر ترس نہ کھاتیں۔"

مایا سر کو ہاتھوں کا سہارا دے کر دیر تک ہچکیاں لیتی رہی۔ کسی نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے "مایا" کہہ کر پکارا اور اُس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اُس نے مُڑ کر دیکھا۔ گنگو اُس کے قریب کھڑا تھا۔ اُس نے کہا۔ "بیٹی! تُم ڈر گئیں، اِس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"کُچھ نہیں؟" اس نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

"تُم رو رہی ہو۔ کیا ہوا؟"

مایا خاموش رہی۔ گنگو نے پھر پوچھا۔ "اِس وقت ایسی سُنسان جگہ پر تمہیں ڈر نہیں لگتا۔ سنو، چاروں طرف سے بھیڑیوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ چلو میرے ساتھ۔"

مایا نے کہا۔ "میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں؟"

"وہ کیا؟"

"آپ سچ مُچ مُجھے میرے بھائی کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کر چکے ہیں؟"

گنگو نے جواب دیا۔ ”میں اپنا فیصلہ بتانے سے پہلے تمہارا فیصلہ سُننا چاہتا ہوں۔“

بھگوان کے لیے مجھے اُس کے پاس نہ بھیجئے!“

”لیکن کیوں؟“

”میں بھائی کے پاس نہیں جانا چاہتی۔ جس نے میری ماں کے دُودھ کی لاج نہیں رکھی۔“

”یہ تم دِل سے کہہ رہی ہو یا مجھے بنانے کے لیے؟“

”کاش آپ میرا دِل چیر کر دیکھ سکتے۔“

”لیکن جے رام سے نفرت کی وجہ؟“

”میں خالد سے اُس کے متعلّق سُن چکی ہوں اور اب مجھے اُس کی دغا بازی کے متعلّق کوئی شُبہ نہیں رہا۔“

”لیکن کیا مُمکن نہیں کہ ہم تمہیں تمہارے بھائی کے حوالے کر کے زبیر

کے ساتھیوں کو آزاد کروا سکیں۔“

”اگرچہ جے رام ایک دفعہ دھوکا کر چکا ہے تو وہ دوبارہ موقع ملنے پر بھی ایسا ہی کرے گا۔ اُسے کسی صورت بھی یہ معلوم نہیں ہونا چاہئے کہ میں آپ کے پاس ہوں۔ ورنہ وہ راجہ کے سپاہیوں کو ساتھ لے کر جنگل کا کونہ کونہ چھان مارے گا۔ ناہید اچھّی طرح چلنے پھِرنے کے قابل نہیں ہوئی۔ آپ کے لیے اُس کی حفاظت بہت مُشکل ہو جائے گی۔“

”بیٹی! تُم اطمینان رکھو۔ جے رام کو تمھیں میرے قبضہ میں دیکھ کر سب مکّاریاں بھُول جائیں گی۔ اگر بعد میں اُس کی طرف سے کوئی خدشہ بھی پیش آیا۔ تو ناہید کے لیے میں ایک اور محفوظ جگہ تلاش کر چُکا ہوں۔“

”تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اُس نے قیدی آپ کے حوالے کر دیے تو آپ مجُھے اُس کے سپرد کر دیں گے؟“

”بیٹی! وہ تمہارا بھائی ہے۔ تُم اس کے پاس جانے سے کیوں ڈرتی ہو؟“

”میرا دُنیا میں کوئی نہیں، بھائی نے مجُھے اپنے مقصد پر قربان کرنا چاہا اور

میں آپ کے قبضے میں آ گئی۔ اب آپ مجھے بیٹی کہہ کر اپنے مقصد کے لیے پھر اُس کے پاس بھیجنا چاہتے ہیں۔ اپنے بھائی کی طرح آپ کا فیصلہ بھی میرے لیے تقدیر کا حکم ہو گا۔ کاش! میری تقدیر میرے ہاتھ میں ہوتی۔ کاش مجھے اِس دُنیا میں اپنا راستہ تلاش کرنے کا حق ہوتا۔ لیکن میری پسند اور ناپسند کے کوئی معنی نہیں۔ میں اِس طوفان میں ایک تنکا ہوں جیسے ہوا کا جھونکا جس طرف چاہے اُڑا کے لے جا سکتا ہے۔ میرا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔"

گنگو نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ "اگر یہ معاملہ تمہاری پسند پر چھوڑ دیا جائے تو تُم کیا کرو گی؟" مایا نے قدرے پُر اُمید ہو کر کہا۔ "میں آپ کی قید کو آزادی پر ترجیح دوں گی۔"

"وہ کیوں؟"

"میں ناہید کو بیماری کی حالت میں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی۔"

"مایا! میں ایک سوال پوچھتا ہوں، سچ کہو۔ تمہیں خالد کے ساتھ محبّت

ہے؟"

مایا نے آنکھیں جھکا لیں۔

اس نے پھر کہا۔ "مایا میرے سوال کا جواب دو۔"

وہ بولی۔ "لیکن آپ یہ کیوں پوچھتے ہیں؟"

"اِس لیے کہ شاید اِس سوال کا جواب پوچھ کر میں تمہارے لیے کوئی بہتر فصیلہ کر سکوں۔"

"مجھے معلوم نہیں، لیکن میں صرف یہ جانتی ہوں کہ میں اُن کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔"

"تم جانتی ہو کہ تمہارے متعلّق اُس کے شکوک ابھی تک رفع نہیں ہوئے۔ اُس کا دِل سمندر کی چٹّانوں سے زیادہ سخت ہے۔ میں تمہیں بیٹی کہہ چکا ہوں۔ آج سے تمہارا سُکھ میرا سُکھ اور تمہارا دُکھ میرا دُکھ ہو گا۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ تُم کسی دِن اُسے اپنا بنا لینے کی اُمّید پر سب کُچھ قربان کر دو۔ مُمکن ہے اُسے تمام عمر تمہاری نیک نیّتی کا یقین نہ آئے۔ اپنے

متعلّق اُس کے خیالات بدلنے کے لیے تمھیں بہت بڑی قربانی دینی پڑے گی۔"

"میں ہر قربانی کے لیے تیّار ہوں۔ لیکن مُجھ سے ہمیشہ کی جُدائی برداشت نہیں ہو سکتی۔"

"تمھیں بھائی کا خیال تو نہیں ستائے گا؟"

"راجہ کے ٹکڑے کھانے کے بعد وہ میرا بھائی نہیں رہا۔ مُجھے اُس سے کوئی ہمدردی نہیں۔"

گنگو نے کہا۔ "میں اُسے ایک طریقے سے یہاں لانا چاہتا ہوں۔ اُس کی صورت دیکھ کر تمھارا دل پسیج تو نہ جائے گا۔ اُس نے اپنے محسنوں سے دغا کی ہے۔ اگر اُس کی سزا تُم پر چھوڑ دی جائے تو تُم اس کے ساتھ کیا سلوک کرو گی؟"

"وہی جو ایک دغا باز، فریبی اور بُزدل کے ساتھ ہونا چاہیے۔"

گنگو نے کہا۔ "مایا! مجھے سوچ کر جواب دو۔ یہ ایک کڑا امتحان ہے۔ ممکن

ہے کہ میں تمہارے بھائی کو تمہارے سامنے کھڑا کر کے تمہارے ہاتھ میں انصاف کی تلوار دے دوں۔"

"میں سوچ چکی ہوں۔ میں اُسے رحم کا مستحق نہیں سمجھتی۔"

گنگو کُچھ کہنا چاہتا تھا لیکن جھاڑیوں کے پیچھے سے خالد کی آواز آئی۔ "مایا! مایا! تُم کہاں ہو؟"

گنگو نے مایا سے کہا۔ "تُم کشتی میں چھُپ جاؤ اور جب تک میں نہ بُلاؤں، باہر نہ آنا۔"

مایا نے کُچھ سوچے سمجھے بغیر اُس کے حکم کی تعمیل کی۔ گنگو کشتی سے اُتر کر دریا کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ خالد نے پھر آواز دی اور اُس نے کہا۔ "خالد میں اِدھر ہوں۔"

(۵)

خالد نے جھاڑیوں کے عقب سے نمودار ہو کر پوچھا۔ "مایا نہیں ملی؟ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

گنگو نے اپنے لہجے کو مغموم بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”مایا چلی گئی۔“

”آہ بے چاری!“

خالد نے بدحواس ہو کر پوچھا۔ ”کہاں چلی گئی۔ کیا ہوا؟“

”خالد تُم نے بہت بُرا کیا۔ کاش تُم اُس کا دِل نہ توڑتے۔“

”آخر کیا ہوا؟ خُدا کے لیے مُجھے بتاؤ۔“

”اب پچھتانے سے فائدہ؟ جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ کاش وہ تُم جیسے سنگ دِل انسان سے محبّت نہ کرتی!“

خالد نے بے تاب ہو کر گنگو کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا: ”خدا کے لیے مُجھے پریشان نہ کرو۔ صاف صاف کہو کیا ہوا؟“

”مایا چل بسی۔ میں یہاں پہنچا تو وہ دریا کے کنارے کھڑی تھی۔ میں نے اُسے آواز دی اور اُس نے مُجھے جواب دینے کی بجائے دریا میں چھلانگ لگا

دی۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے اُتارے لیکن اتنی دیر میں اُسے پانی کی لہر کنارے سے بہت دُور لے گئی۔ جب میں پانی میں کودنے لگا وہ لہروں کی آغوش میں چھُپ چکی تھی۔"

خالد نے چلّا کر کہا۔ "مایا ڈوب رہی تھی اور تُم اطمینان سے کنارے کھڑے کپڑے اُتار رہے تھے، بے رحم! ظالم! ڈاکو!!! میں سمجھتا تھا تُم انسان بن چکے ہو۔"

گنگو نے کہا۔ "میں کپڑوں سمیت چھلانگ لگا دیتا تو خود ڈوب جاتا۔"

"تو تُم سمجھتے ہو کہ تمہارے ڈوبنے سے دُنیا میں کوئی کمی آجاتی؟"

"تو اُس کے مرنے سے دُنیا میں کون سی کمی آگئی ہے۔ بھائی سے اُس کا دِل ٹوٹ چُکا تھا۔ تمہارے طرزِ عمل سے وہ مایوس ہو چُکی تھی۔ اچھّا ہوا وہ گھُل گھُل کر مرنے کی بجائے دریا میں ڈوب کر مر گئی۔ ہاں جب میں کپڑے اُتار رہا تھا اور لہریں اُسے دھکیل کر منجدھار کی طرف لے جارہی تھیں۔ وہ چلّا چلّا کر کہہ رہی تھی گنگو! مُجھے بچانے کی کوشش بے سود ہے۔

خالد کو میرا اسلام کہنا۔ میں اُس کی محبّت سے مایوس ہو کر زندہ نہیں رہنا چاہتی۔" خالد دیر تک بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ گنگو نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "خالد چلو! اب افسوس سے کیا حاصل۔ جو ہونا تھا سو ہو چکا۔"

خالد نے اُس کا ہاتھ جھٹک کر پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔ "تم جاؤ!"

گنگو نے کہا۔ "آج رات ہمیں بہت سے کام کرنے ہیں چلو!"

خالد نے سخت لہجے میں کہا۔ "گنگو خدا کے لیے جاؤ! مُجھے تھوڑی دیر کے لیے تنہا چھوڑ دو۔"

وہ بولا۔ "خالد! مُجھے معلوم نہ تھا کہ مایا کی موت کا تمہیں اِس قدر صدمہ ہو گا۔ ورنہ میں اپنی جان پر کھیل کر بھی اُسے بچانے کی کوشش کرتا۔"

خالد نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ "اُس کی موت کا صدمہ! گنگو تمہارے پہلو میں ایک انسان کا دِل نہیں۔ یہ حادثہ میری زندگی کا سب سے بڑا حادثہ ہے۔ اُس کی موت کا باعث میں ہوں اور میں مرتے دم تک

اپنے آپ کو معاف نہیں کروں گا۔"

"لیکن تُم مُجھ سے کئی بار یہ کہہ چُکے تھے کہ مایا دیوی کو اُس کے بھائی کے پاس بھیج دو۔ اگر تمہیں اُس سے جُدا ہونے کا افسوس نہ تھا تو اُس کی موت کا اِس قدر رنج کیوں ہے؟"

"گنگو خُدا کے لیے میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکو۔ میں نے اُسے سمجھنے میں غَلَطی کی اور یہ سزا میری قوّتِ برداشت سے زیادہ ہے۔"

"خالد چھوڑو اِن باتوں کو، مُجھے یقین ہے کہ اگر وہ ایک بار پھر زندہ ہو جائے تو بھی تمہارا غرور تمہیں اُس کی محبّت کا جواب دینے کی اجازت نہیں دے گا۔ تُم اُس کے ساتھ اُسی طرح پیش آؤ گے۔ چلو ایک دو دِن میں تُم اسے بھول جاؤ گے۔"

خالد کوئی جواب دینے بغیر ایک گرے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھ گیا اور دریا کی لہروں کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے درد بھری آواز میں کہا۔ "مایا! مایا! یہ تم نے کہا کیا!" گنگو نے پھر کہا۔ "خالد! تمہیں اب ایک مرد

کے حوصلے سے کام لینا چاہیے۔"

"گنگو! تُم جاؤ، میں ابھی آجاؤں گا۔"

"اچھا تمہاری مرضی۔" گنگو یہ کہہ کر چل دیا۔ لیکن قلعے کا رُخ کرنے کی بجائے جھاڑیوں میں چھُپتا ہوا کشتی کے قریب ایک درخت کی آڑ میں جا کھڑا ہوا۔ اُس نے آہستہ سے آواز دی۔ "مایا! اب نِکل آؤ۔"

مایا کا دِل دھڑک رہا تھا۔ وہ خالد اور گنگو کی باتیں سُن چکی تھی۔ وہ اُس موت کو جو اُسے خالد کے دِل سے اِس قدر قریب لا سکتی تھی ہزار زندگیوں پر ترجیح دینے کے لیے تیّار تھی۔ وہ خالد کی آہیں سُن رہی تھی اور اُسے خدشہ تھا کہ اِس مذاق کے بعد خالد اُس سے ہمیشہ کے لیے بد ظن ہو جائے گا۔ اُس نے اپنے دِل میں سوچا۔ کاش میں سچ مُچ دریا میں کود گئی ہوتی، اور آن کی آن میں یہ خیال ایک خوفناک ارادے میں تبدیل ہو گیا۔ گنگو نے پھر آہستہ سے آواز دی۔ مایا کے لیے سوچنے اور فیصلہ کرنے کا موقع نہ تھا۔ اُس نے اچانک اُٹھ کر پانی میں چھلانگ لگا دی۔

گنگو "مایا! مایا!" کرتا ہوا بھاگا۔ خالد بد حواس ہو کر اپنی جگہ سے اُٹھا اور دونوں بیک وقت دریا میں کود پڑے۔ گنگو کہہ رہا تھا۔ "خالد! پکڑو یہ مایا ہے مایا ٹھہرو! آگے پانی بہت خطرناک ہے۔" لیکن وہ تیر کر تیز دھارے میں جانے کی کوشش کر رہی تھی۔

خالد تیزی سے پانی کو چیرتا ہوا اُس کے قریب پہنچا۔ مایا نے غوطہ لگا دیا لیکن اچھّی خاصی تیراک کے لیے اپنے آپ کو پانی کے رحم وکرم پر چھوڑ دینا مُمکن نہ تھا۔ اُس نے جلد ہی اپنا سر پانی سے باہر نکال لیا۔ اور پھر منجدھار کی طرف جانے کی کوشش کرنے لگی، لیکن خالد نے اُس کا بازو پکڑ لیا۔ اِتنی دیر میں گنگو بھی پہنچ گیا اور دونوں مایا کو سہارا دے کر کنارے کی طرف تیرنے لگے۔

کنارے پر پہنچ کر گنگو نے کہا۔ "خالد! اب مُجھے اِس لڑکی پر کوئی اعتبار نہیں رہا۔" اِسے تمہاری بے رُخی نے پاگل بنا دیا ہے۔" اور پھر مایا سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "مایا! تُم نے دریا میں چھلانگ کیوں لگائی؟"

اُس نے اطمینان سے جواب دیا۔ "آپ نے اِن کے ساتھ یہ مذاق کیوں

کیا تھا؟“

گنگو نے خالد سے کہا۔ ”بھئی مُجھے معاف کرنا میں نے تمھیں چھیڑنے کے لیے مایا کو کشتی میں چھپا دیا تھا۔ مُجھے معلوم نہ تھا کہ یہ سچ مُچ ایسا کر دِکھائے گی۔ تُم دونوں ایک دوسرے سے محبّت کرتے ہو اور میں خوش ہوں۔“

خالد نے کوئی جواب نہ دیا۔ ”اُس کی آنکھوں میں صرف آنسو تھے۔ محبّت خوشی اور تشکّر کے آنسو!“

گنگو نے پوچھا۔ ”اب مایا کے متعلّق تمہارا کیا فیصلہ ہے؟“

اُس نے جواب دیا۔ ”مایا کے متعلّق کوئی فیصلہ کرنے کا کسی کو حق نہیں۔ وہ اپنے متعلّق خود فیصلہ کر سکتی ہے۔“

بہن اور بھائی

علی الصبح قلعہ سے چار کوس کے فاصلے پر دریا کے کنارے پر تاپ رائے کے سپاہی سفر کی تیّاری کر رہے تھے۔ جے رام دریا میں نہا کر کپڑے بدل رہا تھا کہ پاس ہی ایک جھاڑی کے عقب سے ایک سناتا ہوا تیر آیا، اور اُس کے پاؤں کے نزدیک زمین میں پیوست ہو گیا۔ تیر کے ساتھ ایک سفید رومال بندھا ہوا تھا۔ جے رام نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد زمین سے تیر نکالا اور اُس کے ساتھ بندھا ہوا رومال کر دیکھنے لگا جس پر کوئلے کے ساتھ یہ چند حروف لکھے ہوئے تھے:

”جے رام! میں تمہیں کس نام سے پکاروں۔ تم کو بھائی کہتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔ اگر میری جان بچانا چاہتے ہو، تو گنگو کے ساتھ چلے آؤ، ورنہ میری خیر نہیں۔

تمہاری بدنصیب بہن

مایا“

جے رام نے بھاگتے ہوئے جھاڑیوں کے قریب پہنچ کر آواز دی۔ ”گنگو! گنگو! تُم کہاں ہو؟“ گنگو نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”میں یہاں ہوں اِس طرف۔“

جے رام جھاڑیوں میں سے گزر کر اُس کے قریب پہنچا۔ گنگو گھوڑے پر سوار تھا۔

جے رام نے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور بے قرار ہو کر پوچھا: ”مایا کہاں ہے؟ وہ کس حال میں ہے۔ وہ تمہارے پاس کیسے پہنچی؟“

منگو نے جواب دیا۔ ”مایا زندہ ہے اور میں تمہیں اُس کے پاس لے جا سکتا

ہوں۔ کہو تُم میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو؟“

”میں؟ مایا کے لیے سات سمندر عبور کرنے کے لیے تیّار ہوں بھگوان کے لیے بتاؤ وہ کہاں ہے؟“

”وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ تم میرے پیچھے گھوڑے پر بیٹھ جاؤ۔“

”اگر زیادہ دور ہو تو میں اپنا گھوڑا لے آؤں؟“

”تم اپنا گھوڑا لا سکتے ہو لیکن اگر تم نے کوئی چالاکی کی تو مایا کو کبھی نہیں دیکھ سکو گے۔ میں یہاں تمہارا انتظار کرتا ہوں۔“

”میں ابھی آتا ہوں۔“ جے رام یہ کہ کر ٹیلے کی طرف بھاگا۔ گنگو احتیاط کے طور پر اُس جگہ سے ہٹ کر گھنے درختوں کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر جے رام نے جھاڑی کے قریب پہنچ کر گھوڑا روکا اور گنگو کو وہاں نہ پا کر آواز دی۔ گنگو نے مطمئن ہو کر اُسے اپنے پاس بلا لیا۔

گنگو کے ساتھ چلنے سے پہلے جے رام نے اُس سے کئی سوالات پوچھے، لیکن گنگو نے صرف یہ جواب دیا کہ ”مایا کے پاس پہنچ کر تمہیں سب حال

معلوم ہو جائے گا۔"

جنگل میں تھوڑی دور چلنے کے بعد گنگو کے دس اور مسلح ساتھی جھاڑیوں کی آڑ سے نکل کر اُن کے ساتھ شامل ہو گئے۔ جے رام کو گنگو کی نیّت پر شُبہ ہوا اور اُس نے لگام کھینچ کر گھوڑے کو روکتے ہوئے پوچھا۔ "گنگو! یہ کیا؟" لیکن اِس سے پہلے کہ گنگو کوئی جواب دیتا اُس کے ساتھیوں نے جے رام کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور ایک نے آگے بڑھ کر اُس سے گھوڑے کی لگام چھین لی۔ گنگو کی توقّع کے خلاف جے رام نے کوئی مدافعت نہ کی اور جب اُس کے ساتھیوں نے اُس کے ہتھیار چھیننے کی کوشش کی تو اُس نے خود ہی اپنی تلوار کمان اور ترکش اُتار کر اُن کے حوالے کر دیے۔

کمر کے پٹکے میں ایک چھوٹا سا خنجر لٹک رہا تھا۔ گنگو کے ایک ساتھی نے اتارنا چاہا لیکن اُس نے اشارے سے منع کیا۔

جے رام نے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ میں مایا کا پیغام سُننے کے بعد بھاگ نہیں سکتا۔"

گنگو نے جواب دیا۔ ”تم بھاگنے کی کوشش بھی کرو تو کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس جنگل میں جگہ جگہ تیر انداز چھُپے ہوئے ہیں۔“

”لیکن گنگو میں نے تُم سے کوئی وعدہ خلافی نہیں کی۔ تُم جہاں کہو میں چلنے کے لیے تیّار ہوں۔“

”جو شخص زبیر جیسے محسن کے ساتھ دغا کر سکتا ہے۔ مُجھے اُس کی کسی بات پر اعتبار آ سکتا۔ تمہاری خیر اسی میں ہے کہ آنکھیں بند کر کے میرے ساتھ چلتے رہو۔“

قلعہ چار کوس سے زیادہ دور نہ تھا لیکن گنگو نے مصلحتاً طویل اور دشوار گزار راستہ اختیار کیا۔ قلعے کے سامنے پہنچ کر سوار گھوڑوں سے اُترے۔ جے رام کو خالد قلعے سے باہر آتا ہوا دِکھائی دیا۔ وہ اُس کی طرف ہاتھ پھیلا کر آگے بڑھا۔ ”خالد! خالد! تم بھی یہاں ہو۔“

تم بھی یہاں ہو۔ تمہاری بہن کہاں ہے؟“

خالد نے حقارت سے اُس کی طرف دیکھا اور جواب دینے کی بجائے کترا کر

گنگو کے پاس آ کھڑا ہوا۔ جے رام کے دِل پر چرکا لگا۔ اُس کے پاؤں زمین میں گڑ گئے۔ وہ ہاتھ جو خالد کے استقبال کے لیے جھکے تھے جھکتے جھکتے پہلوؤں سے آ لگے۔ اس بے چارگی اور بے بسی کی حالت میں چاروں طرف دیکھا۔ اُس کی نگاہیں پھر ایک بار خالد کے چہرے پر جم گئیں۔ خالد نے مُنہ پھیر لیا۔

جے رام نے انتہائی کرب کی حالت میں کہا۔ "خالد! مُجھے معلوم نہیں۔ میں تُم سب کی نظروں میں اس قدر حقیر کیوں ہو گیا ہوں۔ میں بے قصور ہوں۔ میرے ساتھ اِس طرح پیش نہ آؤ۔ مایا کہاں ہے؟"

(۲)

پیچھے سے آواز آئی کہ "میں یہاں ہوں۔"

جے رام نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ مایا چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی۔

"مایا! مایا! میری بہن! میری ننّھی بہن!!" وہ یہ کہہ کر مایا کی طرف بڑھا لیکن وہ پیچھے ہٹتے ہوئے چلاّئی۔ "ظالم! کمینے! دغا باز! مُجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ تم

نے ایک راجپوت باپ کے خُون اور ایک راجپوت ماں کے دودھ کی لاج نہیں رکھی۔ تُم میرے کُچھ نہیں لگتے۔ تمہارا دامن اپنے محسنوں کے خُون سے داغ دار ہے۔"

اگر کوئی جے رام کا سینہ خنجر سے چھلنی کر ڈالتا، تو بھی شاید اُسے اِس قدر تکلیف نہ ہوتی۔ اُس کے دِل میں غصّے کی آگ کے شعلے بھڑکے اور غم کے آنسوؤں سے بُجھ گئے۔ اُس نے پھر ایک بار چاروں طرف دیکھا۔ گنگو کے چہرے پر ایک حقارت آمیز تبسّم دیکھ کر اُس کا منجمد خون کھولنے لگا۔ وہ اپنے ہاتھوں کی مُٹھّیاں بھینچتا اور ہونٹ چباتا ہوا اُس کی طرف بڑھا۔ "ذلیل ڈاکو! اِن سب باتوں کے ذمّہ دار تُم ہو۔ تم نے اِن سب کو میرے خلاف کیا ہے۔" پیشتر اِس کے کہ گنگو کے ہاتھ مدافعت کے لیے اُٹھتے، جے رام نے اچانک دو مُکّے اُس کے مُنہ پر دے مارے۔ گنگو اپنے گال سہلاتا ہوا پیچھے ہٹا۔ خالد نے آگے بڑھتے ہوئے ایک مُکّا جے رام کے مُنہ پر مارا۔ جے رام نے خالد کے ہاتھ کی ضرب منہ سے زیادہ دِل پر محسوس کی اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"خالد! تم۔۔۔؟"

گنگو کے ساتھیوں کی تلواریں نیاموں سے باہر آچکی تھیں۔ لیکن اس نے اُنہیں ہاتھ کے اشارے سے منع کیا اور جے رام کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب بتاؤ تُم اپنی بہن کی جان بچانے کے لیے زبیر کے ساتھیوں کو قید سے چھڑانے کے لیے تیّار ہو؟"

جے رام نے زخم خوردہ سا ہو کر جواب دیا "تو کیا تُم بھی زبیر کی طرح یہ سمجھتے ہو کہ میں پرتاپ رائے کی سازش میں شریک تھا؟"

گنگو نے جواب دیا۔ "نہیں بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ پرتاپ رائے تمہاری سازش میں شریک تھا۔ تُم نے اُسے سراندیپ کے ہاتھیوں اور جواہرات کا لالچ دے کر جہاز لوٹنے کے لیے آمادہ کیا۔"

"بھگوان جانتا ہے کہ میں بے قصور ہوں۔"

گنگو نے جواب دیا۔ "بھگوان اِس سے زیادہ جانتا ہے۔ اِس وقت ہمارا کام تمہاری بے گناہی پر بحث کرنا نہیں۔ ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تُم اپنی

بہن کے لیے اُن بے گناہ قیدیوں کو چھوڑنے کے لیے تیّار ہو یا نہیں؟"

جے رام نے جواب دیا۔ "کاش انہیں چھوڑنا میرے بس میں ہوتا۔ وہ اِس وقت دو سو سپاہیوں کے پہرے میں برہمن آباد جا رہے ہیں اور میں اکیلا اُن کے لیے کُچھ نہیں کر سکتا۔"

"تو تُم ہمیں یہ بتانا چاہتے ہو کہ تمہارے اپنے سپاہی تمہارا کہا نہیں مانتے!"

"کاش! وہ میرے سپاہی ہوتے۔ قیدیوں پر پرتاپ رائے کا پہرہ اِس قدر سنگین ہے کہ میں اُن کے ساتھ بات چیت ہی نہیں کر سکتا۔ اُسے یقین ہو چُکا ہے کہ میں ان کا طرف دار ہوں۔"

گنگو نے اپنے چہرے پر ایک طنز بھری مُسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ "تمہاری طرف داری کا شکریہ! اب میرے سوال کا جواب دو۔ تُم اُنہیں چھڑانے کے لیے تیّار ہو یا نہیں؟"

"بھگوان کے لیے مُجھ پر اعتبار کرو۔ جب تک اُن کا معاملہ راجہ کے سامنے پیش نہیں کیا جاتا۔ میں بے بس ہوں۔ مُجھے یقین ہے کہ راجہ اُنہیں قید

میں رکھ کر عربوں سے لڑائی مول لینے کی جرأت نہیں کرے گا۔"

گنگو نے کہا۔ "پرتاپ رائے تمہارا دوست ہے۔ اگر اُس کے پاس تمہارا خط پیش کیا جائے کہ تُم ہماری قید میں ہو تو کیا پھر بھی وہ انہیں رہا نہیں کرے گا۔ تُم یہ خط لکھ دو اور ہم اُسے برہمن آباد پہنچنے سے پہلے تمہارا یہ خط پہنچا دیں گے۔"

جے رام نے جواب دیا۔ "وہ لومڑی سے زیادہ مکّار اور بھیڑیے سے زیادہ ظالم ہے۔ مُجھے اپنی سرگزشت بیان کرنے کا موقع دو۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ بھگوان کے لیے میری بات مانو۔ پرتاپ رائے کو میری جان بچانے سے زیادہ خالد اور اگر ناہید بھی یہاں ہے تو اُن دونوں کی تلاش ہو گی۔ جس طرح مُجھے اب تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ تم یہاں کیسے پہنچے ہو، اِسی طرح تُم میں سے کسی کو معلوم نہیں کہ دیبل کا واقعہ کس طرح پیش آیا۔"

گنگو اور اُس کے ساتھیوں کو متوجّہ دیکھ کر جے رام نے بندر گاہ سے رُخصت ہونے سے لے کر قید خانے میں زبیر سے ملاقات تک کے تمام

واقعات بیان کیے اور اختتام پر گنگو اور خالد کی طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب بھی تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں آتا، تو میں ہر سزا خوشی سے برداشت کرنے کے لیے تیّار ہوں۔“ گنگو بولا۔ ”تو اب تم راجہ کے پاس قیدیوں کی سفارش کے لیے جارہے ہو؟“

”آپ کو اب بھی یقین نہیں آیا؟“

”اپنی بہن سے پوچھ لو۔ اِسے تمہاری باتوں پر اعتبار آیا ہو تو ہم بھی تُم ہر اعتبار کرنے کے لیے تیّار ہیں۔“ یہ کہہ کر گنگو مایا سے مخاطب ہوا۔ ”ہم تمہارے بھائی کا فیصلہ تُم پر چھوڑتے ہیں۔“

جے رام، مایا کی طرف متوجّہ ہوا۔ مایا کے لیے یہ گھڑی صبر آزما تھی۔ بھائی کی سرگزشت سُننے کے بعد اُس کے دِل میں ایک ردِّ عمل شروع ہو چکا تھا تاہم وہ اُس کے متعلّق اپنے خیالات فوراً بدلنے کے لیے تیّار نہ تھی۔ ضمیر کی ایک آواز اگر یہ کہہ رہی تھی کہ مایا تُجھے اپنے بھائی پر اعتبار کرنا چاہیے۔ تو دوسری آواز کہہ رہی تھی کہ نہیں، وہ صرف تمہیں ساتھ لے جانے کے لیے بہانے بنارہا ہے۔ اِس ذہنی کشمکش کے دوران میں اُسے گنگو کے یہ

الفاظ یاد آئے۔ ”اُس کی صورت دیکھ کر تمہارا دِل تو پسیج نہ جائے گا۔ مُمکن ہے کہ میں تمہارے ہاتھ میں انصاف کی تلوار دے دوں۔“ مایا نے گنگو کی طرف دیکھا۔ اُس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں۔ ”میں انصاف کی تلوار تمہارے ہاتھ میں دے چکا ہوں۔ اب تم اپنا وعدہ یاد کرو۔“

جے رام نے مایا کے تذبذب سے پریشان ہو کر کہا۔ ”مایا تمہیں بھی اب مُجھ پر اعتبار نہیں آتا ہے۔“

اس نے جواب دیا۔ ”اِس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم نے اُن لوگوں کے انتقام کے خوف سے یہ قصّہ نہیں سُنایا؟“

جے رام نے درد بھری آواز میں کہا۔ ”مایا! تُم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں بُزدل ہوں۔ میں موت کے خوف سے جھوٹ بول رہا ہوں۔ بھگوان کے لیے مُجھے دوسروں کے سامنے شرمسار نہ کرو۔ میں تمہارا بھائی ہوں۔ لیکن اگر تمہیں مُجھ پر یقین نہیں آتا تو یہ میرا خنجر لو اور میرا دِل چیر کر دیکھو کہ میرا لہو ابھی تک سُرخ ہے یا سفید ہو چکا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے

جے رام نے اپنا خنجر مایا کے ہاتھ میں دے دیا اور اپنا سینہ اس کے سامنے تان کر بولا۔

”مایا تمہیں باپ کے سفید بالوں کی قسم اپنی ماں کے دودھ کی قسم۔ اگر میں مجرم ہوں تو یہ خیال نہ کرو کہ میں تمہارا بھائی ہوں۔ میں یہ جاننے کے بعد زندہ نہیں رہنا چاہتا کہ میری بہن بھی مُجھے بُزدل خیال کرتی ہے۔ مُجھے اپنے ہاتھوں سے موت کی نیند سلا دو۔ تمہاری رگوں میں اگر ایک راجپوت کا خون ہے تو اپنے بھائی کے ساتھ رعایت نہ کرو۔“

مایا نے جذبات کی شدّت میں غیر شعوری طور پر اپنا ہاتھ جس میں خنجر تھا بند کیا۔ جے رام کے ہونٹوں پر ایک دِلفریب مُسکراہٹ کھیلنے لگی۔ خالد نے کپکپی لی۔ مایا نے عزم و ہمّت کے اُس پیکر کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھا۔ اُس کا بات کانپنے لگا۔ خالد چلایا۔ ”مایا! تمہارا بھائی معصوم ہے۔“ مایا کے کانپتے ہوئے ہاتھ سے خنجر گِر پڑا۔ آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور وہ بے اختیّار جے رام سے لپٹ کر ہچکیاں لینے لگی۔ ”بھیا! بھیا! مُجھے معاف کر دو۔“

جے رام اُس کے سیاہ بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بار بار یہ کہہ رہا تھا۔
"میری بہن! میری ننھّی مایا!"

بہن اور بھائی ایک دوسرے سے علیحدہ کھڑے ہو گئے۔ خالد نے جے رام کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "جے رام! مُجھے معاف کرنا۔ مُجھے تُم پر شک نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

جے رام نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "مُجھے تُم سے کوئی شکایت نہیں۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو میں بھی شاید یہی کرتا۔"

خالد نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "میں نے ہنگامی جوش میں آپ کے منہ پر مُکّا رسید کر دیا تھا۔ اب آپ یہ قرض وصول کر سکتے ہیں؟"

جے رام نے کہا۔ "نہیں! اب یہ قصّہ نہ چھیڑو، ورنہ تمہیں ایک مُکّا مار کر مُجھے گنگو سے دو وصول کرانے پڑیں گے۔"

(۳)

گنگو اپنی زندگی میں کبھی اس قدر پریشان نہیں ہوا تھا۔ وہ سر جھکائے کھڑا

تھا۔ جے رام نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "گنگو! اگر تم خلوصِ دِل سے زبیر اور اُس کے ساتھیوں کو چھڑانا چاہتے ہو، تو یہ معاملہ چند دِن کے لیے مُجھ پر چھوڑ دو۔ مُجھے اُمّید ہے کہ راجہ صحیح خطرات سے باخبر ہو کر اُنہیں قید میں رکھنے کی جرأت نہیں کرے گا، اور اگر اس نے میری بات نہ سُنی، تو میں تمہارے پاس چلا آؤں گا، اور پھر ہم کوئی اور تدبیر سوچیں گے لیکن خالد کی بہن کہاں ہے؟"

گنگو نے جواب دیا۔ "وہ بھی ہمارے ساتھ ہے۔ وہ جہاز پر زخمی ہو گئی تھی۔"

"اب وہ کیسی ہے؟"

اِس سوال کے جواب میں خالد بولا۔ "اب وہ پہلے سے اچھّی ہے لیکن زخم ابھی تک مُندمل نہیں ہوا۔ میں مایا دیوی کا شکر گزار ہوں۔ اُنہوں نے اُس کی تیمارداری میں بہت تکلیف اُٹھائی ہے۔"

گنگو نے کہا۔ "جے رام! اگر پرتاب رائے نے راجہ کے حکم سے جہاز

لوٹے ہیں تو مجھے یقین نہیں کہ وہ قیدیوں کو چھوڑنے کے لیے تیّار ہو گا۔ میرے خیال میں وہ اس بات کی کوشش کرے گا کہ یہ خبر سندھ سے باہر نہ نکلے۔ برہمن آباد میں ایسے قید خانے ہیں جہاں سے صرف موت کی صورت میں انسان باہر نکلتے ہیں۔ اس خبر کو مکران یا بصرے تک پہنچانا ضروری ہے۔ اگر اُن کی حکومت نے مداخلت کی تو راجہ یقیناً قیدیوں کو چھوڑ دے گا۔“

جے رام نے کہا۔ ”اگر خالد جانا چاہے تو میں اِسے سرحد کے پار پہنچا دینے کی ذمّہ داری لیتا ہوں۔“

گنگو نے جواب دیا۔ ”خالد کو میں بھی سرحد کے پار پہنچا سکتا ہوں، لیکن جب تک اُس کی بہن تندرست نہیں ہوتی، اُس کے لیے جانا مُمکن نہیں۔ اِس کے علاوہ عربوں کی فوجیں اِس وقت تُرکستان اور افریقہ میں لڑ رہی ہیں۔ مُمکن ہے کہ وہ سپاہیوں کی قلّت کے پیشِ نظر سندھ کے ساتھ بگاڑ پسند نہ کریں۔ خالد کا خیال ہے کہ اگر زبیر کسی طرح رہا ہو جائے تو یہ مُہم اُس کے لیے بہت آسان ہو گی۔ وہ بصرہ اور دمشق کے ہر با اثر آدمی کو

جانتا ہے۔“

جے رام نے کہا۔ ”اگر آپ یہ چاہتے ہیں تو میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں اپنی جان پر کھیل کر بھی زبیر کو قید سے نکالنے کی کوشش کروں گا۔“

مایا نے کہا۔ ”بھیّا! تُم سب کُچھ کر سکتے ہو۔ زبیر کی رہائی کی کوشش ضرور کرو۔“

”مایا تمہاری سفارش کے بغیر بھی میرا یہ فرض ہے۔“ یہ کہہ کر جے رام گنگو سے مخاطب ہوا۔ ”اب اگر آپ کی اجازت ہو تو میں مایا سے چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔“

گنگو کا اشارہ پا کر اُس کے ساتھی وہاں سے کھِسک گئے۔ گنگو نے ایک طرف ہو کر خالد سے کہا، ”تم ناہید کے پاس جاؤ، اور اگر وہ قیدیوں کو کوئی پیغام بھیجنا چاہتی ہو تو پوچھ آؤ۔“

خالد اندر داخل ہوا تو ناہید دروازے کی آڑ میں کھڑی تھی۔ اُس نے کہا۔

”ناہید تمہیں ذرا افاقہ ہوتا ہے۔ تو تم چلنے پھرنے لگتی ہو تمہیں بستر پر لیٹنا چاہیے۔“

ناہید نے اُس کی بات پر توجّہ دیئے بغیر کہا۔ ”تم نے بے چارے جے رام پر بہت سختی کی۔ اب مایا کے متعلّق تم نے کیا فیصلہ کیا ہے۔“

خالد نے جواب دیا۔ ”مایا کے متعلّق ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ وہ بہن بھائی آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ غالباً وہ اُس کے ساتھ چلی جائے گی۔ جے رام نے زبیر کو قید سے چھڑانے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ رہا ہوتے ہی مکران کے راستے بصرہ پہنچ کر ہماری سرگزشت سنائے گا۔ عورتوں اور بچّوں کے رہا ہونے کی اِس کے سوا اور کوئی صُورت نہیں کہ ہماری حکومت اِس معاملے میں مداخلت کرے۔“

ناہید نے کہا۔ ”میں یہ باتیں سُن چکی ہوں لیکن مُجھے ڈر ہے جس طرح ابّا جان کے معاملے میں حکومتِ سندھ نے مکران کے گورنر کو ٹال دیا تھا۔ اِسی طرح یہ معاملہ بھی رفع دفع ہو جائے گا۔ میں نے سُنا ہے کہ بصرہ کا حاکم بہت جابر ہے لیکن سندھ کی طرف متوجّہ نہ ہونے کے لیے اُن کے

پاس معقول بہانہ ہے کہ عرب کی تمام افواج ایشیا اور افریقہ میں برسرِ پیکار ہیں۔"

خالد نے پریشان ہو کر کہا۔ "میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ لیکن میں خدا کی رحمت سے مایوس نہیں۔ وہ ضرور ہماری مدد کرے گا۔"

ناہید نے کہا۔ "میں نے ایک تجویز سوچی ہے۔ میں بصرہ کے حاکم کو خط لکھتی ہوں۔ اگر جے رام زبیر جو رہا کروا سکے تو اسے کہو، یہ خط اُس کے حوالے کر دے۔ اگر بالفرض میرا خط حاکمِ بصرہ کو متاثر نہ کر سکا، تو بصرہ کے عوام اُس سے ضرور متاثر ہوں گے۔ میں خواب میں مسلمانوں کو قید خانے کے دروازے توڑتے ہوئے دیکھ چکی ہوں۔ مجھے اپنے خواب کے صحیح ہونے کا یقین ہے۔"

"تو تم اندر جا کر خط لکھو۔ لیکن کس چیز پر لکھو گی؟ ہاں یہ لو میرا رومال۔" خالد نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ناہید کو رومال دیا اور واپس مڑتے ہوئے کہا۔ "تم خط لکھو! میں اتنی دیر جے رام کو روکتا ہوں۔"

باہر مایا اپنے بھائی کو آپ بیتی سُنا رہی تھی۔ اختتام پر جے رام نے پوچھا۔ ”مایا! تمہیں یہاں کسی قسم کی تکلیف تو نہیں؟“

”نہیں!“ اُس نے جواب دیا۔ ”گنگو مُجھے اپنی بیٹی سمجھتا ہے۔ ناہید مُجھے اپنی چھوٹی بہن خیال کرتی ہے۔“

جے رام نے کہا۔ ”مایا میں تمہیں ایک بہت بُری خبر سُنانا چاہتا ہوں۔“

مایا نے گھبرا کر پوچھا۔ ”وہ کیا؟“

”بات یہ ہے کہ میں تمہیں اِس وقت اپنے ساتھ نہیں لیے جا سکتا۔ میں نے تمہارے غائب ہونے کی ذمّہ داری پر تاپ رائے پر تھوپی تھی۔ لیکن جب اُس نے زبیر اور علی کو اذیّت دینا شروع کی تو مُجھے اُن کی جانیں بچانے کے لیے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ تُم میرے ساتھ نہ تھیں۔ اب اگر میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں تو مُجھے ناہید اور خالد کا پتہ بتانے پر مجبور کیا جائے گا۔ میں بذاتِ خود راجہ کی سختی سے نہیں ڈرتا لیکن پرتاپ رائے کو شک ہو جائے گا اور وہ ناہید اور خالد کی تلاش شروع کر دے گا۔ میں یہ نہیں چاہتا

کہ تمہیں دیکھ کر اُنہیں خالد اور ناہید کے روپوش ہونے کا شک ہو۔ اگر تم چند دِن اور یہاں رہنا گوارا کرو تو پرتاپ رائے غالباً تین چار روز میں واپس دیبل چلا جائے گا۔ اُس کے بعد میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔"

مایا نے اطمینان سے جواب دیا۔ "بھیّا! آپ میری فکر نہ کریں۔ میں یہاں ہر طرح خوش ہوں اور جب تک ناہید تندرست نہیں ہوتی میں اُسے چھوڑ کر جانا پسند بھی نہیں کروں گی۔" گنگو اور خالد کُچھ فاصلے پر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ جے رام نے اُنہیں آواز دے کر اپنی طرف متوجّہ کیا اور پھر اشارے سے اپنے پاس بُلا لیا۔ جب قریب پہنچے تو اُس نے کہا۔ "آپ کو کہیں پھر شک نہ ہو جائے کہ میں کوئی سازش کر رہا ہوں۔ مایا کہتی ہے کہ وہ ناہید کے تندرست ہونے تک یہیں رہنا چاہتی ہے اور میں بھی بعض مصلحتوں کی بنا پر اسے یہاں چھوڑنا چاہتا ہوں۔ میں چند دِنوں تک اُسے لے جاؤں گا۔ مُمکن ہے کہ مُجھے بھی زبیر کے ساتھ فرار ہونا پڑے اور میں ہمیشہ کے لیے آپ کے ساتھ آملوں۔ اب مُجھے دیر ہو رہی مُمکن ہے کہ راجہ پرتاپ رائے کے شہر میں پہنچے ہی ہمیں ملاقات کے لیے بُلا

لے۔ میرا غیر حاضر ہونا ٹھیک نہیں۔“

خالد نے کہا۔ ”آپ ذرا ٹھہریے۔ ناہید ایک خط لکھ رہی ہے۔ آپ یہ خط زبیر کو آزاد کروانے کے بعد اُس کے حوالے کر دیں۔“

”تو جلدی سے وہ خط لے آؤ۔ مُجھے بہت دیر ہو گئی ہے۔ وہ برہمن آباد کے قریب پہنچ چکے ہوں گے۔“

گنگو نے کہا۔ ”تُم فکر نہ کرو۔ ہم اُن سے پہلے تمہیں ایک آسان راستے سے برہمن آباد پہنچا دیں گے۔“

جے رام نے کہا۔ ”میں فقط آپ کا ایک ساتھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ برہمن آباد میں اُسے کوئی نہ پہچانتا ہو۔ اگر کوئی نازک وقت آیا تو میں اِسے آپ کے پاس اِطّلاع دینے کے لیے روانہ کر دوں گا۔“

گنگو نے کہا۔ ”آپ واسو کو لے جائیں۔“

دوپہر کے وقت جے رام واسو کی رہنمائی میں جنگل عبور کر رہا تھا۔

دوست اور دُشمن

برہمن آباد سے ایک کوس کے فاصلے پر جے رام کو اپنا قافلہ دِکھائی دیا۔ اُس نے واسو کے ساتھ قافلے میں شریک ہونا خلافِ مصلحت سمجھتے ہوئے اپنا راستہ تبدیل کر دیا اور دوسرے دروازے سے شہر میں داخل ہوا۔ برہمن آباد میں نرائن داس نامی ایک نوجوان اُس کا پرانا دوست تھا۔ جے رام نے واسو کو اس کے گھر ٹھہرا کر شاہی مہمان خانے کا رُخ کیا۔ تھوڑی دیر بعد پرتاپ رائے سپاہیوں اور قیدیوں سمیت وہاں پہنچ گیا۔ اُس نے جے رام کو دیکھتے ہی کہا۔ ’’مُجھ سے تُم نے شکار کا بہانہ کیوں کیا۔ تُم نے صاف یہ کیوں نہ بتایا کہ تم مُجھ سے پہلے مہاراج سے ملنا چاہتے تھے، اب

بتاؤ! تمہاری بہن کی کہانی سُننے کے بعد مہاراج نے کیا کہا؟"

"میں ابھی تک مہاراج سے نہیں ملا اور نہ میری یہ نیّت تھی۔"

پرتاپ رائے نے مطمئن ہو کر کہا۔ "جے رام! میرا خیال ہے کہ اپنی بہن کے غائب ہو جانے کے متعلّق تُم نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ میں عربوں کے علاوہ سراندیپ کے قیدیوں سے بھی پوچھ چکا ہوں۔ وہ سب تمہارے پہلے بیان کی تصدیق کرتے ہیں۔ اگر اُنہوں نے راجہ سے شکایت کی کہ تمہاری بہن کے علاوہ ایک مسلمان لڑکی بھی جہاز سے غائب ہوئی ہے تو مُمکن ہے کہ راجہ مُجھے اِس بات کا ذمّہ دار ٹھہرائے؟"

"تو میں راجہ کے سامنے بھی یہ کہنے کے لیے تیّار ہوں کہ میری بہن جہاز پر نہیں تھی اور مسلمان لڑکی کے غائب ہو جانے کا واقعہ بھی صحیح نہیں۔"

"لیکن جب قیدی یہ شکایت کریں گے کہ وہ جہاز سے غائب ہوئی ہیں تو تمہارا بیان راجہ کو مُطمئن نہ کر سکے گا۔"

جے رام نے پریشان ہو کر کہا۔ "آخر آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ پہلے آپ

نے زبیر اور علی کو اذیّت پہنچا کر مجُھے یہ تسلیم کرنے پر مجبور کیا کہ میری بہن غائب نہیں ہوئی اور اب آپ یہ ثابت کرنے پر مُصِر ہیں کہ عرب لڑکی اور میری بہن جہاز سے غائب ہوئی ہیں۔"

پرتاپ رائے نے جواب دیا۔ "میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ کون سی مجبوری ہے جس نے تمہیں اپنی بہن کا راز چھپانے پر مجبور کیا ہے؟"

"آپ یہ جانتے ہیں کہ زبیر میرا مہمان تھا۔ اُس نے میری جان بچائی تھی اور میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ اِس واقعہ کی آڑ لے کر اُسے اذیّت پہنچائیں۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تُم صرف زبیر کی خاطر اپنے صحیح دعوے سے دستبردار ہوئے۔ تم زبیر کی دوستی پر اپنی بہن کو قربان کرنے کے لیے تیّار ہو لیکن تمہارا دِل یہ گواہی دیتا ہے کہ تمہاری بہن کو میں نے اغوا کیا ہے اور صرف تمہاری بہن ہی نہیں بلکہ ایک عرب لڑکی اور لڑکے کے غائب ہو جانے کی ذمّہ داری بھی مجُھ پر ہی عائد ہوتی ہے۔"

جے رام نے جواب دیا۔ ”نہیں نہیں! مُجھے آپ کے متعلّق جو غَلَط فہمی تھی، وہ دور ہو چُکی ہے۔“

”کب؟“

جے رام نے اچانک محسوس کیا کہ پرتاپ رائے اُس کے لیے پھر ایک پھندا تیّار کر رہا ہے۔ اُس نے چونک کر کہا۔ ”آخر اِن باتوں سے آپ کا مطلب کیا ہے؟ میں آپ سے وعدہ کر چکا ہوں کہ میں راجہ کے سامنے اپنی بہن کا ذکر نہیں کروں گا۔“

پرتاپ رائے نے سرد مہری سے کہا۔ ”تم جو کُچھ خود نہیں کہنا چاہتے وہ عربوں کی زبان سے کہلواؤ گے۔ اِس سے میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ پہلے جس راز کو تم ظاہر کرنا چاہتے تھے، اُسے میں چھپانا چاہتا تھا۔ اب جس راز کو تم چھپانا چاہتے ہو اُسے میں ظاہر کرنے پر مجبور ہوں۔ میرے متعلّق اگر تمہاری غَلَط فہمی دور ہوئی ہے تو اِس کی کوئی وجہ ہے اور میں وہ وجہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ میں یہ ماننے کے لیے تیّار نہیں کہ تم ایک عرب کے لیے اتنی بڑی قربانی دے سکتے ہو۔ کوئی عقل مند آدمی یہ

ماننے کے لیے تیّار ہو گا۔“

”تو تمھارا یہ مطلب ہے کہ میں نے خود اپنی بہن کو کہیں غائب کر دیا ہے؟“

”تمھاری بہن کا مسئلہ میرے لیے کوئی اہمیّت نہیں رکھتا لیکن عرب لڑکی کا سُراغ لگانے کی ذمّہ داری مُجھ پر عائد ہوتی ہے، بہت مُمکن ہے کہ تمھاری طرح عربوں نے بھی راجہ کو مُجھ سے بد ظن کرنے کے لیے ایک لڑکی کے غائب ہو جانے کا بہانہ تراشا ہو لیکن اگر دربار میں اُس کے غائب ہو جانے کا سوال اُٹھایا گیا تو ہم میں سے ایک کو یہ ذمّہ داری اپنے سر لینا پڑے گی۔“

جے رام نے کُچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”جس طرح میں نے آپ سے انتقام لینے کے لیے اپنی بہن کے غائب ہو جانے کا جھوٹا افسانہ تراشا تھا۔ اِسی طرح اُنھوں نے مُجھے آپ کا شریکِ کار سمجھ کر محض انتقام لینے کے لیے یہ بہانہ تلاش کیا ہے۔ میں زبیر کو سمجھا سکتا ہوں اور مُجھے اُمّید ہے کہ وہ میرے کہنے پر راجہ کے سامنے جھوٹی شکایت نہیں کرے گا۔“

پرتاپ رائے نے بے رُخی سے کہا۔ ”تُم کسی قیدی سے بات چیت نہیں کر سکتے۔ میں نے سپاہیوں کو حکم دیا ہے کہ راجہ کے سامنے پیش ہونے سے پہلے تمہیں اپنا صندوق کھول کر دیکھنے کی بھی اجازت نہیں۔“

جے رام کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن فوج کے ایک افسر نے آکر پرتاپ رائے کو اطلاع دی کہ ”مہاراج آپ کو یاد فرماتے ہیں۔“

جے رام نے پرتاپ رائے کے ساتھ جانا چاہا لیکن اس نے کہا۔ ”مہاراج نے مجھے یاد فرمایا ہے تمہیں نہیں۔ تُم اطمینان سے بیٹھے رہو۔ جب تمہیں بُلایا جائے گا، میں تمہارا راستہ نہیں روکوں گا۔“

پرتاپ رائے جہاز سے لُوٹا ہوا مال اُٹھوا کر چلا گیا اور جے رام پریشانی کی حالت میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ زبیر باقی قیدیوں کے ساتھ ہی ایک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ٹہلتے ٹہلتے اندر جھانک کر دیکھا لیکن پہرے دار نے اُسے ایک طرف دھکیلتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔ جے رام سے ایک معمولی پہرے دار کا یہ سلوک دیکھ کر زبیر اور اُس کے دوسرے ساتھیوں کو یقین ہونے لگا کہ وہ اُن کے ساتھ ایک ہی کشتی میں سوار ہے۔

(۲)

غروبِ آفتاب سے کُچھ دیر پہلے راجہ کے ایک سپاہی نے جے رام کو اطلاع دی کہ مہاراج آپ کو بلاتے ہیں۔ جے رام کاٹھیاواڑ کے راجہ کے تحائف کا صندُوق اُٹھوا کر راجہ کے محل میں پہنچا۔ پہرے دار اُسے محل کے ایک کمرے میں لے گئے۔ راجہ داہر سنگِ مرمر کے چبوترے کے اوپر سونے کی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ پرتاپ رائے کے علاوہ دیبل کا حاکمِ اعلیٰ اور سینا پتی اودھے سنگھ اور اُس کا نوجوان بیٹا بھیم سنگھ جو اَرَور [1](۱) سے راجہ کے ساتھ آئے تھے، اُس کے سامنے کھڑے تھے۔ جے رام نے راجہ کو تین بار جھک کر پرنام کیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ دو سپاہیوں نے آبنوس کا صندُوق راجہ کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ جے رام نے راجہ کے حکم سے صندُوق کھولا۔ راجہ نے جواہرات پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ پھر پرتاپ

---

[1] سندھ کا دارالحکومت ضلع نواب شاہ میں بیرانی کے قریب ایک قدیم شہر کے کھنڈرات موجود ہیں، جسے دلور کہا جاتا ہے۔ بعض محققین کے خیال میں دلور اَرَور کی بگڑی ہوئی صورت ہے لیکن بعض تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ اَرَور کا شہر موجودہ روہڑی کے آس پاس آباد تھا۔ اور دریائے سندھ نے اُس کا نشان تک نہیں چھوڑا۔

رائے کی طرف دیکھا اور جے رام سے سوال کیا۔ ”ہم نے سُنا ہے کہ تُم عربوں کی حمایت کرنا چاہتے ہو۔ تُم نے ہمارے متعلق یہ بھی کہا ہے کہ ہم عربوں کا مُقابلہ نہیں کر سکتے اور تُم نے ہمارے وفادار پرتاپ رائے پر تہمت لگانے کے لیے ایک عرب لڑکی اور اپنی بہن کو کہیں چھپا دیا ہے؟“

جے رام نے جواب دیا۔ ”اَن داتا! مجھے یہ یقین نہ تھا کہ پرتاپ رائے نے آپ کے حکم سے اُن کے جہازوں کو لوٹا تھا، ان کا دیبل میں ٹھہرنے کا ارادہ نہ تھا۔ انہوں نے مجھے راستے میں بحری ڈاکوؤں سے چھڑایا تھا۔ دیبل میں مَیں انہیں اپنے مہمان بنا کر لایا تھا اور اپنے مہمانوں کی رکھشا ایک راجپوت کا دھرم ہے۔ عرب لڑکی اور اپنی بہن کے متعلق میں اِس سے زیادہ کچھ نہیں کہ سکتا کہ جب جہاز لُوٹے جارہے تھے میں ایک کوٹھری میں بند تھا۔“

”تُم نے پرتاپ رائے سے یہ کہا تھا کہ تُم نے عربوں کو اُس کی قید سے چھڑانے کے لیے یہ بہانہ تراشا تھا؟“

”اَن داتا، میں اِس سے انکار نہیں کرتا لیکن۔۔۔۔۔!“

راجہ نے سخت لہجے میں کہا۔ ”ہم کُچھ نہیں سُننا چاہتے۔ اگر عربوں نے شکایت کی کہ جہاز پر سے اُن کی ایک لڑکی غائب ہوئی ہے تو تمہیں اُس لڑکی کو ہمارے حوالے کرنا پڑے گا۔“

”مہاراج! اگر عرب مُجھ پر یہ شُبہ ظاہر کریں کہ لڑکی کو میں نے اغوا کیا ہے تو میں ہر سزا بھگتنے کے لیے تیّار ہوں۔“

”ہم تمہاری چال اچھّی طرح سمجھتے ہیں۔ اگر عربوں نے تمہیں قصوروار نہ ٹھہرایا تو اِس کا مطلب یہ ہو گا کہ تُم نے اُن کی مرضی سے لڑکی کو کہیں چھُپا رکھا ہے۔ تُم جانتے ہو کہ ہمارے پاس ایسے طریقے ہیں جن سے اُنہیں سچ بولنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔“

”اَن داتا! اگر آپ مُجھے قصوروار ٹھہراتے ہیں تو جو سزا جی میں آئے دے لیں، لیکن عربوں کے ساتھ پہلے ہی زیادتی ہو چکی ہے۔“

”تو تُم ہمارے دُشمنوں کے ساتھ دوستی کا دم بھرتے ہو؟“

”وہ آپ کے دُشمن نہیں۔ وہ سندھ کو عرب کا ایک پُر امن ہمسایہ خیال

کرتے تھے۔ ورنہ وہ دیبل کے قریب سے بھی نہ گزرتے تھے۔ اگر وہ نیک نیّت نہ ہوتے تو جواہرات کا یہ صندُوق جو میں مہاراجہ کاٹھیاواڑ کی طرف سے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں، آپ تک نہ پہنچتا۔"

راجہ نے کہا۔ "کاٹھیاواڑ کے جواہرات سراندیپ کے جواہرات کے مقابلے میں پتھّر معلوم ہوتے ہیں۔"

"مہاراج! میں جوہری نہیں، ایک سپاہی ہوں، میں پتھّروں کو نہیں پہچانتا۔ لیکن آپ کے دوست اور دُشمن کو پہچانتا ہوں۔ میں اِن پتھّروں کے ساتھ آپ کی خدمت میں مہاراجہ کاٹھیاواڑ کی دوستی کا پیغام لایا ہوں۔ اِن پتھّروں کی قیمت اگر ایک کوڑی بھی نہ ہو تو بھی وہ ہاتھ جو آپ کے سامنے یہ ناچیز تحائف پیش کر رہا ہے بہت قیمتی ہے لیکن پرتاپ رائے نے عرب جیسی پُر امن اور طاقت ور ہمسایہ سلطنت کے جہاز لوٹ کر جو کُچھ آپ کے لیے حاصل کیا ہے، وہ آپ کو بہت مہنگا پڑے گا۔ اَن داتا! آپ کو مسلمانوں سے دُشمنی مول لینے سے پہلے بہت سوچ بچار سے کام لینا چاہیے۔ اُن کا ہاتھ ہر ہاتھ سے مضبوط ہے اور اُن کا لوہا ہر لوہے کو

کاٹتا ہے۔ وہ جیٹھ کی آندھیوں کی طرح اُٹھتے ہیں اور ساون کے بادلوں کی طرح چھا جاتے۔ اُن کے مُقابلے پر آنے والوں کو نہ سمندر پناہ دے سکتے ہیں نہ پہاڑ۔ اُن کے گھوڑے پانی میں تیرتے اور ہوا میں اُڑتے ہیں۔ آپ نے برسات میں دریائے سندھ کی لہریں دیکھی ہیں، لیکن اُن کی فتوحات کا سیلاب اُس سے کہیں زیادہ تند اور تیز ہے۔“

راجہ داہر کی قوّتِ برداشت جواب دے چکی تھی۔ اُس نے چلّا کر کہا۔ ”ڈرپوک گیدڑ! تمہاری رگوں میں راجپوت کا خون نہیں۔ میرے ملک میں تمہارے جیسے بُزدل آدمی کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔“

”اَن داتا! میں اِس وقت مہاراجہ کاٹھیاواڑ کا ایلچی ہوں۔ میں خود ایسے مُلک میں نہیں رہنا چاہتا جس میں دوست کو دُشمن اور دُشمن دوست خیال کیا جائے۔“

”کاٹھیاواڑ کا راجہ اگر خود بھی یہاں موجود ہوتا تو بھی میں یہ الفاظ سُننے کے بعد اُس کا سر قلم کروادیتا۔ پرتاپ رائے اسے لے جاؤ! ہم کل اِس کی سزا کا فیصلہ کریں گے۔ صُبح عربوں کے سرغنہ کو ہمارے سامنے پیش کرو۔“

پرتاپ رائے نے سپاہیوں کو آواز دی اور آٹھ آدمی ننگی تلواریں لیے آ موجود ہوئے۔ پرتاپ رائے نے جے رام کو چلنے کا اشارہ کیا، جے رام ننگی تلواروں کے سائے میں پرتاپ رائے کے آگے چل دیا۔

اودھے سنگھ جے رام کی تقریر کے دوران میں یہ مسوس کر رہا تھا کہ ایک سر پھرا نوجوان اُس کے اپنے خیالات کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اُس نے کہا۔ ”اَن داتا! اگر مجھے اجازت ہو تو کُچھ عرض کروں۔“

راجہ نے جواب دیا۔ ”تمہارے کہنے کی ضرورت نہیں۔ ہم اِسے ایسی سزا دیں گے جو برہمن آباد کے لوگوں کو دیر تک نہ بھولے۔“

اودھے سنگھ نے کہا۔ ”لیکن مہاراج! میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اِس نے جو کُچھ کہا ہے نیک نیّتی سے کہا ہے۔ ہمیں چند ہاتھیوں اور جواہرات کے لیے عربوں کے ساتھ دُشمنی مول نہیں لینی چاہیے۔ ہمیں اپنی طاقت پر بھروسہ ہے لیکن عرب نہایت سخت جان دُشمن ہیں۔“

راجہ نے کہا۔ ”اودھے سنگھ! ایک گیدڑ کی چیخیں سُن کر تُم بھی گیدڑ بن

گئے۔ یہ عرب اونٹنیوں کا دودھ پینے والے اور جَو کی روکھی سوکھی روٹی کھانے والے، مُقابلے کی جرأت کریں گے؟“

”مہاراج! وہ اونٹنیوں کا دودھ پی کر شیروں سے لڑتے ہیں۔ جَو کی روٹی کھا کر پہاڑوں سے ٹکراتے ہیں۔“

”کیا خیال ہے کہ وہ اونٹوں پر چڑھ کر ہمارے ہاتھیوں کے مُقابلے کے لیے آئیں گے؟“

”اَن داتا بُرا نہ مانئے، اُن کے اونٹ ایران کے ہاتھیوں کو شکست دے چُکے ہیں۔“

راجہ نے غصّے میں آکر کہا۔ ”اودھے سنگھ! مُجھے تُم سے یہ اُمّید نہ تھی کہ تم عرب کے متعلّق سُنی سُنائی باتوں سے مرعوب ہو جاؤ گے۔ ہم عرب کی ساری آبادی سے زیادہ سپاہی میدان میں لا سکتے ہیں۔ راجپوتانہ کے تمام راجہ ہمارے اشارے پر گردنیں کٹوانے کے لیے تیّار ہوں گے۔“

اودھے سنگھ نے کہا۔ ”مہاراج! مُجھے اُن کا خوف نہیں لیکن میں یہ عرض

کرتا ہوں کہ ہمیں سوئے ہوئے فتنے کو جگانے سے کوئی فائدہ یہ ہو گا۔ دوسروں کی مدد کے بھروسے پر ایک طاقتور دُشمن سے لڑائی مول لینا ٹھیک نہیں۔"

"اودھے سنگھ! تُم بار بار کیا کہہ رہے ہو، سندھ کے سامنے عرب کے صحرائی ایک طاقتور دُشمن کی حیثیت ہرگز نہیں رکھتے۔ آخر عربوں میں کیا خوبی ہے جو ہمارے ساہیوں میں نہیں۔"

"مہاراج!۔ ایسے دُشمن کا کوئی علاج نہیں جو موت سے نہ ڈرتا ہو۔ اگر آپ کو مُجھ پر یقین نہ ہو تو آپ قیدیوں میں سے ایک عرب کو لا کر اُس کا امتحان لیں۔ تلواریں اُن کے کھلونے ہیں۔"

راجہ نے اودھے سنگھ کی طرف دیکھا اور کہا۔ "کیوں بھیم سنگھ؟ تمہارا بھی یہی خیال ہے کہ ہمارے سپاہی عربوں کے مقابلے میں کمزور ہیں۔"

بھیم سنگھ نے جواب دیا۔ "مہاراج پتاجی عربوں کے ساتھ پُر امن رہنے میں بھلائی سمجھتے ہیں ورنہ ہم نے بھی تلواروں کے سائے میں پرورش پائی

ہے، اگر عرب موت سے نہیں ڈرتے تو ہمیں مارنے سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے۔“

راجہ نے کہا۔ ”شاباش! دیکھا اودھے سنگھ۔ تمہارا بیٹا تُم سے بہادر ہے۔“

اودھے سنگھ نے جواب دیا۔ ”مہاراج کے مُنہ سے یہ سُن کر مُجھے خوش ہونا چاہیے لیکن سیناپتی کے فرائض کا احساس مُجھے مجبور کرتا ہے کہ میں مہاراج کے سامنے آنے والے خطرات کو گھٹا کر پیش نہ کروں۔ بھیم سنگھ ابھی بچّہ ہے۔ اُس نے عربوں کو لڑتے ہوئے نہیں دیکھا۔ لیکن میں مکران کی جنگ میں یہ دیکھ چُکا ہوں کہ عام عرب سپاہی ہمارے بڑے سے بڑے پہلوان کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ مکران پر عربوں نے کل چھ سو سواروں کے ساتھ حملہ کیا تھا اور راجہ کے چار ہزار سپاہیوں کو تِنکوں کی طرح بہا لے گئے تھے۔ جے رام کو آپ دیر سے جانتے ہیں۔ ہمارے نوجوانوں میں اُس سے بڑھ کر تلوار کا دھنی اور کوئی نہیں۔ اگر وہ عربوں سے اس قدر مرعوب ہے تو اُس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ بُزدل یا مہاراج کا نمک حرام ہے۔ اُس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ عربوں سے بگاڑ کے

خطرے کا صحیح اندازہ کر چُکا ہے۔“

راجہ نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”تم میرے سیناپتی ہو، وزیر نہیں اور میں اِن معاملات میں تمہاری سمجھ سے کام نہیں لینا چاہتا۔ اگر بڑھاپے میں تمہاری ہمّت جواب دے چُکی ہے تو تو تمہیں اِس عہدہ سے سبکدوش کیا جا سکتا ہے اور تمہیں یہ بھی حق نہیں کہ تُم جے رام جیسے سرکش، گُستاخ اور بُزدل کی سفارش کرو۔ وہ جو کُچھ ہمارے سامنے کہ چکا ہے وہ اسے بڑی سے بڑی سزا دینے کے لیے کافی ہے۔“

اودھے سنگھ راجہ کے تیور دیکھ کر سہم گیا۔ اُس نے کہا۔ ”مہاراج میں معافی چاہتا ہوں۔ آپ کو میرے متعلّق غلَط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے اتنی باتیں کرنے کی جرأت اِس لیے کی کہ ابھی تک آپ نے عرب کے خلاف اعلانِ جنگ نہیں کیا۔ اگر آپ اعلانِ جنگ کر چکے ہوں تو میرا فرض ہے اور صرف میرا ہی فرض نہیں بلکہ ہر سپاہی کا یہ فرض ہے کہ آپ کی فتح کے لیے اپنی جان قربان کر دے۔ جے رام کی گستاخی کا مُجھے افسوس ہے لیکن میں آپ کو یقین دِلاتا ہوں کہ وقت آنے پر وہ بھی ایک

وفادار راجپوت ثابت ہو گا۔ اگر آپ عربوں کے ساتھ جنگ کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں تو ہمیں آج ہی تیّاری شروع کر دینی چاہیے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم عربوں کو ایسی شکست دیں کہ وہ پھر سر اُٹھانے کے قابل نہ ہو سکیں۔ اس مقصد کے لیے ہمیں افواج منظّم کرنے کے علاوہ شمالی و جنوبی ہندوستان کے تمام چھوٹے اور بڑے راجوں کا تعاون حاصل کرنا چاہیے۔ وہ سب آپ کا لوہا مانتے ہیں اور آپ کے جھنڈے تلے جمع ہو کر لڑنا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھیں گے۔ ہمیں کاٹھیاواڑ کے راجہ کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اُس نے آپ کو تحائف نہیں بھیجے، خراج بھیجا ہے۔ اگر آپ جے رام کا جُرم معاف کر دیں تو اُس کی وساطت سے جنگ میں بھی مہاراجہ کاٹھیاواڑ کا تعاون حاصل کیا جا سکتا ہے۔"

راجہ نے قدرے مطمئن ہو کر کہا۔ ”اب تُم ایک راجپوت کی طرح بول رہے ہو۔ لیکن جے رام عربوں کے ساتھ مل چکا ہے۔ اگر اُسے معاف بھی کر دیا جائے تو اُس بات کا کیا ثبوت ہے کہ وہ ہمارے ساتھ دھوکا نہیں کرے گا۔ ہاں میں نے سُنا ہے کہ وہ ایک عرب نوجوان کی دوستی کا دَم

بھرتا ہے۔ اگر وہ اُس کے ساتھ لڑنے کے لیے تیّار ہو جائے اور اُسے تلوار کے مُقابلے میں مغلوب کر کے تو میں اُسے چھوڑ دوں گا۔“

”مہاراج وہ آپ کا اشارہ پا کر پہاڑ کے ساتھ ٹکر لگانے کے لیے بھی تیّار ہو گا۔“

”بہت اچھّا ہم تمہاری سفارش پر اُسے موقع دیں گے۔ کل ہم جے رام کی نیک نیّتی کے علاوہ تلوار چلانے میں ایک عرب کی مہارت بھی دیکھ لیں گے۔“

راجہ نے اِس کے بعد مجلس برخاست کی اور اُٹھ کر محل کے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

(۳)

اگلے دِن راجہ داہر نے برہمن آباد کے محل کے ایک کشادہ کمرے میں دربار منعقد کیا۔ سندھ کے دارالحکومت اَروَر سے اُس کا وزیر بھی برہمن آباد پہنچ چکا تھا۔ وزیر سیناپتی اور برہمن آباد کے امرا حسبِ مراتب تخت

کے قریب کرسیوں پر رونق افروز تھے۔ وزیر اور سیناپتی کے بعد تیسری کرسی جس پر پہلے برہمن آباد کا گورنر بیٹھتا تھا، اب دیبل کے گورنر کو دی گئی تھی اور برہمن آباد کا گورنر راجہ سے چند بالشت دور ہو جانے پر یہ محسوس کر رہا تھا کہ قدرت نے راجہ اور اُس کے درمیان پہاڑ کھڑے کر دیے ہیں۔ راجہ کے بائیں ہاتھ پانچویں کرسی پر بھیم سنگھ براجمان تھا۔ باقی امرا بائیں طرف دوسری قطار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کرسیوں کے پیچھے پندرہ بیس عہدے دار دائیں بائیں دو قطاروں میں کھڑے تھے۔ تخت پر راجہ کے دائیں اور بائیں دو رانیاں رونق افروز تھیں۔ ایک حسین و جمیل لڑکی راجہ کے پیچھے صراحی اور جام لیے کھڑی تھی۔ درباری شاعر نے مترنّم آواز میں راجہ کی تعریف میں چند اشعار پڑھے۔ اِس کے بعد کُچھ دیر رقص و سرود کی محفل گرم رہی۔ راجہ نے شراب کے چند جام پیے اور قیدیوں کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ سپاہی زبیر کو پابہ زنجیر دربار میں لے آئے۔ اُس کے تھوڑی دیر بعد جے رام داخل ہوا۔ زبیر کی طرح اُس کے ہاتھوں اور پاؤں میں زنجیریں نہ تھیں لیکن اُس کے آگے پیچھے ننگی تلواروں کا پہرہ زبیر کو یقین دِلانے کے لیے کافی تھا کہ اُس کی حالت اُس

سے مختلف نہیں۔

راجہ نے پرتاپ رائے کی طرف دیکھا۔ ”یہ ہماری زبان جانتا ہے؟“

اُس نے اُٹھ کر جواب دیا۔ ”جی مہاراج! یہ اجنبی زبانیں سیکھنے میں بہت ہوشیار معلوم ہوتا ہے۔“

راجہ نے زبیر کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

”زبیر!“ اُس نے جواب دیا۔

راجہ نے کہا۔ ”ہم نے سُنا ہے کہ تُم ہم سے بات کرنے کے لیے بہت بے چین تھے۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ دیبل کی بندرگاہ پر ہمارے جہاز کیوں لوٹے گئے اور ہمیں قیدی بنا کر ہمارے ساتھ یہ وحشیانہ سلوک کیوں کیا جا رہا ہے؟“

راج نے قدرے بے چین ہو کر جواب دیا۔ ”نوجوان! ہم پہلے سُن چکے

ہیں کہ عربوں کو بات کرنے کا سلیقہ نہیں لیکن تمہیں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی خاطر ذرا ہوش سے کام لینا چاہیے۔"

زبیر نے کہا۔ "ہمارے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے، اگر آپ کو اِس کا علم نہیں تو یہ اور بات ہے، ورنہ یہ حقیقت ہے کہ دیبل کے گورنر نے بغیر کسی وجہ کے ہم پر دست درازی کی۔ اگر آپ کو ہمارے متعلّق کوئی غلَط فہمی ہو تو ہم اُسے دور کرنے کے لیے تیّار ہیں لیکن اگر سندھ کی طرف سے یہ قدم ہماری غیرت کا امتحان لینے کی نیّت سے اُٹھایا گیا ہے، تو ہم والئ سندھ کو یہ یقین دِلاتے ہیں کہ ہم ہندوستان کے اچھوت نہیں جن کی فریاد اُن کے گلے سے باہر نہیں آ سکتی۔ آج تک ہمارے ساتھ ایسا سلوک کرنے کی جرأت کسی نے نہیں کی اور سندھ کی سلطنت کو میں ایسی سلطنت نہیں سمجھتا، جو ایران کی زرہیں اور روما کے خُود کاٹنے والی شمشیروں کی ضرب برداشت کر سکے۔ وہ قوم جو روئے زمین کے ہر مظلوم کی داد رسی اپنا فرض سمجھتی ہے۔ اپنی بہو بیٹیوں کی بے عزّتی پر خاموش نہیں بیٹھے گی۔"

راجہ نے وزیر کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ "سنو ایک قیدی ہمارے خلاف

اعلانِ جنگ کر رہا ہے۔"

وزیر نے جواب دیا۔ "مہاراج! یہ عرب بہت باتونی ہیں۔ ایران اور روم کی فتوحات نے اُنہیں مغرور بنا دیا ہے۔ لیکن اُنہیں سندھ کے شیروں سے واسطہ نہیں پڑا۔" زبیر نے جواب دیا۔ "ہم نے دیبل میں شیروں کی شجاعت نہیں دیکھی، لومڑیوں کی مکّاری دیکھی ہے۔"

زبیر کے اِن الفاظ کے بعد تمام درباری ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ اودھے سنگھ موقع کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے اُٹھا اور ہاتھ باندھ کر کہنے لگا۔ "مہاراج! چند دِن قید میں رہ کر یہ نوجوان اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا ہے اور پھر آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ جس سپاہی کی تلوار کُند ہو اُس کی زبان بہت تیز ہوتی ہے۔"

زبیر غصّے کی حالت میں اودھے سنگھ کی دوستانہ مداخلت کا مطلب نہ سمجھ سکا اور بولا۔ "مُجھ پر پیچھے سے وار کیا گیا ہے، ورنہ میری تلوار کے متعلّق تمہاری یہ رائے نہ ہوتی۔"

پرتاپ رائے نے اُٹھ کر کہا۔ ”مہاراج! یہ جھوٹ کہتا ہے۔ ہم نے اِسے لڑ کر گرفتار کیا تھا۔“

زبیر نے غصّے اور حقارت سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”بزدل آدمی! تُم انسانیت کا ذلیل ترین نمونہ ہو۔ میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں لیکن اِس کے باوجود تمہارے چہرے پر خوف و ہراس کے آثار ظاہر ہیں۔ لومڑی شیر کو پنجرے میں بھی دیکھ کر بدحواس ہے۔ میرا صرف ایک ہاتھ کھول دو اور مُجھے میری تلوار دے دو۔ پھر اِن سب کو میرے اور تمہارے دعوی کی صداقت معلوم ہو جائے گی۔“

پرتاپ رائے پھٹی پھٹی نگاہوں سے حاضرینِ دربار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ برہمن آباد کا گورنر زبیر کی آمد کو تائیدِ غیبی سمجھ رہا تھا۔ اُس نے اُٹھ کر دربار کا سکوت توڑا اور کہا۔ ”مہاراج! یہ کھشتری دھرم کی توہین ہے کہ ایک معمولی عرب بھرے دربار میں سردار پرتاپ رائے کو بُزدلی کا طعنہ دے۔ آپ سردار پرتاپ رائے کو اجازت دیں کہ وہ اِس کا دعویٰ جھوٹ ثابت کر دِکھائیں۔“ اودھے سنگھ کو پرتاپ رائے سے کم نفرت نہ تھی

لیکن وہ جے رام کو راجہ کے عتاب سے بچانا زیادہ ضروری خیال کرتا تھا اور اُسے بچانے کی اُس کے ذہن میں یہی صورت تھی کہ جے رام زبیر کا مُقابلہ کر کے راجہ کے شکوک رفع کر دے کہ وہ عربوں کا دوست ہے۔ اُس نے اُٹھ کر کہا۔ ”مہاراج! برہمن آباد کے حاکم کا خیال درست نہیں۔ سردار پرتاپ رائے کا رُتبہ ایسا نہیں کہ وہ ایک معمولی عرب سے مقابلہ کریں۔ یہ اُن کی توہین ہے۔ اِس نوجوان کی خواہش پوری کرنے کے لیے ہمارے پاس ہزاروں نوجوان موجود ہیں۔ اگر مہاراج کو ناگوار نہ ہو تو آپ جے رام کو یہ ثابت کرنے کا موقع دیں کہ وہ ملیچھ عربوں کا دوست نہیں۔“

راجہ نے جواب دیا۔ ”تم کئی بار جے رام کی سفارش کر چکے ہو لیکن اِس کی باتیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ وہ عربوں سے بہت زیادہ مرغوب ہے۔ کیوں جے رام! تُم اپنی وفاداری کا ثبوت دینے کے لیے تیّار ہو؟“

جے رام نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔ ”مہاراج! میں آپ کے اشارے پر آگ میں کود سکتا ہوں لیکن زبیر میرا مہمان ہے اور میں اِس پر تلوار

نہیں اُٹھا سکتا۔"

دربار میں ایک بار پھر سنّاٹا چھا گیا۔ اودھے سنگھ نے دِل برداشتہ ہو کر جے رام کی طرف دیکھا۔ راجہ نے چلّا کر کہا۔ "اِس گدھے کو میرے سامنے سے لے جاؤ۔ اِس کا مُنہ کالا کر کے پنجرے میں بند کر دو اور شہر کی گلیوں میں پھراؤ۔ کل اِسے مست ہاتھی کے سامنے ڈالا جائے گا۔ اودھے سنگھ تُم نے اِس عرب کے سامنے ہمیں شرمسار کیا اور پرتاپ رائے! تُم چُپ کیوں بیٹھے ہو۔ تُم دیبل میں اسے نیچا دکھا چکے ہو۔ اب تمہاری تلوار نیام سے باہر کیوں نہیں آتی؟ تُم

سب کو سانپ کیوں سونگھ گیا؟"

نوجوان بھیم سنگھ نے اُٹھ کر تلوار بے نیام کی اور کہا۔ "مہاراج! مُجھے اجازت دیجیے۔"

بھیم سنگھ کی دیکھا دیکھی تمام درباریوں نے تلواریں کھینچ لیں۔ سب سے آخر میں پرتاپ رائے نے تلوار نکالی لیکن اُس کی نگاہیں راجہ سے کہہ رہی

تھیں۔

''اَن داتا! میرے حال پر رحم کرو۔'' درباریوں کو راجہ کے اشارے کا منتظر دیکھ کر زبیر نے اپنے ہونٹوں پر ایک حقارت آمیز مُسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ ''بس اب جانے دیجیے! مُجھے یقین ہو گیا ہے کہ اپنے حریف کو پابہٴ زنجیر دیکھ کر آپ کے درباری بُزدل کہلانا پسند نہیں کرتے۔ لیکن قدرت لومڑیوں کے سامنے شیروں کو ہمیشہ باندھ کر پیش نہیں کرتی۔''

بھیم سنگھ نے کہا: ''مہاراج! اِس کی بیڑیاں کھلوا دیجیے۔ میں اِسے ابھی بتا دوں گا کہ شیر کون ہے اور لومڑی کون۔''

(۴)

راجہ کے اشارے پر سپاہیوں نے زبیر کی بیڑیاں اُتار دیں اور اُس کے ہاتھ میں ایک تلوار دے دی گئی۔ لیکن وزیر نے کہا۔ ''مہاراج! آپ کے دربار میں مُقابلہ ٹھیک نہیں۔''

راجہ نے جواب دیا۔ ''ٹھیک کیوں نہیں؟ اِسی دربار میں ہمارے سپاہیوں کو

بُزدلی کا طعنہ دیا گیا ہے اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہیں اِس کا انتقام لیا جائے۔"

"مہاراج! انتقام اِس نوجوان کو لڑنے کا موقع دیے بغیر بھی لیا جا سکتا ہے۔"

راجہ نے جواب دیا۔ "نہیں! ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ عرب تلواریں کس طرح چلاتے ہیں۔" بھیم سنگھ کرسیوں کے درمیان کھلی جگہ میں آ کھڑا ہوا اور اُس نے تلوار کے اِشارے سے زبیر کو سامنے آنے کی دعوت دی۔

زبیر نے راجہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ "اِس نوجوان کے ساتھ مُجھے کوئی دُشمنی نہیں۔ میرا مجرم پرتاپ رائے ہے۔ آپ اِسے قربانی کا بکرا کیوں بناتے ہیں؟"

بھیم سنگھ نے کہا۔ "بُزدل! تُم صرف باتیں کرنا جانتے ہو۔ اگر ہمّت ہے تو سامنے آؤ۔"

"اگر تُم دوسرے کا بوجھ اُٹھانے پر بضد ہو تو تمہاری مرضی۔" یہ کہتے ہوئے زبیر آگے بڑھ کر بھیم سنگھ کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ راجہ کے حکم سے سپاہی تخت اور کرسیوں کے آگے نصف دائرے میں کھڑے ہو گئے۔ اودھے سنگھ نے اُٹھ کر کہا۔ "بیٹا! اوچھا وار نہ کرنا۔ تُم ایک خطرناک دُشمن کے سامنے کھڑے ہو۔"

"پتا جی! آپ فکر نہ کریں، یہ کہتے ہوئے بھیم سنگھ نے یکے بعد دیگرے تین چار وار کر دیے۔ زبیر اس حملے کی غیر متوقّع شدّت سے دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا اور اہلِ دربار نے خوشی کا نعرہ بُلند گیا۔ زبیر کُچھ دیر بھیم سنگھ کے وار روکنے پر اکتفا کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد تماشائی یہ محسوس کرنے لگے کہ حملہ کرنے والے ہاتھ سے حملہ روکنے والا ہاتھ کہیں زیادہ پھُرتیلا ہے۔ اودھے سنگھ پھر چلایا۔ "بیٹا! جوش میں نہ آؤ۔ تلوار کا ٹھنڈا کھلاڑی ہمیشہ خطرناک ہوتا ہے۔"

لیکن زبیر کے چہرے کی پُر سکون مُسکراہٹ نے بھیم سنگھ کو اور زیادہ سیخ پا کر دیا اور وہ اندھا دھند وار کرنے لگا۔ اُسے آپے سے باہر آتا دیکھ کر زبیر

نے یکّے بعد دیگرے چند وار کیے اور بھیم سنگھ کو جارحانہ حملوں سے مدافعت پر مجبور کر دیا۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ بھیم سنگھ کی تلوار بر وقت مدافعت کے لیے نہ اُٹھ سکی لیکن زبیر کی تلوار اُسے گھائل کرنے کی بجائے اُس کے جسم کے کسی حصّے کو چھُونے کے بعد واپس چلی گئی۔ درباری اب محسوس کر رہے تھے کہ وہ جان بوجھ کر بھیم سنگھ کو بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بھیم سنگھ کو خود بھی اُس کی برتری کا احساس ہو چکا تھا لیکن وہ اعترافِ شکست پر موت کو ترجیح دینے کے لیے تیّار تھا۔ پرتاپ رائے بھیم سنگھ کے باپ سے پُرانی رنجشوں کے باوجود انتہائی خلوص سے بھیم سنگھ کی فتح کی دُعائیں کر رہا تھا لیکن بھیم سنگھ کے بازو ڈھیلے پڑ چکے تھے، راجہ اور اہلِ دربار کے چہروں پر مایوسی چھا رہی تھی۔

اودھے سنگھ نے کہا۔ ”مہاراج! بھیم سنگھ اپنی جان دے دے گا لیکن پیچھے نہیں ہٹے گا۔ آپ اِس کی جان بچا سکتے ہیں۔“

بڑی رانی نے اودھے سنگھ کی سفارش کی لیکن چھوٹی رانی نے کہا۔ ”مہاراج! سپاہیوں کو بھیم سنگھ کی مدد کا حکم دینا انصاف نہیں۔ اپنے بیٹے

کے لیے اودھے سنگھ کے خون نے جوش مارا ہے لیکن جب وہ پردیسی دو قدم پیچھے ہٹا تھا، اُس پر کسی کو رحم نہ آیا۔ اگر آپ بچانا چاہتے ہیں تو دونوں کی جان بچایئے۔"

راجہ تذبذب کی حالت میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اچانک زبیر پے در پے چند سخت وار کرنے کے بعد بھیم سنگھ کو چاروں اطراف سے دھکیل کر اُس کی خالی کرسی کے سامنے لے آیا۔ سپاہی جو ننگی تلواریں لیے قطار میں کھڑے تھے۔ اِدھر اُدھر سمٹ گئے۔ بھیم سنگھ لڑکھڑاتا ہوا پیٹھ کے بل کرسی میں گر پڑا۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن زبیر نے اُس کے سینے پر تلوار کی نوک رکھتے ہوئے کہا۔ "تم اگر چند سال اور زندہ رہو تو ایک اچھّے خاصے سپاہی بن سکتے ہو لیکن سر دست تمہاری جگہ یہ کرسی ہے۔"

بھیم سنگھ کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی اور وہ غصّے اور ندامت کی حالت میں اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ راجہ نے سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا لیکن اُن کی تلواریں بُلند ہونے سے پہلے زبیر بھیم سنگھ کی کرسی کے اوپر سے کود کر پرتاپ رائے کے پیچھے جا کھڑا ہوا اور پیشتر اِس کے کہ پرتاپ رائے اپنی

بدحواسی پر قابو پاتا زبیر نے اپنی تلوار کی نوک اُس کی پیٹھ پر رکھتے ہوئے راجہ سے کہا۔ ”اپنے سپاہیوں کو وہیں کھڑا رہنے کا حکم دیجیے، ورنہ میری تلوار اِس مُوذی کے سینے کے پار ہو جائے گی۔“

راجہ کے اشارے پر سپاہی پیچھے ہٹ گئے تو زبیر نے پھر راجہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بے وقوفوں کے بادشاہ! مُجھے تم سے نیک سلوک کی توقع نہیں لیکن میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ جن صلاح کاروں نے تمہیں عرب کے ساتھ لڑائی مول لینے کا مشورہ دیا ہے، وہ تمہارے دوست نہیں۔ جن لوگوں پر تمہیں بھروسہ ہے، وہ سب دیبل کے حاکم کا دِل و دماغ رکھتے ہیں۔ اِس کی طرف دیکھو، یہ وہ بہادر ہے جو کرسی پر بیٹھا ہوا بید مجنوں کی طرح کانپ رہا ہے۔ اب میں تمہارے سامنے اِس شخص سے چند سوالات کرتا ہوں۔ کیوں پرتاپ رائے! تُم نے مُجھے لڑ کر گرفتار کیا تھا یا دوستی کا فریب دے کر جہاز سے بُلایا تھا؟ جواب دو۔ خاموش کیوں ہو! اگر تُم نے جھوٹ بولا تو یاد رکھو، اِن سپاہیوں کی حفاظت سے تم نہیں بچ سکتے۔ بولو۔“ یہ کہتے ہوئے زبیر نے تلوار کو آہستہ سے جنبش دی اور

اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں نے تمہیں جہاز پر سے بُلایا تھا لیکن مہاراج کا یہی حکم تھا کہ تمہیں ہر قیمت پر گرفتار کیا جائے۔“

راجہ نے کہا۔ ”ٹھہرو! پرتاپ رائے نے ہمارے حکم کی تعمیل کی تھی۔ اگر تُم نے اِس کے ساتھ کوئی زیادتی کی تو قیدیوں کے ساتھ وہ سلوک کیا جائے گا جسے تم تصوّر میں بھی برداشت نہ کر سکو گے۔ ابھی ہم نے تمہارے متعلّق کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ ہم خوامخواہ عرب کے ساتھ بگاڑ نہیں چاہتے۔ تمہاری قوم واقعی بہادر ہے لیکن اگر تُم ذرا سمجھ سے کام لو تو مُمکن ہے ہم تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو آزاد کر دیں۔ تمہارے سر پر اس وقت بیس سپاہی کھڑے ہیں۔ تُم زیادہ سے زیادہ ایک کو مار سکو گے لیکن اِس وقت ایک آدمی کے بدلے ہم تمام قیدیوں کو پھانسی دے دیں گے۔ اگر اپنے ساتھیوں کی خیر چاہتے ہو تو تلوار پھینک دو۔“

زبیر نے کہا۔ ”مُجھے تم میں سے کسی پر اعتبار نہیں۔ لیکن میں تمہیں اپنا نفع اور نقصان سوچنے کا آخری موقع دیتا ہوں۔ یاد رکھو! اگر تُم نے میرے ساتھیوں کے ساتھ بد سلوکی کی تو وہ دِن دور نہیں جب تمہارے ہر سپاہی

کے سر پر میرے جیسے سر پھروں کی تلواریں چمک رہی ہوں گی۔ تمھیں اگر جواہرات اور ہاتھیوں کا لالچ ہے تو میں اُن کا مطالبہ نہیں کرتا۔ میں صرف تمھیں درخواست کرتا ہوں کہ تُم مُجھے اور میرے ساتھیوں کو رہا کر دو، خالد اور اُس کی بہن کو ہمارے حوالے کر دو!"

راجہ نے جواب دیا۔ "جب تک تُم تلوار نہیں پھینکتے ہم تمھاری کسی درخواست پر غور کرنے کے لیے تیّار نہیں۔"

زبیر کو راجہ کے متعلّق کوئی خوش فہمی نہ تھی۔ اگر اُسے اپنے ساتھیوں کا خیال نہ آتا تو وہ یقیناً اپنے آپ کو راجہ کے رحم و کرم پر چھوڑنے کی بجائے بہادرانہ موت کو ترجیح دیتا لیکن بیوہ عورتوں اور یتیم بچّوں کے عبرت ناک انجام کے تصوّر نے اُس کا جوش ٹھنڈا کر دیا۔ اُسے ناہید کا خیال آیا اور اُس کے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ مختلف خیالات کے گرداب میں راجہ کے حوصلہ افزا کلمات اُس کے لیے تنکوں کا سہارا ثابت ہوئے اور اُس نے اپنی تلوار تخت کے سامنے پھینک دی۔ راجہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ پرتاپ رائے کی حالت اُس شخص سے مختلف نہ تھی جو بھیانک سپنا دیکھنے کے بعد

نیند سے بیدار ہوا ہو۔ بڑی رانی نے راجہ کے دائیں کان میں کچھ کہا۔
”مہاراج! ایسے لوگوں سے دُشمنی مول لینا ٹھیک نہیں۔“

راجہ نے اشارے سے وزیر کو اپنے پاس بُلایا اور آہستہ سے پوچھا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”مہاراج! مُجھ سے بہتر سوچ سکتے ہیں۔“

راجہ نے کہا۔ ”اگر میں اِسے چھوڑ دوں تو یہ سردار اور میری رعایا مُجھے بُزدل تو خیال نہ کریں گے؟“

”مہاراج! چاند پر تھوکنے سے اپنے مُنہ پر چھینٹے پڑتے ہیں۔ آپ اپنی رعایا کی نظر میں ایک دیوتا ہیں لیکن اب اِن قیدیوں کو چھوڑنا مصلحت کے خلاف ہے۔ عربوں کو یہ جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ سندھ پر حملہ کریں۔ لیکن اِن لوگوں کو اگر اِن کے مُلک میں واپس بھیج دیا گیا تو یہ تمام عرب میں ہمارے خلاف آگ کا طوفان کھڑا کر دیں گے۔ اگر آپ عربوں کے ساتھ جنگ کر کے مکران کا علاقہ کا حاصل کرنے کا ارادہ بدل چُکے ہیں تو

بہتر یہی ہے کہ اِن سب کو آزاد کرنے کی بجائے موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے تاکہ عربوں کے پاس اِس بات کا کوئی ثبوت نہ ہو کہ ہم نے دیبل سے اِن کے جہاز لوٹے ہیں۔ اس سے پہلے ہم ابوالحسن کے معاملے میں مکران کے گورنر کو ٹال چکے ہیں۔ اب بھی اگر کوئی اِن کا پتہ پوچھنے آیا تو اُس کی تسلّی کر دی جائے گی۔"

راجہ نے کہا۔ "تمہیں کس نے بتایا کہ ہم مکران کو فتح کرنے کا ارادہ بدل چکے ہیں۔"

وزیر نے جواب دیا۔ "مہاراج! اگر آپ کا ارادہ نہیں بدلا تو پھر اِن لوگوں سے متعلّق سوچنے کی ضرورت نہیں۔ میرے خیال میں اِس کی کم سے کم سزا یہ ہو سکتی ہے کہ شہر کے کسی چوراہے میں پھانسی دی جائے تاکہ ہمارے لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ عرب عام انسانوں سے مختلف نہیں!"

راجہ نے کہا۔ "میرا بھی یہی خیال ہے لیکن جہاز سے ایک عرب لڑکا اور لڑکی غائب ہو چکے ہیں۔ اگر اُنہوں نے سندھ کی حدود پار کر کے مکران

میں اور عربوں کو یہ خبر پہنچا دی تو مُمکن ہے کہ ہمیں بہت جلد لڑائی کی تیّاری کرنی پڑے۔"

وزیر نے جواب دیا۔ "مہاراج! عرب کی موجودہ حالت مُجھ سے پوشیدہ نہیں۔ ان کی خانہ جنگی کو ختم ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی اور اب اُن کی تمام افواج شمال اور مغرب کے ممالک میں لڑ رہی ہیں۔ ہمارے پاس ایک لاکھ فوج موجود ہے اور ہم ضرورت کے وقت اسی قدر اور سپاہی جمع کر سکتے ہیں۔ پھر راجپوتانے کے تمام راجہ آپ کے باج گزار ہیں۔ وہ آپ کے جھنڈے تلے عربوں سے لڑنا اپنی عزّت سمجھیں گے۔ مُجھے یقین ہے کہ جو عرب سندھ میں آئے گا، واپس نہیں جائے گا۔"

"شاباش! مُجھے تُم سے یہی اُمّید تھی۔ تم آج ہی تیّاری شروع کر دو۔"

راجہ سے کانا پھوسی ختم کرنے کے بعد وزیر اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔ راجہ نے سپاہیوں کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ "اِسے لے جاؤ! آج شام تک ہم اِس کا فیصلہ کر دیں گے۔"

آخری اُمّید

رات کے وقت سونے سے پہلے واسو نے کئی بار نرائن داس سے جے رام کے واپس نہ آنے کی وجہ پوچھی لیکن اُس نے ہر بار یہی جواب دیا کہ شہر میں اُس کے کئی دوست ہیں۔ کسی نے اسے اپنے پاس ٹھہرالیا ہو گا۔ واسو کو جے رام کی ہدایت تھی کہ وہ اُس کے واپس آنے تک نرائن داس کے گھر سے باہر نہ نکلے۔

اگلے دِن بھی اس نے طوعاً و کرہاً جے رام کی اِس ہدایات پر عمل کیا۔ شام سے کُچھ دیر پہلے نرائن داس نے آکر یہ خبر دی کہ جے رام کو ایک عرب

کے ساتھ پنجرے میں بند کر کے شہر میں پھرایا جا رہا ہے اور صُبح سورج نکلنے سے پہلے اُن دونوں کو شہر کے چوراہے میں پھانسی دے دی جائے گی۔ معلوم ہوا ہے کہ اُس نے بھرے دربار میں راجہ کے سامنے گُستاخی کی ہے۔

واسو نے یہ سُنتے ہی شہر کا رُخ کیا۔ لوگ شہر کے ایک پُر رونق چوراہے میں ایک بانس کے پنجرے کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ واسو اپنے مضبوط بازوؤں سے لوگوں کو اِدھر اُدھر ہٹاتا ہوا پنجرے کے قریب پہنچا اور پنجرے کے اندر زبیر اور جے رام کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اُلٹے پاؤں لوٹ آیا، تھوڑی دیر بعد وہ گھوڑے پر سوار ہو کر جنگل کا رُخ کر رہا تھا۔

شہر میں آدھی رات تک چند پہریداروں کے سوا تمام لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ جے رام زبیر کو جنگل میں خالد ناہید اور مایا سے ملاقات کا واقعہ سُنا چکا تھا۔ چند پہرے دار سو چکے تھے اور باقی پنجرے کے قریب بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ زبیر نے موقع پا کر کہا۔ ”وہ رومال کہاں ہے؟“

جے رام نے جواب دیا۔ ”وہ میری کلائی کے ساتھ بندھا ہوا ہے لیکن ہم دونوں کے ہاتھ پیچھے کی طرف بندھے ہوئے ہیں۔ کاش! واسو کو ہماری خبر ہو جاتی۔ زبیر! زبیر!! میں تُم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں!“

”پوچھو!“

”ہمیں سورج نکلنے سے پہلے پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ تمہیں اِس وقت سب سے زیادہ کس بات کا خیال آرہا ہے؟“

”میرے دِل میں صرف ایک خیال ہے اور وہ یہ کہ میں اب تک خُدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خوش کرنے کے لیے دُنیا میں کوئی مفید کام نہیں کر سکا۔“

”تمہیں مرنے کا خوف تو ضرور ہو گا؟“

”ایک مسلمان کے ایمان کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ موت سے نہ ڈرے اور ڈرنے سے فائدہ ہی کیا۔ انسان خواہ کُچھ کرے جو رات قبر میں آئی ہو، قبر ہی میں آئے گی۔ اگر میری زندگی کے دِن پورے ہو چکے ہیں تو میں آنسو

بہا کر انہیں زیادہ نہیں کر سکتا۔ لیکن مجُھے ایک افسوس ہے کہ ایسی موت ایک سپاہی کی شان کے شایاں نہیں۔"

جے رام نے کہا۔ "مجُھے ابھی تک یہ خیال آرہا ہے کہ شاید ہم اِس سزا سے بچ جائیں۔ کبھی میں سوچتا ہوں کہ شاید ابھی بھونچال کے جھٹکے سے یہ شہر مٹّی کا ایک ڈھیر بن جائے گا۔ کبھی مجُھے خیال آتا ہے کہ شاید بھگوان کا کوئی اوتار آسمان سے اُتر کر راجہ سے کہے کہ اِن بے گناہوں کو چھوڑ دو، ورنہ تمہاری خیر نہیں۔ کبھی مجُھے یہ اُمّید سہارا دیتی ہے کہ شاید دریائے سندھ اپنا راستہ چھوڑ کر دیبل کا رُخ کر لے اور لوگ بدحواس ہو کر شہر سے بھاگ نکلیں اور جاتے جاتے ہمیں آزاد کر جائیں۔ تمہیں اِس قسم کا کوئی خیال نہیں آتا؟"

"نہیں! مجُھے ایسے خیالات پریشان نہیں کرتے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اگر خُدا کو میرا زندہ رکھنا منظور ہے تو وہ ہزار طریقوں سے میری جان بچا سکتا ہے اور اگر میری زندگی کے دِن پورے ہو چکے ہیں تو میری کوئی تدبیر مجُھے موت کے پنجے سے نہیں چھڑا سکتی۔"

جے رام نے کہا۔ ”زبیر! کاش میں تمہاری طرح سوچ سکتا۔ لیکن میں جوان ہوں اور ابھی زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ تُم بھی جوان ہو لیکن تمہارے سوچنے کا ڈھنگ مُجھ سے مختلف ہے۔“

زبیر نے کہا۔ ”تُم بھی اگر میری طرح سوچنے کی کوشش کرو تو دِل میں تسکین محسوس کرو گے۔“

جے رام نے جواب دیا۔ ”یہ میرے بس کی بات نہیں۔“

زبیر نے کہا۔ ”جے رام! میری ایک بات مانو گے؟“

”وہ کیا؟“

”صُبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں۔ میری اور تمہاری زندگی کے شاید تھوڑے سانس باقی ہیں۔ میرے دِل پر صرف ایک بوجھ ہے اور اگر تُم چاہو تو میں موت سے پہلے اِس بوجھ کو اپنے دِل سے اُتار سکتا ہوں۔“ جے رام نے کہا۔ ”میں اِس پنجرے میں تمہارے لیے جو کُچھ کر سکتا ہوں اُس کے لیے تیّار ہوں۔“

”جے رام! ہم نے زندگی کی چند منازل ایک دوسرے کے ساتھ طے کی ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ مرنے کے بعد ہمارے راستے مختلف ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تُم مسلمان ہو جاؤ۔ اگر تُم اِس وقت بھی کلمۂ توحید پڑھ لو تو میری گزشتہ کوتاہیوں کی تلافی ہو جائے گی۔ اب اتنا وقت نہیں کہ میں تمہیں اسلام کی تمام خوبیوں سے آگاہ کر سکوں۔ کاش! میں جہاز پر اِس ذمّہ داری کو محسوس کرتا۔ لیکن اگر تُم میری باتوں پر توجّہ دو تو مُجھے یقین ہے کہ تُم جیسے نیک دِل اور صداقت پسند دوست آدمی کو صحیح راہ دِکھانے کے لیے ایک لمبے عرصے کی ضرورت نہیں۔“

جے رام نے کہا۔ ”اگر تمہاری باتیں مُجھے موت کے خوف سے نجات دِلا سکتی ہیں تو میں سننے کے لیے تیّار ہوں۔“

زبیر نے کہا۔ ”اسلام انسان کے دِل میں صرف ایک خُدا کا خوف پیدا کرتا ہے اور اُسے ہر خوف سے نجات دِلاتا ہے۔ سنو!“ یہ کہہ کہ زبیر نے نہایت مختصر طور پر اسلام کی تعلیم پر روشنی ڈالی۔ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی کے حالات بیان کیے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی

علیہم اجمعین کی سیرت پر روشنی ڈالنے کے لیے اسلام کی ابتدائی تاریخ کے واقعات بیان کیے۔ اختتام پر زبیر اجنادین، یرموک اور قادسیہ کی جنگوں کے واقعات بیان کر رہا تھا اور جے رام یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ ساری عمر تاریک غار میں بھٹکنے کے بعد ایک ہی جست میں روئے زمین کے بُلند ترین پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ چکا ہے۔ اُس کی آنکھوں میں اُمّید کی روشنی جھلک رہی تھی۔

رات کے تیسرے پہر جے رام برسوں کے اعتقادات کو چھوڑ کر دائرہ اسلام میں داخل ہو چکا تھا۔

زبیر نے پوچھا۔ ”اب بتاؤ تمہارے دِل کا بوجھ ہلکا ہوا ہے یا نہیں؟“

جے رام نے کہا۔ ”میرے دِل میں صرف ایک اضطراب باقی ہے اور وہ یہ کہ میں نے موت کی دہلیز پر کھڑے ہو کر اسلام قبول کیا ہے۔ کاش میں چند دِن اور زندہ رہ کر تمہاری طرح نمازیں پڑھتا اور روزے رکھتا۔“

زبیر نے جواب دیا۔ ”ایک مسلمان کو خُدا سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ وہ

سب کُچھ کر سکتا ہے۔"

(۲)

پہرے دار نے کسی کو پنجرے کے قریب آتے دیکھ کر آواز دی۔

"کون ہے؟"

ایک آدمی جواب دیے بغیر پنجرے کے قریب پہنچ کر رُکا۔ چند اور سپاہی اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ پہلے سپاہی نے پھر کہا۔ "جواب نہیں دیتے۔ تُم کون ہو؟"

لیکن اتنی دیر میں چند سپاہی اُسے پہچان چکے تھے اور ایک نے پرانے ساتھی کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "گنواروں کی طرح آوازیں دے رہے ہو اُنہیں پہچانتے نہیں، یہ سردار بھیم سنگھ ہیں۔ مہاراج آپ اس وقت کیسے؟"

"میں قیدیوں کو دیکھنے آیا تھا۔"

دوسرے سپاہی نے کہا۔ ”مہاراج! آپ بے فکر رہیں۔ یہ چند آدمی ابھی سوئے ہیں؟“

بھیم سنگھ نے اُس سے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

اُس نے جواب دیا۔ ”مہاراج! میرا نام سروپ سنگھ ہے۔“ ”تُم بہت ہوشیار آدمی معلوم ہوتے ہو۔ میں برہمن آباد کے حاکم سے سفارش کروں گا کہ تمہیں ترقّی دی جائے؟“

”بھگوان سرکار کا بھلا کرے۔ میرے چار بچّے ہیں۔ آپ کے ہونٹ ہلیں گے اور میرا کام بن جائے گا!“

”تُم فکر نہ کرو۔ ہاں، قیدی سو رہے ہیں؟“

”مہاراج ابھی باتیں کر رہے تھے۔“ یہ کہتے ہوئے اُس نے آگے بڑھ کر پنجرے میں جھانک کر دیکھا اور بولا۔ ”مہاراج! یہ جاگ رہے ہیں!“

”میں جے رام سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں!“

"مہاراج! آپ کو پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟" یہ کہہ کہ سپاہی نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور وہ پنجرے سے ہٹ کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔

بھیم سنگھ نے پنجرے میں جھانکتے ہوئے بُلند آواز میں کہا۔ "جے رام تُم بہت بے وقوف ہو۔" اور پھر اپنا ہاتھ پنجرے میں ڈال کر زبیر کا بازو ٹٹولتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "تُم اپنے ہاتھ میری طرف کرو۔ زبیر نے اپنی پیٹھ پھیر کہ اپنے بندھے ہوئے ہاتھ اُس کی طرف کر دیے۔ بھیم سنگھ نے دوبارہ بُلند آواز میں کہا۔ "نمک حرام! تمہیں راجہ کے سامنے اِس ملیچھ عرب کی دوستی کا دم بھرتے ہوئے شرم نہ آئی۔" اور پھر آہستہ سے کہا۔ "جے رام! میں تمہارے ساتھی کے ہاتھوں کی رسّیاں کاٹ رہا ہوں۔ کُچھ بولو! ورنہ سپاہیوں کو شک پڑ جائے گا۔"

جے رام نے چلّا کر کہا۔ "بھیم سنگھ شرم کرو۔ یہ ایک راجپوت کی شان کے شایاں نہیں کہ وہ کسی کو بے بس دیکھ کر گالیاں دے!"

"میں تمہارے جیسے بُزدل آدمی کو گالیاں دینا اپنی بے عزّتی سمجھتا ہوں۔"

میں صرف یہ پوچھنے کے لیے آیا ہوں کہ تم نے اُس لڑکی اور لڑکے کو کہاں چھپایا ہے؟"

"مجھے اُن کا کوئی عِلم نہیں۔ جاؤ مجھے تنگ نہ کرو۔"

زبیر کے ہاتھ آزاد ہو چُکے تھے۔ بھیم سنگھ نے اُس کے ہاتھ میں خنجر دیتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے لیے اِس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔ تمہارے لیے یہ پنجرہ توڑ کر بھاگ نکلنا مُمکن نہیں لیکن پھر بھی قسمت آزمائی کر دیکھو۔ اگر تُم آزاد نہ بھی ہو سکے تو کم از کم بہادروں کی موت مر سکو گے۔"

سپاہیوں کو مغالطے میں ڈالنے کے لیے بھیم سنگھ نے اپنا لہجہ تبدیل کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ عرب لڑکی کو تُم نے کہیں چھُپا رکھا ہے۔ اچھّا تمہاری مرضی، نہ بتاؤ لیکن یاد رکھو، سورج نکلنے سے پہلے برہمن آباد کے باشندے تمہیں پھانسی کے تختوں پر دیکھ رہے ہوں گے۔"

بھیم سنگھ نے پنجرے سے چند قدم دور جا کر سپاہیوں سے کہا۔ "تُم ایک

طرف کیوں کھڑے ہو۔ مجھے اُن سے کوئی مخفی بات نہیں کرنی تھی۔ ذرا اِس جے رام کو دیکھو، اِس کا غرور ابھی تک نہیں ٹوٹا۔“

سپاہی نے جواب دیا۔ ”مہاراج! اِس کی قسمت بُری تھی۔ ورنہ ہم نے سُنا ہے کہ راجہ اُس کی بہت قدر کرتا تھا۔ مہاراج! شہر کے لوگ کہتے ہیں کہ یہ عرب جادُوگر ہے۔ اِس نے جادُو کی طاقت سے جے رام کو راجہ کا نافرمان بنادیا تھا۔“

بھیم سنگھ نے کہا۔ ”شاید یہی بات ہے۔ مجھے بھی اِس کے پنجرے کے قریب نہیں جانا چاہیے تھا۔“

”نہیں مہاراج! آپ پر اس کے جادُو کا کیا اثر ہو گا۔ پھر بھی آپ گھر جا کر پراتھنا کریں۔“

”تم بہت سمجھ دار ہو۔ میں جاتا ہوں، میرا سر چکرا رہا ہے۔ شاید یہ جادُو کا اثر ہے!“

”مہاراج! اگر حکم ہو تو ہم میں سے کوئی ایک آپ کو گھر چھوڑ آئے؟“

”نہیں! نہیں!! اِس کی ضرورت نہیں۔“

بھیم سنگھ چل دیا تو سپاہی نے پیچھے سے آواز دے کر کہا: ”مہاراج! میرا خیال رکھنا!“

”تُم فکر نہ کرو۔“

”ایشور آپ کا بھلا کرے۔“

”بھیم سنگھ کے چلے جانے کے بعد ایک سپاہی نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ یہ جادُوگر ہے اور تم نہیں مانتے تھے۔ سروپ سنگھ تمہاری خیر نہیں۔ تم کئی بار پنجرے کو ہاتھ لگا چکے ہو۔ اب تک تمہارا سر نہیں چکرایا؟“

”میرا سر؟ ہاں کُچھ بوجھل سا ضرور ہے۔“

”فکر نہ کرو، ابھی چکرانے لگ جائے گا۔“

سروپ سنگھ نے فکر مند سا ہو کر کہا۔ ”لیکن میں نے سُنا ہے کہ جادُوگر کے

مر جانے پر جادُو کا اثر نہیں رہتا۔“

”ایسے جادُو گر مر کر پھر زندہ ہو جاتے ہیں۔“

ایک اور سپاہی بولا۔ ”یار میں نے بھی پنجرے کو ہاتھ لگایا تھا۔ میرا سر بھی چکرا رہا ہے۔“

سروپ سنگھ بولا۔ ”بھگوان ایسے جادُو گر کو غارت کرے۔ اب میرا سر سچ مُچ چکرا رہا ہے!“ ان باتوں کا یہ اثر ہوا کہ سپاہی آٹھ دس قدم ہٹ کر پہرہ دینے لگے۔ زبیر پنجرے کے اندر اپنے پاؤں کی رسّیاں کاٹنے کے بعد جے رام کے ہاتھ پاؤں بھی آزاد کر چُکا تھا اور دونوں پنجرے کی سلاخوں کے ساتھ زور آزمائی کر رہے تھے۔

ایک سپاہی نے چلّا کر کہا۔ ”ارے وہ پنجرے میں کیا کر رہے ہیں۔“

زبیر اور جے رام دُبک کر بیٹھ گئے اور آنکھیں بند کر کے خرّاٹے لینے لگے۔ دو سپاہیوں نے پنجرے کے گرد چکّر لگایا اور مُطمئن ہو کہ اپنے ساتھیوں سے جا ملے۔

جے رام نے آہستہ سے کہا۔ ”زبیر!“

اس نے جواب دیا۔ ”کیا ہے؟“

”یہ سلاخیں بہت مضبوط ہیں۔ قدرت نے ہمارے ساتھ مذاق کیا ہے۔ کیا تمہیں اب بھی چھٹکارا حاصل کرنے کی کوئی اُمّید ہے؟“

”میرا دِل گواہی دیتا ہے کہ خُدا ہماری مدد کرے گا!“

جے رام نے کہا۔ ”برہمن آباد میں سینکڑوں سپاہیوں پر بھیم سنگھ کا اثر ہے۔ شاید وہ آخری وقت پر ہماری مدد کرے۔“

”میں صرف خُدا سے مدد مانگتا ہوں اور تمہیں بھی اُسی کا سہارا لینا چاہیے۔ اگر اُسے ہمارا زندہ رکھنا منظور ہے تو ہم بھیم سنگھ کی مدد کے بغیر بھی رہا ہو جائیں گے۔“

”میں تمہارے ایمان کی پختگی کی داد دیتا ہوں لیکن بُرا نہ ماننا یہ سلاخیں خود بخود ٹوٹنے والی نہیں۔“

زبیر نے کہا۔ ”جے رام! جہاں عقل کے چراغ گُل ہو جاتے ہیں وہاں ایمان کی مشعل کام دیتی ہے۔ تُم ایک ایسے خُدا پر ایمان لا چُکے ہو جس نے ابراہیم علیہ السّلام کے لیے آگ کو گلزار بنا دیا تھا۔“

جے رام کُچھ کہنے والا تھا کہ باہر سے ایک سپاہی چلّایا۔ ”کون ہے؟“

ایک شخص نے چند قدم کے فاصلے سے جواب دیا۔ ”جی میں ماہی گیر ہوں۔“

”یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”جی میں مچھلیاں لایا ہوں۔“

”مچھلیاں! اِس وقت؟“

”جی اب دِن نکلنے والا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ اُنہیں بیچ کر جلدی واپس چلا جاؤں۔ آپ کو کوئی مچھلی چاہیے؟“

ایک سپاہی نے کہا۔ ”سروپ سنگھ! تُم لے لو، تمہارے چار بچّے ہیں۔“

مچھیرے نے کہا۔ ”ہاں سرکار لے لو! بالکل تازہ ہیں۔“

سروپ سنگھ نے جواب دیا۔ ”ہم اِس وقت پیسے باندھ کر تھوڑا بیٹھے ہیں۔ مُفت دینی ہے تو دے جاؤ۔“

”جی! شہر کے عام لوگ بھی ہم سے مُفت چھین لیتے ہیں۔ آپ تو سپاہی ہیں، آپ سے پیسے کون مانگ سکتا ہے؟“

یہ کہتے ہوئے ماہی گیر نے مچھلیوں کی ٹوکری سپاہیوں کے آگے رکھ دی۔

ایک سپاہی نے کہا۔ ”ارے تمہارے پاس تو کافی مچھلیاں ہیں۔ ہمیں بھی دو گے یا نہیں؟“

سروپ سنگھ نے کہا۔ ”نہیں! نہیں! اِس بے چارے پر ظُلم نہ کرو۔ میں تو اِس کا روز کا گاہک ہوں۔ میں مُفت تھوڑا لے رہا ہوں۔ کل پیسے ادا کر دوں گا۔“

یہ کہتے ہوئے سروپ سنگھ نے ایک مچھلی اُٹھالی اور شرارت آمیز تبسّم کے ساتھ اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا اور اُنہوں نے ہنستے ہوئے آن کی

آن میں تمام ٹوکری خالی کر دی۔

سروپ نے کہا۔ ”لو بھئی! تمہارا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اب کل اِسی جگہ اور اِسی وقت پیسے لے لینا۔“

”بہت اچھّا سرکار!“

پنجرے کے اندر زبیر جے رام سے کہہ رہا تھا۔ ”یہ گنگو ہے لیکن یہ اکیلا کیوں آیا؟“

گنگو نے سپاہیوں سے کہا۔ ”مُجھے الغوزہ بجانا آتا ہے۔ آپ کو سناؤں؟“

سپاہیوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ ”ہاں ہاں سناؤ!“

گنگو نے الغوزے سے چند دِل کش تانیں نکالیں اور اُس کے ساتھی عام شہریوں کے لباس میں مختلف گلیوں سے نکل کر سپاہیوں کے گرد جمع ہونے لگے۔ ایک سپاہی نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”ارے اِس نے تو خواہ مخواہ مچھیرے کا ذلیل پیشہ اختیار کر رکھا ہے۔ یہ تو الغوزہ بجا کر کافی پیسے کما سکتا ہے۔“

گنگو کے ساتھی ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔ ”مُجھے اِس کی تانوں نے گہری نیند سے بیدار کیا ہے اور پھر میرا سونے کو جی نہ چاہا۔۔۔“

”مُجھے وسنتی کی ماں کہتی تھی کہ جاؤ دیکھو کوئی فقیر ہو گا۔“

”ارے میرے محلے کے تمام لوگ حیران ہیں کہ یہ کون ہے؟“ گنگو الغوزہ بجاتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس کے ساتھی اچانک تلواریں سونت کر سپاہیوں پر پل پڑے اور آن کی آن میں اُن کا صفایا کر دیا۔ واسو نے کلہاڑے کی چند ضربوں سے پنجرے کا دروازہ توڑ دیا اور جے رام اور زبیر لپک کر باہر نکل آئے۔

چوک کے آس پاس کی آبادی نے الغوزے کی دِلکش تانوں کے بعد حملہ آوروں اور سپاہیوں کی غیر متوقّع چیخ پُکار سُنی لیکن اپنے گھروں سے باہر نکل کر دیکھنے کی جُرأت نہ کی۔۔۔ زبیر اور جے رام گنگو اور اُس کے ساتھیوں کے ہمراہ بھاگتے ہوئے شہر سے باہر نکلے۔ گنگو کے چند ساتھی ایک باغ میں گھوڑے لیے کھڑے تھے۔ جس وقت شہر میں اِس ہنگامے کا ردِّ عمل شروع ہو رہا تھا یہ لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کر جنگل کا رُخ کر رہے

تھے۔

(۳)

ناہید اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور مایا اُس کے قریب بیٹھ کر آہستہ آہستہ اُس کا سر دبا رہی تھی۔ خالد بے قراری کے ساتھ کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلتا ہوا بستر کے قریب کھڑا ہو کر بولا۔ "ناہید بہت دیر ہو گئی۔ انہیں اِس وقت تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ کاش میں یہاں ٹھہرنے پر مجبور نہ ہوتا۔"

مایا نے خالہ کی طرف دیکھا اور پھر آنکھیں جھکا کر تسلّی آمیز لہجے میں بولی۔ "مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ راجہ داہر اِس قدر ظالم ہو سکتا ہے۔ مُمکن ہے کہ داسو۔۔۔۔!"

خالد نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تمہاری نیک خواہشات بھیڑیے کو انسان نہیں بنا سکتیں"۔

مایا نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں، وہ آجائیں گے۔"

"زبیر پھانسی پر لٹک رہا ہو اور مُجھے فکر نہ ہو۔ کاش! میں گنگو کے ساتھ

ہوتا۔" یہ کہتے ہوئے خالد نے اپنی مُٹھّیاں بھینچ لیں اور ہونٹ کاٹتا ہوا باہر نکل گیا۔مایا دیوی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ناہید کی طرف دیکھنے لگی۔ اور وہ اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر تسلّی دیتے ہوئے بولی۔ "مایا! اُس نے تمھیں تو کُچھ نہیں کہا۔ تُم ذرا ذرا سی بات پر رو پڑتی ہو۔"

مایا نے جواب دیا۔ "آج اِن کے تیور دیکھ کر مجُھے ڈر لگتا ہے۔ اگر وہ ناکام آئے تو کیا ہو گا؟"

ناہید نے کہا۔ "وہ ایک خطرناک مہم پر گئے ہیں اور اُن کی کامیابی اور ناکامی میں ہمارا کوئی دخل نہیں۔"

"اگر گنگو اور اس کے ساتھی بھی لڑائی میں مارے گئے تو آپ اپنے وطن چلے جائیں گے اور میں۔۔۔۔۔۔"

ناہید نے جواب دیا۔ "میری ننھّی بہن! تُم اپنے لیے عرب کی زمین تنگ نہ پاؤ گی۔"

"لیکن خالد آج بات بات پر مُجھ سے بگڑتے ہیں۔ مُمکن ہے کہ وہ مجُھے

یہیں چھوڑ جائیں۔"

"مایا! میرے سامنے خالد نے کوئی ایسی بات نہیں کی۔ ہاں تمہارے بھائی اور زبیر کے متعلّق یہ المناک خبر ملنے کے بعد وہ کُچھ بے قرار سا ہے۔ خُدا کرے وہ زندہ بچ کر آجائیں تو پھر خالد کے چہرے پر تمام عمر مُسکراہٹیں دیکھا کرو گی۔" خالد کی مُسکراہٹوں کا ذکر مایا کو تھوڑی دیر کے لیے تصوّرات کی حسین دُنیا میں لے گیا۔ اُسے یہ اُجڑی ہوئی دُنیا مہکتے ہوئے پھولوں کی ایک کیاری دِکھائی دینے لگی۔ وہ پھولوں سے کھیل رہی تھی۔ مہکتی ہوئی ہوا کے جھونکوں سے سرشار ہو رہی تھی۔ چڑیوں کے چہچہے سُن رہی تھی۔ وہ ایک عورت تھی جسے محبّت تنکوں کا سہارا لینا اور اُمّید دریا کے کنارے مٹّی کے گھروندے بنانا سکھاتی ہے لیکن ایک خیال بادِ سموم کے تیز جھونکے کی طرح آیا اور مایا کے دامنِ اُمّید میں مہکتے ہوئے پھول مرجھا گئے۔ تصوّر کی نگاہیں عرب کے ریگ زاروں اور نخلستانوں میں گھومنے کے بعد برہمن آباد کے چوراہے میں اپنے بھائی کو پھانسی کے تختے پر لٹکا ہوا دیکھنے لگیں۔ وہ ایک بہن تھی، ایسی بہن جو اپنے گھر میں مسرّت

کے قہقہے سُننے کے باوجود بھائی کی ایک ہلکی سی آہ پر چونک اُٹھتی ہے۔ مایا نے اپنے دِل میں کہا۔ ”بھیّا! میرے بھیّا! خُدا تمہیں واپس لائے۔ تمہارے بغیر مُجھے کسی کی مُسکراہٹ خوش نہیں کر سکتی۔“

ناہید نے اُس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مایا تمہیں واقعی خالد سے اِس قدر محبّت ہے۔“

مایا نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا اور دوپٹے میں اپنا چہرہ چھپا کر ہچکیاں لینے لگی۔

ناہید نے پھر کہا۔ ”مایا معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں مُجھ پر اعتبار نہیں آتا۔ میں خالد کو جانتی ہوں۔ وہ۔۔۔۔“

مایا نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”نہیں نہیں، میں اپنے بھائی کے متعلّق سوچ رہی ہوں۔“ قلعے کا ایک پہرے دار بھاگتا ہوا آیا۔ ناہید نے اپنا چہرہ دوپٹے میں چھُپا لیا اور اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

پہرے دار نے کہا۔ ”خالد گھوڑے پر زین ڈال رہے ہیں۔ وہ میرا کہا نہیں

مانتے۔ اُنہیں برہمن آباد کا راستہ بھی معلوم نہیں۔ اگر کوئی حادثہ پیش آ گیا تو گنگو مُجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ آپ اُنہیں منع کریں۔"

ایک لمحہ کے لیے مایا کا دِل بیٹھ گیا۔ پھر زور زور سے دھڑکنے لگا، وہ اُٹھی اور بے تحاشا بھاگتی ہوئی قلعے سے باہر نکل آئی۔ اُس کا دِل یہ کہہ رہا تھا۔ "خالد مت جاؤ! مت جاؤ! میں بھائی کا غم برداشت کر سکتی ہوں لیکن تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ خالد مُجھ پر رحم کرو۔ خالد! خالد!"

قلعے سے باہر خالد گھوڑے کی لگام تھام کر اپنا ایک پاؤں رکاب میں رکھ چکا تھا۔ مایا نے بھاگتے ہوئے آواز دی۔ "ٹھہرو! خُدا کے لیے ٹھہرو! اکیلے مت جاؤ! میں تمہارے ساتھ ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔

خالد نے اپنا پاؤں رکاب سے نکال لیا اور پریشان سا ہو کر مایا کی طرف دیکھنے لگا۔ اتنی دیر میں ناہید بھی باہر آ چُکی تھی۔ مایا ناہید کی طرف متوجّہ ہو کر بولی۔ "بہن اُنہیں روکو! یہ موت کے مُنہ میں جا رہے ہیں۔ بھگوان کے لیے! خُدا کے لیے! اُنہیں روکو!"

ناہید نے اُن کے قریب پہنچ کر کہا۔ ”خالد! اگر تمہارے جانے میں کوئی مصلحت ہوتی تو میں اِس بے کسی کے باوجود تمہارا راستہ نہ روکتی۔ تم اکیلے شہر میں راجہ کے تمام لشکر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تمہیں گنگو کا انتظار کرنا چاہیے۔ وہ ضرور آئے گا۔ اگر وہ نہ آیا تو اُس کا کوئی نہ کوئی ساتھی ضرور آئے گا۔ بے شک تم بہادر ہو لیکن ایسے موقع پر صبر سے کام لینا ہی بہادری ہے۔“

خالد نے جواب دیا۔ ”آپا تمہیں بخار ہے۔ تُم جا کر آرام کرو۔ میں صرف اُن کی راہ دیکھنے جا رہا ہوں۔ یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں دور نہیں جاؤں گا۔“

مایا نے کہا۔ ”نہیں! نہیں! انہیں اُنہیں مت جانے دو۔ یہ واپس نہیں آئیں گے۔“

خالد نے کہا۔ ”مایا ممکن ہے کہ راجہ کے سپاہی اُن کا تعاقب کر رہے ہوں۔ اُن کی مدد میرا فرض ہے۔ تُم اپنے بھائی کا خیال کرو!“

مایا نے جواب دیا۔ ”میرا بھائی اگر خطرے میں ہے تو آپ اس کی مدد نہیں

کر سکتے۔"

خالد کُچھ کہنا چاہتا تھا لیکن دور سے ایک شخص جو درخت پر چڑھ کر پہرہ دے رہا تھا چلّایا۔ "وہ آرہے ہیں۔" اور معاً جنگل میں گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سُنائی دی۔ ایک اور پہرے دار بھاگتا ہوا آیا اور بولا۔ "شاید دُشمن اُن کا پیچھا کر رہے ہوں۔ تُم قلعے کے تہہ خانے میں چھُپ جاؤ۔"

خالد نے اطمینان سے جواب دیا۔ "چھپنے کی ضرورت نہیں۔ اگر سپاہی اُن کے تعاقب میں ہوتے تو وہ اِس طرف نہ آتے لیکن یہ تو بہت تھوڑے گھوڑے معلوم ہوتے ہیں۔ خُدا خیر کرے۔"

گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز قریب آرہی تھی اور خالد نے دوسری بار چونک کر کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ صرف چار گھوڑے واپس آئے ہیں۔"

گھوڑوں کی آمد کی خبر پا کر ناہید نے اپنے دِل میں ایک زبردست دھڑکن محسوس کی اور جب خالد نے یہ کہا کہ صرف چار گھوڑوں کی ٹاپ سُنائی دے رہی ہے تو اُمّید کے چراغ روشن ہو کر اچانک بُجھ گئے۔ اُس کی

حالت غم و اندوہ کے بحرِ بیکراں میں ٹوٹی ہوئی کشتی کے اِس ملّاح سے مختلف نہ تھی جو اُٹھتی ہوئی لہر کو ساحل سمجھنے کا دھوکا کھا چکا ہو۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ تقدیر آخری بار اُمّید کا دامن اُس کے ہاتھوں سے چھین رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک گھوڑا جھاڑیوں کے عقب سے نمودار ہوا۔ سوار نے قریب پہنچ کر باگیں کھینچ لیں اور گھوڑے سے کود کر مایا کی طرف بڑھا۔ مایا "بھیّا! میرا بھیّا!" کہتی ہوئی بھاگ کر اُس کے ساتھ لپٹ گئی۔ ناہید اور خالد کی نگاہیں جھاڑیوں کی طرف تھیں۔ جے رام کو دیکھ کر ناہید زبیر کے متعلّق پھر ایک بار اُمّیدوں کے چراغ روشن کر رہی تھی۔ جے رام کے بعد واسو اور اُس کے پیچھے گنگو اور زبیر جھاڑیوں کے عقب سے نمودار ہوئے۔ زبیر کو دیکھ کر ناہید جھجکتی ہوئی دو تین قدم آگے بڑھی۔ زبیر اُس کے قریب پہنچ کر گھوڑے سے اُترا۔ خالد بھاگ کر اُس سے لپٹ گیا۔ ناہید نے چاہا کہ بھاگ کر اپنے کمرے میں پہنچ جائے لیکن اُس نے محسوس کیا کہ اُس کے پاؤں زمین میں پیوست ہو چکے ہیں۔ اُس کے اعضا میں رعشہ تھا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ مہینوں کے تھکے ہوئے مسافر کی طرح منزل کو اچانک اپنے قریب دیکھ کر اس کی ہمّت جواب

دے چکی تھی۔

زبیر خالد سے علیحدہ ہو کر آگے بڑھا اور بولا۔ ”ناہید! اب تم اچھّی ہو نا؟“

وہ جواب دینے کی بجائے اپنے چہرے کا نقاب درست کرنے لگی۔

زبیر نے پھر کہا۔ ”ناہید! تمہارا زخم کیسا ہے؟“

ناہید کے ہونٹ کپکپائے۔ اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”خُدا کا شکر ہے کہ آپ آ گئے۔ میں ٹھیک ہوں۔“ اُس کے آخری الفاظ ایک گہری سانس میں ڈوب کر رہ گئے اور وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑی۔

(۴)

جب اُسے ہوش آیا تو وہ اپنے کمرے میں بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ خالد اور مایا کے مغموم چہرے دیکھنے کے بعد اُس کی نگاہیں زبیر پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ مُرجھائے ہوئے چہرے پر اچانک حیا کی سُرخی چھا گئی اور وہ اپنے چہرے پر نقاب ڈالتے ہوئے اُٹھ بیٹھی۔ گنگو اور جے رام دروازے سے باہر کھڑے تھے۔ خالد نے اُن کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ ”ناہید کو ہوش آ

گیا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔"

زبیر نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "ناہید! اب ہماری مُصیبت ختم ہونے والی ہے۔ میں آج ہی جارہا ہوں؟"

مایا ایک عورت کی ذکاوتِ حس سے زبیر کے متعلّق ناہید کے جذبات کا اندازہ لگا چکی تھی۔ اُس نے جلدی سے کہا۔ "نہیں آپ یہیں ٹھہریں۔ اِس وقت سارے سندھ میں آپ کی تلاش ہورہی ہوگی۔"

زبیر نے جواب دیا۔ "میرے لیے سندھ کی سرحد پار کرنے کا یہی ایک موقع ہے۔ کل تک تمام راستوں کی چوکیوں کو ہمارے فرار ہونے کی اِطّلاع مل جائے گی۔ ہمارے باقی ساتھی راجہ کے سپاہیوں کو چکمہ دینے کے لیے مشرق کے صحرا کا رُخ کررہے ہیں۔ میں اِس موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہوں۔ خالد تُم یہیں رہوگے۔ اگر اِس جگہ کوئی خطرہ پیش آیا تو گنگو تُمھیں کسی محفوظ مقام پر لے جائے گا۔ عرب سے ہماری افواج کی آمد تک اگر ناہید گھوڑے پر چڑھنے کے قابل ہوگئی تو گنگو تمھیں مکران پہنچادے گا؟"

ناہید نے کہا۔ ”جب تک میری بہنیں قید میں ہیں۔ میں یہیں رہنا پسند کروں گی۔ خُدا آپ کو جلد واپس لائے! ہم آپ کا انتظار کریں گے۔ میرا خط آپ کو مل گیا ہو گا۔ آپ فوراً روانہ ہو جائیں۔ واپس آنے میں دیر نہ کریں۔ہاں میں علی کا حال پوچھنا چاہتی ہوں۔“

”علی آپ کو بہت یاد کرتا ہے۔ دیبل کے گورنر نے اُسے بہت اذیّت دی، لیکن وہ ایک بہادر لڑکا ہے۔ وہ خواہ کیسی حالت میں ہو، نماز کے وقت اذان ضرور دیتا ہے۔ یہ لوگ اذان سے بہت گھبراتے ہیں۔ اُسے بارہا کوڑوں کی سزا دی جا چکی ہے لیکن اُس کے استقلال میں کوئی فرق نہیں آیا۔ برہمن آباد کے قید خانے میں بھی اُس کا یہی حال ہے۔ راجہ کے سپاہی اُسے زبان کاٹ ڈالنے کی دھمکی دے چکے ہیں لیکن اُس کا ارادہ متزلزل نہیں ہوا۔“

ناہید نے کہا۔ ”یہ آپ کی صحبت کا اثر ہے۔ ورنہ وہ اتنے مضبوط دِل کا مالک نہ تھا۔ سراندیپ میں اُسے ایک کمزور لڑکا سمجھا جاتا تھا۔“

زبیر نے جواب دیا۔ ”انسان کے عیوب و محاسن صرف خطرے کے وقت

ظاہر ہوتے ہیں۔‘‘

دروازے پر سے گنگو نے آواز دی۔ ’’اب دوپہر ہونے والی ہے۔ آپ کو دیر نہیں کرنی چاہیے۔‘‘

ناہید نے کہا۔ ’’آپ جائیں! خُدا آپ کی مدد کرے لیکن آپ کو مکران تک خُشکی کا راستہ معلوم ہے؟‘‘

زبیر نے جواب دیا۔ ’’واسو میرے ساتھ جا رہا ہے اور وہ تمام راستوں سے واقف ہے۔ میں مکران کی سرحد پر پہنچ کر اُسے واپس بھیج دوں گا؟‘‘

مایا نے کہا۔ ’’لیکن اِس لباس میں آپ فوراً پہچانے جائیں گے۔‘‘

زبیر نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا ’’میری ننّھی بہن کو میرا بہت خیال ہے لیکن اُسے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں ایک سندھی کا لباس پہن کر جا رہا ہوں۔ اور اب تو میں سندھ کی زبان بھی سیکھ چکا ہوں۔ کوئی مُجھ پر شک نہیں کرے گا۔‘‘

مایا نے کہا۔ ’’آپ مُجھے بہن کہہ کہ بہت سی ذمّہ داریاں اپنے سر لے رہے

ہیں۔ یاد رکھیے، ہمارے ملک میں دھرم کے بہن بھائیوں کا رشتہ سگے بہن بھائیوں کے رشتے سے کم مضبوط نہیں ہوتا۔ اگر آپ مُجھے اپنی بہن کہتے ہیں تو ہفتوں کا سفر دِنوں میں طے کیجیے۔ ہماری مُصیبت آپ کے ساتھیوں کی مُصیبت سے کم نہیں۔ وہ میرے بھائی کی تلاش میں سندھ کا کونہ کونہ چھان ماریں گے۔ مُجھے ڈر ہے کہ آپ کی افواج کے آنے سے مایوس ہو کر کہیں میرا بھائی کاٹھیاواڑ کی طرف فرار ہونے پر آمادہ نہ ہو جائے؟"

جے رام نے باہر سے بُلند آواز میں کہا۔ "مایا کیا کہتی ہو۔ میں ایک راجپوت ہوں۔ نہیں، بلکہ ایک مسلمان بھی ہوں۔ میں اپنے محسنوں کو چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہوں؟"

"مسلمان؟ میرا بھائی ایک مسلمان؟" مایا یہ کہتی ہوئی ناہید کی چارپائی سے اُٹھ کر بھاگی اور باہر نکل کر جے رام سے لپٹ گئی۔ اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ "بھیّا! سچ کہو تُم مسلمان ہو گئے؟"

اس نے جواب دیا۔ "مایا! پارس کے ساتھ مس ہو کر لوہا لوہا نہیں رہ سکتا۔

تُم روٹھ تو نہ جاؤ گی؟"

"میں۔۔۔؟" اُس نے الگ ہو کر آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں کیسے روٹھ سکتی ہوں۔ خُدا نے میری دُعائیں سُن لیں۔ میری منّتیں قبول کر لیں۔ بھیّا مبارک ہو۔ لیکن تمہارا اسلامی نام؟"

زبیر نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ "یہ میری کوتاہی ہے۔ اگر تُم پسند کرو تو تمہارے بھائی کا نام ناصر الدّین رکھتا ہوں!"

"اور میرا نام؟"

خالد، زبیر گنگو اور جے رام حیران ہو کر مایا کی طرف دیکھنے لگے۔ مایا نے اپنے سوال کا کوئی جواب نہ پا کر کہا۔ "تُم حیران کیوں ہو۔ ناہید سے پوچھو۔" وہ یہ کہہ کر دہلیز میں کھڑی ہو گئی اور ناہید کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ "ناہید بہن! اُنہیں بتاؤ کیا میں نے تمہارے سامنے کلمہ نہیں پڑھا؟ کیا میں نے چھُپ چھُپ کر تمہارے ساتھ نمازیں نہیں پڑھیں؟ کیا میں نے قرآن کی آیات یاد نہیں کیں۔"

مایا پھر اپنے بھائی کے پاس آ کھڑی ہوئی اور زبیر سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ ”آپ کس سوچ میں پڑ گئے۔ ناہید میرا نام زہرا رکھ چکی ہے اور مُجھے یہ نام پسند ہے۔“

خالد نے اندر آ کر ناہید کے کان میں آہستہ سے کہا۔ ”تُم نے یہ باتیں مُجھ سے کیوں چھپائیں؟“

ناہید نے مُسکرا کر جواب دیا۔ ”مایا کو اس بات کا ڈر تھا کہ آپ یہ خیال کریں گے کہ وہ آپ کو خوش کرنے کے لیے مسلمان ہوئی ہے۔ اُسے اپنے بھائی کا خوف بھی تھا۔ اِس لیے وہ مُجھ سے وعدہ لے چکی تھی کہ میں فی الحال اُس کا راز اپنے تک محدود رکھوں۔“ خالد پھر بھاگتا ہوا جے رام کے قریب آ کھڑا ہوا۔ اُس کی روح مسرّت کے ساتویں آسمان پر تھی۔

زبیر نے کہا۔ ”بھائی ناصر الدّین، بہن زہرا۔ میں تُم دونوں کو مبارک باد دیتا ہوں۔ خُدا تمہیں استقامت بخشے۔“

گنگو نے کہا۔ ”زبیر! اگر ہمارا دل ٹٹول کر دیکھو تو ہم سب مسلمان ہیں

لیکن سب کے لیے نام سوچتے ہوئے تمھیں بہت دیر لگ جائے گی۔ یہ خدمت خالد کے سپرد کر دو۔ اب دوپہر ہو رہی ہے۔ تمھیں شام تک کم از کم یہاں سے تیس کوس نکل جانا چاہیے۔“

زبیر نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں تیّار ہوں۔“

گنگو نے واسو کو آواز دے کر کپڑے لانے کے لیے کہا۔ زہرا پھر ناہید کے پاس آ بیٹھی اور زبیر نے گنگو کی ہدایت کے مطابق ایک سندھی سپاہی کا لباس زیب کیا۔ گنگو نے کہا۔ ”آپ کے لیے گھوڑے تیّار کھڑے ہیں۔“

”میں ابھی آتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ دوبارہ ناہید کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اُس کے پاؤں کی آہٹ سُن کر اپنے چہرے پہ نقاب ڈال چکی تھی۔ زبیر نے کہا۔ ”ناہید! خُدا حافظ۔ بہن زہرا! میرے لیے دُعا کرنا۔“

دونوں نے جواب میں خُدا حافظ کہا اور زبیر لمبے لمبے قدم اُٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔

خالد، ناصر الدّین اور گنگو نے قلعے کے دروازے تک اُس کا ساتھ دیا۔

واسو دروازے پر دو گھوڑے لیے کھڑا تھا۔ زبیر خُدا حافظ کہہ کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ واسو نے اُس کی تقلید کی۔ گنگو نے کہا۔ "دھوپ تیز ہے لیکن یہ دونوں گھوڑے تازہ دم ہیں۔ تین کوس کی پہلی منزل اُن کے لیے بڑی بات نہیں۔ داسو! اِس مہم میں تمہاری کامیابی شاید چند مہینوں میں سندھ کا نقشہ بدل دے۔ جب تک زبیر مکران کی سرحد عبور نہ کر لے، واپس نہ آنا۔"

"آپ بے فکر رہیں۔" یہ کہہ کر واسو نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ زبیر نے اپنا گھوڑا اُس کے پیچھے چھوڑ دیا۔

قلعے کے اندر گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سُن کر زہرا نے ناہید کی طرف دیکھا۔ ناہید کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے اور وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔ "خدا تمہاری مدد کرے۔ خدا تُمہیں دُشمنوں سے بچائے۔"

زہرا کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور وہ بولی۔ "آپا! تُم اب تک مُجھ سے ایک بات چھپاتی رہی ہو۔ تمہیں اُن سے محبّت ہے؟"

ناہید نے کوئی جواب دیے بغیر زہرا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ گھوڑا کی ٹاپوں کی آواز آہستہ آہستہ ناہید کے کانوں سے دور ہو رہی تھی۔ آنسوؤں کے موتی اُس کی آنکھوں سے چھلک کر رُخساروں پر بہہ رہے تھے۔

زہرا نے اپنے دوپٹے سے اُس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”بہن وہ جلد آئیں گے۔ وہ ضرور آئیں گے۔“

قتیبہ کا ایلچی

بصرہ کے ایک کونے میں دریا کے کنارے ایک سر سبز نخلستان کے درمیان والیٔ بصرہ کا قلعہ نما مکان تھا۔ اُس مکان کے وسیع کمرے میں ایک عمر رسیدہ لیکن قوی ہیکل شخص ٹہل رہا تھا۔ وہ چلتے چلتے رُکتا اور دیواروں پر آویزاں نقشے دیکھنے میں منہمک ہو جاتا۔ اس کے چہرے سے غیر معمولی عزم و استقلال ٹپکتا تھا۔ آنکھوں میں ذکاوت اور ذکاوت سے زیادہ ہیبت تھی۔

یہ حجّاج بن یوسف تھا جس کے آہنی پنجوں سے دُشمن اور دوست یکساں

پناہ مانگتے تھے۔ جس کی تلوار عرب و عجم پر صاعقہ بن کر کوندی اور بسا اوقات اپنی حدود سے تجاوز کر کے عالمِ اسلام کے اُن درخشندہ ستاروں کو بھی خاک اور خون میں لٹا گئی، جن کے سینے نورِ ایمان سے منوّر تھے۔

حجاج بن یوسف کی طوفانی زندگی کا پہلا دور وہ تھا جب وہ عبد الملک کے عہدِ حکومت میں سرکشوں کو مغلوب کرنے کے لیے اُٹھا اور عراق اور عرب پر آندھی اور طوفان بن کر چھا گیا لیکن اِس دور میں اُس کی تلوار ایک اندھے کی لاٹھی تھی جو حق اور ناحق میں تمیز نہ کر سکی۔ دوسرا دور جس سے ہماری داستان کا تعلّق ہے، وہ تھا جب عبد الملک کی جگہ اس کا بیٹا ولید مسندِ خلافت پر بیٹھ چکا تھا۔ عراق اور عرب کی خانہ جنگیاں ختم ہو چکی تھیں اور مسلمان ایک نئے جذبے کے ماتحت منظّم اور مستحکم ہو کت ترکستان اور افریقہ کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے۔ اپنے باپ کی طرح ولید نے بھی حجّاج بن یوسف کو اندرونی اور خارجی معاملات میں سیاہ و سفید کا مالک بنا رکھا تھا لیکن ایک مسلمان مؤرّخ کی نگاہ میں حجّاج نے ولید کی جو خدمات انجام دیں، وہ عبد الملک کی خدمات سے بہت مختلف تھیں۔

عبد الملک کے عہدِ حکومت میں حجّاج بن یوسف کی تمام جدوجہد عرب اور عراق تک محدود رہی اور اُس کی خون آشام تلوار نے جہاں عبد الملک کی حکومت کو مضبوط اور مستحکم کیا، وہاں اُس کے دامن کو بے شمار بے گناہوں کے خون کے چھینٹوں سے داغ دار بھی کیا لیکن ولید کا عہد مسلمانوں کے لیے نسبتاً امن کا زمانہ تھا اور حجّاج بن یوسف اپنی زندگی کے باقی چند سال مشرق و مغرب میں مسلمانوں کی فتوحات کی راہیں صاف کرنے میں صرف کر رہا تھا۔

جب ہم حجّاج بن یوسف کی کتابِ زندگی کے آخری اوراق پر نگاہ دوڑاتے ہیں تو ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ قدرت سندھ، تُرکستان اور سپین میں مسلمانوں کی سطوت کے جھنڈے لہرانے کے لیے اُس شخص کو منتخب کرتی ہے جو آج سے چند سال قبل مکّہ کا محاصرہ کر رہا تھا۔ وہ آنکھیں جنھوں نے عبد اللہ بن زبیر کو اپنے سامنے قتل ہوتے دیکھ کر ترس نہ کھایا، سندھ میں ایک مسلمان لڑکی کی مُصیبت کا حال سُن کہ پُر نم ہو جاتی ہیں۔

تاریخ ہمارے سامنے ایک اور اہم سوال پیش کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ

عرب اور عراق کے مسلمان حجّاج بن یوسف کے عہد کے آخری ایّام میں بھی اُس سے نالاں تھے اور ولید کو بھی اچھّی نظروں سے نہ دیکھتے تھے۔ پھر کیا وجہ تھی کہ جب سندھ اور ترکستان کی طرف پیش قدمی شروع ہوئی تو ہر محاذ پر شامی مسلمانوں کے مُقابلے میں عربوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔

اِس کا جواب فقط یہ ہے کہ قیادت کی خامیوں کے باوجود جمہور مسلمانوں کا انفرادی کردار اُسی طرح بُلند تھا۔ حجّاج بن یوسف سے نفرت اُن کی قومی حمیت کو کُچل نہ سکی۔۔۔ اُنھوں نے جب یہ سُنا کہ اُن کے بھائی افریقہ اور ترکستان کی غیر اسلامی طاقتوں سے نبرد آزما ہیں تو وہ پرانی رنجشیں بھُول کر اُن کے ساتھ جا شامل ہوئے۔

اِس لیے ولید کے عہد کی شاندار فتوحات کا سہرا حجّاج بن یوسف اور ولید کے سر نہیں بلکہ اُن عوام کے سر ہے جن کے ایثار اور خلوص میں ہر قوم کی ترقّی اور عروج کا راز پنہاں ہے۔

(۲)

حجّاج بن یوسف دیر تک دیواروں پر لٹکے ہوئے نقشے دیکھتا رہا۔ بالآخر اُس نے ایک نقشہ اُتارا اور اپنے سامنے رکھ کر ایرانی قالین پر بیٹھ گیا۔ دیر تک سوچنے کے بعد اُس نے قلم اُٹھا کر نقشے پر چند نشانات لگائے اور اُسے لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا۔

ایک سپاہی نے ڈرتے ڈرتے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔ ”ترکستان سے ایک ایلچی آیا ہے۔“

حجّاج بن یوسف نے کہا۔ ”میں صُبح سے انتظار کر رہا ہوں۔ اُسے یہاں لے آؤ!“ سپاہی چلا گیا اور حجّاج بن یوسف دوبارہ نقشہ کھول کر دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک زرہ پوش کمرے میں داخل ہوا۔ وہ قد و قامت کے لحاظ سے ایک نوجوان اور چہرے مہرے سے پندرہ سولہ سال کا ایک لڑکا معلوم ہوتا تھا۔ اُس کے سر پر تانبے کا ایک خُود چمک رہا تھا۔ تیکھے نقوش، چمکتی ہوئی آنکھیں پتلے اور بھینچے ہوئے ہونٹ، ایک غیر معمولی عزم و استقلال کے آئینہ دار تھے۔ اُس کے قد و قامت میں

تناسب اور چہرے میں کُچھ ایسی جاذبیت تھی کہ حجّاج بن یوسف حیرت زدہ ہو کر اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اُس نے کرخت آواز میں پوچھا۔ ”تُم کون ہو؟“

لڑکے نے جواب دیا۔ ”میں نے ہی اطلاع بھجوائی تھی۔ میں ترکستان سے آیا ہوں۔“

”خوب! ترکستان سے تُم آئے ہو۔ میں قتیبہ کی زندہ دِلی کی داد دیتا ہوں۔ میں نے قتیبہ کو لکھا تھا کہ وہ خود آئے یا کسی تجربہ کار جرنیل کو میرے پاس بھیجے اور اُس نے ایک آٹھ سال کا بچّہ میرے پاس بھیج دیا ہے۔“

لڑکے نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”میری عمر سولہ سال اور آٹھ مہینے ہے!“

حجّاج بن یوسف نے گرج کر کہا۔ ”لیکن تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟ قتیبہ کو کیا ہو گیا ہے؟“

لڑکے نے جواب دیے بغیر آگے بڑھ کر ایک خط پیش کیا۔ حجّاج بن

یوسف نے جلدی سے خط کھول کر پڑھا اور قدرے مطمئن ہو کر پوچھا۔ ”وہ خود سیدھا میرے پاس کیوں نہیں آیا۔ تمہیں یہ خط دے کر کیوں بھیجا؟“

لڑکے نے کہا۔ ”آپ کِس کے متعلّق پُوچھ رہے ہیں؟“ حجّاج بن یوسف کی قوّتِ برداشت جواب دے رہی تھی۔ اُس نے چلّا کر کہا۔ ”وہ بے وقوف جس کے متعلّق قتیبہ نے لکھا ہے کہ میں اپنا بہترین سالار بھیج رہا ہوں۔“

لڑکے نے پھر اطمینان سے جواب دیا۔ ”قتیبہ کے مکتوب میں جس کا ذکر ہے وہ تو میں ہی ہوں۔ اگر آپ کسی اور بے وقوف سے ملنا چاہتے ہیں تو مُجھے اجازت دیجیے۔“

”تم؟ اور قتیبہ کے بہترین سالار! خُدا ترکستان میں لڑنے والے بدنصیب مسلمانوں کو دُشمنوں سے بچائے۔ قتیبہ کے ساتھ تمہارا کیا رشتہ ہے؟“

”ہم دونوں مسلمان ہیں!“

”فوج میں تمہارا عہدہ کیا ہے؟“

”میں ہراول کا سالار ہوں۔“

”ہراول کے سالار! تُم؟ اور بلخ سے کترا کر بخارا اور سمرقند کی طرف رُخ کرنے کے ارادے میں بھی غالباً کسی تمہارے جیسے ہونہار مجاہد کے مشورے کا دخل ہے۔“

”ہاں یہ میرا مشورہ ہے اور میرے یہاں آنے کی وجہ بھی یہی ہے۔ آپ اگر تھوڑی دیر ضبط سے کام لیں تو میں تمام صورتِ حال آپ کو سمجھا سکتا ہوں۔“

حجّاج بن یوسف کی تلخی اب پریشانی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اُس نے کہا۔ ”اگر آج تم مجُھے کوئی بات سمجھا سکے تو میں یہ کہوں گا کہ عرب کی ماؤں کے دودھ کی تاثیر زائل نہیں ہوئی۔ بیٹھ جاؤ۔ میں صبح سے نقشہ دیکھ رہا ہوں، مجُھے بتاؤ کہ جو فوج ہرات جیسے معمولی شہر کو فتح نہیں کر سکتی، وہ بخارا جیسے مضبوط اور مستحکم شہر پر فتح کے جھنڈے لہرانے کے متعلّق اِس قدر پُر اُمّید کیوں ہے۔ ہاں! پہلے یہ بتاؤ تمہیں نقشہ پڑھنا آتا ہے؟“

لڑکے نے کوئی جواب دیے بغیر حجّاج بن یوسف کے سامنے بیٹھ کر نقشہ کھولا اور مختلف مقامات پر اُنگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ بلخ ہے اور یہ بخارا۔ غالباً آپ بخارا کے قلعے کی مضبوطی کے متعلّق بہت کُچھ سُن چکے ہوں گے لیکن بلخ کا قلعہ اگر اِس قدر مضبُوط نہ بھی ہو، تو بھی یہ اپنے جغرافیائی محل وقوع کے باعث کہیں زیادہ محفوظ ہے۔ بخارا کے چاروں طرف کھُلے میدان ہیں اور ہم آسانی سے اُس کا محاصرہ کر کے شہر کے باشندوں کو ترکستان کے باقی شہروں کی افواج کی مدد سے محروم کر سکتے ہیں۔ رہا قلعہ، تو اس کے متعلّق میں آپ کو یقین دِلاتا ہوں کہ منجنیق کے سامنے پتھّر کی دیواریں نہیں ٹھہرتیں اور یہ بھی کئی بار دیکھا جا چکا ہے کہ قلعہ بند افواج زیادہ دیر فقط اُس صورت میں مُقابلہ کرتی ہیں جب اُنہیں کسی مدد کی اُمّید ہو۔ ورنہ وہ مایوس ہو کر دروازے کھول دیتی ہے۔ اِس کے بر عکس بلخ میں ہمیں بہت سی مُشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ شہر پر حملہ کرنے کے لیے ہمیں جس قدر افواج کی ضرورت ہو گی اُس سے کہیں زیادہ سپاہی پہاڑی علاقے میں رسد و کُمک کے راستے محفوظ رکھنے کے لیے درکار ہوں گے اور اس کے علاوہ شہر کا محاصرہ کرنے کے لیے ہمیں ارد گرد کی تمام

پہاڑیوں پر قبضہ کرنا ہو گا۔ ان جنگوں میں پہاڑی قبائل کے پتھّر ہمارے تیروں سے کہیں زیادہ خطرناک ہوں گے۔ بلخ کے جنوب اور مشرق کے پہاڑ کافی اُونچے ہیں۔ اگر جنوب مشرقی ترکستان کی تمام ریاستوں نے بلخ کو مدد دینے کی کوشش کی تو ایک بہت بڑی فوج اُن اُونچے پہاڑوں کی آڑ لے کر ہماری طرف سے کسی مزاحمت کا مُقابلہ کیے بغیر بلخ کے قریب پہنچ کر مشرق جنوب اور مغرب سے ہمارے لیے خطرہ پیدا کر سکتی ہے اور اگر شمال سے اُن کی مدد کے لیے بخارا اور سمرقند کی افواج بھی آ جائیں تو مرو سے ہماری رسد و کُمک کا راستہ بھی منقطع ہو جائے گا اور ہمیں چاروں اطراف سے بیرونی حملہ آوروں نے محصور کر رکھا ہو گا۔ تاہم گرمیوں میں ہم ڈٹ کر ان کا مُقابلہ کر سکیں گے۔ لیکن یہ محاصرہ یقیناً طول کھینچے گا اور سردیوں میں پہاڑی لوگ ہمارے لیے بہت خطرناک ثابت ہوں گے اور پسپائی کی صورت میں ہم میں سے بہت کم ایسے ہوں گے جو واپس مرو پہنچ سکیں۔"

حجّاج بن یوسف اب نقشے سے زیادہ اُس کم سِن اور نوجوان سالار کو دیکھ رہا

تھا۔ اُس نے کہا۔ ”عربوں کی فوجی اصلاحات میں ابھی تک پسپائی کے لفظ کو کوئی جگہ نہیں ملی۔“

لڑکے نے جواب دیا۔ ”مجھے عربوں کے عزم و استقلال پر شُبہ نہیں لیکن میں فوجی زاویہ نگاہ سے اِس حملے کو خودکشی کے مترادف سمجھتا ہوں۔“

حجّاج بن یوسف نے کہا۔ ”تو تمہارا کیا خیال ہے کہ مشرق کی طرف پیش قدمی کا اِرادہ ترک کر دیا جائے؟“

”نہیں! ترکستان پر تسلّط رکھنے کے لیے مشرق میں ہماری آخری چوکی بلخ نہیں ہو گی بلکہ ہمیں کاشغر اور چترال کے درمیان تمام پہاڑی علاقے پر قبضہ کرنا پڑے گا لیکن میں اِس سے پہلے بخارا کو فتح کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ اس میں ہمیں دو فائدے ہوں گے۔ ایک یہ کہ یہ ترکستان کا اہم ترین شہر ہے اور اہلِ ترکستان پر اِس کی فتح کا وہی اثر ہو گا جو مدائن کی فتح کے بعد ایرانیوں اور دمشق کے بعد رومیوں پر ہوا تھا۔ دوسرا یہ کہ بخارا کا محاصرہ کرتے وقت ہمیں باہر سے اُن خطرات کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا جو ہمیں بلخ کے متعلّق بیان کر چُکا ہوں۔ بخارا کو فتح کرنے کے بعد ہم مرو

کی بجائے اُسے اپنی افواج کا مستقر بنا سکتے ہیں۔ وہاں سے سمر قند اور سمر قند سے قوقند اور فرغانہ کی طرف پیش قدمی کر سکتے ہیں۔ ان فتوحات کے بعد مجھے اُمّید نہیں کہ ترکستان کی قوّتِ مدافعت باقی رہے، اس کے بعد میری تجویز یہ ہے کہ بخارا اور سمر قند سے ہماری افواج جنوبی ترکستان کی طرف پیش قدمی کریں اور قوقند کی افواج کاشغر کا رُخ کریں۔ مُجھے یقین ہے کہ جتنی دیر میں قوقند کی افواج دشوار گزار پہاڑوں کو عبور کرتے ہوئے کاشغر پہنچیں گی۔ اِس سے پہلے جنوب میں بلخ اور اس کے آس پاس کے شہر فتح ہو چکے ہوں گے۔"

حجّاج بن یوسف حیرت و استعجاب کے عالم میں اِس نو عُمر سپاہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس نے نقشہ لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا اور کُچھ دیر سوچنے کے بعد سوال کیا۔ "تُم کس قبیلے سے ہو؟"

لڑکے نے جواب دیا۔ "میں ثقفی ہوں۔"

"ثقفی۔۔۔! تمہارا نام کیا ہے؟"

"محمدؒ بن قاسم۔" حجّاج بن یوسف نے چونک کر محمدؒ بن قاسم کی طرف دیکھا اور کہا۔ "قاسم کے بیٹے سے مجھے یہی توقّع تھی۔ مجھے پہچانتے ہو؟"

محمدؒ بن قاسم نے کہا۔ "آپ بصرہ کے حاکم ہیں۔"

حجّاج بن یوسف نے مایوس ہو کر کہا۔ "بس میرے متعلّق یہی جانتے ہو تم۔۔۔؟"

"میں اِس کے علاوہ اور بھی بہت کُچھ جانتا ہوں۔ اس سے پہلے آپ خلیفہ عبد الملک کے دستِ راست تھے اور اب خلیفہ ولید کے دستِ راست ہیں۔"

"تمہیں تمہاری ماں نے یہ نہیں بتایا کہ قاسم میرا بھائی تھا اور تم میرے بھتیجے ہو؟"

"انہوں نے مجھے بتایا تھا؟"

"کب؟"

"جب آپ عبداللہ بن زبیرؓ کو قتل کر کے مدینہ واپس آئے تھے۔"

کم سن بھتیجے کے مُنہ سے یہ الفاظ سُن کر حجّاج بن یوسف کی پیشانی کی رگیں تھوڑی دیر کے لیے پھُول گئیں۔ وہ غضب ناک ہو کر محمدؒ بن قاسم کی طرف دیکھنے لگا لیکن اُس کی نگاہوں میں خوف و ہراس کی بجائے غایت درجے کا سکون دیکھ کر اس کا غصّہ آہستہ آہستہ ندامت میں تبدیل ہونے لگا۔ محمدؒ بن قاسم کی بے باک نگاہیں اُس سے پوچھ رہی تھیں کہ میں نے جو کُچھ کہا ہے۔ کیا وہ غَلَط ہے؟ کیا تُم عبداللہ بن زبیرؓ کے قاتل نہیں ہو؟"

حجّاج بن یوسف اپنے دِل پر ایک ناقابلِ برداشت بوجھ محسوس کرتے ہوئے اُٹھا اور دریا کی طرف کھُلنے والے دریچے کے پاس کھڑا ہو کر جھانکنے لگا۔ "عبداللہ بن زبیرؓ کا قاتل عبداللہ بن زبیرؓ کا قاتل!" اُس نے چند بار اپنے دِل میں یہ الفاظ دُہرائے۔ تصوّر کی نگاہیں ماضی کا نقاب اُلٹنے لگیں۔ وہ مکّہ کے اُس عُمر رسیدہ مجاہد کو دیکھ رہا تھا جس کے ہونٹوں پر قتل ہوتے وقت بھی ایک فاتحانہ مُسکراہٹ تھی۔ اُسے پھر ایک بار مکّہ کی گلیوں میں بیواؤں اور تیموں کی چیخیں سُنائی دینے لگیں۔ اُس نے

جھر جھری لیتے ہوئے مُڑ کر محمدّ بن قاسم کی طرف دیکھا۔ وہ اُس کی توقّع کے خلاف اُس کی طرف دیکھنے کی بجائے نقشہ دیکھنے میں منہمک تھا۔ عہدِ ماضی کی چند اور تصویریں اُس کے سامنے آ گئیں۔ وہ پھر ایک بار مدینہ کے ایک چھوٹے سے مکان میں اپنے نوجوان بھائی کو بِستر مرگ پر دیکھ رہا تھا۔ وہ بھائی جس نے مکّہ میں اُس کی کارگزاری کا حال سُننے کے بعد اُسے دیکھ کر غصّے اور جوش میں آنکھیں بند کر لی تھیں۔ قاسم کے یہ الفاظ پھر ایک بار اُس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ "حجّاج جاؤ! میں مرتے وقت عبد اللہ بن زبیرؓ کے قاتل کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔ تمہارے دامن پر جس خُون کے چھینٹے ہیں، اُسے میرے آنسو نہیں دھو سکتے۔" پھر وہ اپنے بھائی کے جنازے کے ساتھ ایک کم سِن بچّے کو دیکھ رہا تھا۔ یہ اُس کا بھتیجا تھا، جسے اُس نے اُٹھا کر گلے لگانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ تڑپ کر ایک طرف کھڑا ہو کر چلّایا تھا۔ "نہیں! نہیں! مُجھے ہاتھ نہ لگاؤ! ابّا کو تُم سے نفرت تھی۔"

حجّاج نے ایک انتہائی تکلیف دہ احساس کے تحت محمدّ بن قاسم کی طرف

دیکھا اور کہا۔ ”محمدؐ! اِدھر آؤ۔“

محمدؐ بن قاسم نقشہ لپیٹ کر ایک طرف رکھتے ہوئے اُٹھا اور حجّاج بن یوسف کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اُس کے چہرے پر غیر معمولی اطمینان کی جھلک حجّاج بن یوسف کے لیے صبر آزما تھی لیکن اُس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”تو میں تمھاری نظروں میں عبداللہ بن زبیرؓ کے قاتل کے سوا کُچھ نہیں؟“

محمدؐ بن قاسم نے جواب دیا، ”یہ خلقِ خدا کا فتویٰ ہے اور میں آپ کو دھوکے میں رکھنے کے لیے قاتل کی جگہ کوئی اور لفظ تلاش نہیں کر سکتا۔“

حجّاج بن یوسف نے کہا۔ ”تمھاری رگوں میں قاسم کا خون ہے۔ میں تمھاری ہر بات برداشت کرنے کے لیے تیّار ہوں، اگرچہ برداشت کرنا میری عادت نہیں۔“

”میں آپ کو اپنی عادت بدلنے پر مجبور کرنے کے لیے نہیں آیا، قتیبہ بن

مسلم باہلی نے جو فرض میرے سپرد کیا، میں پورا کر چکا ہوں۔ اب مُجھے اجازت دیجیے۔ اگر آپ کو قتیبہ کے لیے کوئی پیغام بھیجنا ہو تو میں کل حاضر ہو جاؤں گا۔" ایک لمحہ کے تذبذب کے بعد حجّاج بن یوسف نے کہا۔

"تم کہاں جانا چاہتے ہو؟"

محمدؐ بن قاسم نے جواب دیا۔ "شہر میں والدہ کے پاس۔ میں سیدھا آپ کے پاس آیا ہوں۔ ابھی تک گھر نہیں گیا۔"

"تمہاری والدہ بصرہ میں ہیں؟ مُجھے یہ بھی معلوم نہ تھا۔ وہ یہاں کب آئیں؟"

"اُنہیں مدینہ سے یہاں آئے ہوئے تین چار مہینے ہوئے ہیں۔ مُجھے مرو میں اُن کا خط ملا تھا۔"

"وہ کِس کے پاس ٹھہری ہیں۔ وہ یہاں کیوں نہ آئیں؟"

"وہ ماموں کے مکان میں ٹھہری ہیں اور یہاں نہ آنے کی وجہ آپ مُجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔"

"اور تُم تُرکستان جانے سے پہلے کہاں تھے؟"

"میں دس برس کی عمر تک ماں کے ساتھ مدینہ میں تھا اور اُس کے بعد ماموں کے پاس بصرہ چلا آیا۔"

"اور مُجھ سے اتنی نفرت تھی کہ اپنی صورت تک نہ دِکھائی؟"

محمدّ بن قاسم نے جواب دیا۔ "سچ پوچھیے تو میں مکتب اور اُس کے بعد سپاہیانہ زندگی میں اِس قدر مصروف رہا ہوں کہ اپنے دِل میں کسی کی محبّت یا نفرت کے جذبات کو جگہ نہیں دے سکا۔"

حجّاج بن یوسف نے کُچھ سوچ کر کہا۔ "مکتب میں شاید میں نے تمہیں دیکھا تھا لیکن پہچان نہ سکا۔ تُم بہت جلد جوان ہو گئے ہو۔ اب بتاؤ، اپنی چچی سے نہیں ملو گے؟"

محمدّ بن قاسم متذبذب سا ہو کر حجّاج بن یوسف کی طرف دیکھنے لگا۔ حجّاج بن یوسف نے اُس کا بازو پکڑ لیا اور لمبے لمبے قدم اُٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔ باغ کے دوسرے کونے میں رہائشی مکان کے دروازے پر پہنچ

کر محمدؒ بن قاسم نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ ”مُجھے چھوڑ دیجیے! میں آپ کے ساتھ ہوں۔“

(۳)

حجّاج بن یوسف کی آواز سُن کر اُس کی بیوی ایک کمرے سے باہر نکلی اور محمدؒ بن قاسم کو دیکھتے ہی چِلاّئی۔ ”محمدؒ! تُم کب آئے؟“

حجّاج بن یوسف نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”تُم نے اِسے کیسے پہچان لیا؟“

وہ خوشی کے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ”میں اِسے کیونکر بھول سکتی تھی؟“

حجّاج بن یوسف نے پھر سوال کیا۔ ”تُم نے اِسے کب دیکھا تھا؟“

جب میں اور زبیدہ اِس کے ماموں کے ساتھ حج پر گئی تھیں۔ ہم واپسی پر مدینے میں اِن کے ہاں ٹھہرے تھے۔ محمدؒ بھی ترکستان سے رخصت پر آیا ہوا تھا۔“

”اور مُجھ سے ذکر تک نہ کیا؟“

"مجھے اِس کی والدہ نے تاکید کی تھی اور مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ آپ کہیں بُرا نہ مانیں۔"

"تو اُنہوں نے ابھی تک میری خطا معاف نہیں کی۔"

"وہ آپ سے ناراض نہیں لیکن قاسم کی موت کا اُن کے دِل پر گہرا اثر ہے۔"

حجّاج بن یوسف نے کُچھ سوچ کر محمدؐ بن قاسم کی طرف دیکھا اور کہا۔ "محمدؐ! چلو، میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

حجّاج کی بیوی نے کہا، "نہیں نہیں!! آپ ابھی وہاں نہ جائیں۔"

"لیکن کیوں؟" "وہ بیمار ہیں۔"

"تو اِس صورت میں مجھے ضرور جانا چاہیے۔"

محمدؐ بن قاسم نے بے چین سا ہو کر کہا۔ "امّی جاں بیمار ہیں؟ مجھے اجازت دیجیے!"

محمدؒ بن قاسم بھاگ کر مکان سے باہر نکل گیا۔ حجّاج بن یوسف اُس کا ساتھ دینے کے لیے مُڑا لیکن اُس کی بیوی نے آگے بڑھ کہ راستہ روک لیا۔

"نہیں! نہیں!! آپ نہ جائیں۔"

"میں ضرور جاؤں گا۔ تمہیں یہی ڈر ہے نا کہ وہ مُجھے بُرا بھلا کہیں گی اور میں طیش میں آ جاؤں گا۔"

"نہیں۔ اُن کا حوصلہ اِس قدر پست نہیں۔"

"تو پھر مجُھے اُن کی تیمار داری سے کیوں منع کرتی ہو اور یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہیں؟"

"مُجھے ڈر ہے کہ آپ خفا ہو جائیں گے۔ میں آپ سے ایک بات چھُپا تی رہی ہوں۔"

"وہ کیا؟"

"جب سے وہ یہاں آتی ہیں۔ میں ہر تیسرے چوتھے دِن اُن کے گھر جایا کرتی ہوں۔ کل میں نے خادمہ کو بھیجا اور اُس نے بتایا کہ اُن کی طبیعت

بہت خراب ہے۔ میں ابھی وہاں سے ہو کر آئی ہوں۔ اگر آپ کا ڈر نہ ہوتا تو میں کچھ دیر اور وہاں ٹھہرتی، آج زبیدہ میرے ساتھ تھی اور ان کی حالت دیکھ کر میں۔۔۔"

حجّاج بن یوسف نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "تم ڈرتی کیوں ہو؟ صاف صاف کہو، اگر تُم زبیدہ کو وہاں چھوڑ آئی ہو تو بُرا نہیں کیا۔" "وہ ابھی آ جائے گی۔ میں نے خادمہ کو بھیج دیا ہے۔"

"لیکن تُم نے یہ سب کُچھ مُجھ سے کیوں چھُپایا۔ کیا تمہارا یہ خیال تھا کہ مُجھ میں انسانیت کی کوئی رمق باقی نہیں رہی؟"

"مُجھے معاف کیجیے؟"

"اچھّا! اب تم بھی میرے ساتھ چلو!"

(۴)

زبیدہ محمدّ بن قاسم کی ماں کے سرہانے بیٹھی اُس کا سر دبا رہی تھی، ایک شامی لونڈی اُن کے پاس کھڑی تھی۔ محمدّ بن قاسم کی والدہ نے کراہتے

ہوئے زبیدہ کا ہاتھ اپنے نحیف ہاتھ میں پکڑ لیا اور اُسے اپنی آنکھوں پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”بیٹی تمہارے ہاتھوں سے میری جلتی ہوئی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچتی ہے۔ لیکن مُجھے ڈر ہے کہ تمہارے باپ کو پتہ لگ گیا تو وہ بہت خفا ہو گا اور پھر شاید تُم کبھی بھی یہاں نہ آسکو۔ بیٹی جاؤ!“

زبیدہ نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے جواب دیا۔ ”میرا جی نہیں چاہتا کہ آپ کو اِس حالت میں چھوڑ کر جاؤں۔“

صحن میں کسی کی آہٹ پا کر زبیدہ نے اُٹھ کر باہر جھانکا۔ محمدؐ بن قاسم اپنے گھوڑے کی لگام حبشی غلام کے ہاتھ میں تھما کر بھاگتا ہوا آگے بڑھا۔ دروازے پر زبیدہ کو دیکھ کر جھجکا اور پہچان کر بولا۔ ”تُم یہاں؟ امّی کیسی ہیں؟“

زبیدہ جواب دینے کی بجائے اُس کی سپاہیانہ ہیبت سے مرعوب سی ہو کر ایک طرف ہٹ گئی اور محمدؐ بن قاسم اندر داخل ہوا۔

بیٹے پر نگاہ پڑتے ہی ماں کے زرد چہرے پر رونق آ گئی۔ اُس نے اُٹھ کر

بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا! تُم آ گئے ؟“

”امّی ! آپ کب سے علیل ہیں ؟“

”بیٹا! بصرہ پہنچتے ہی میری صحت خراب ہو گئی تھی۔“

”لیکن مُجھے کیوں نہ لکھا؟“

”بیٹا! تُم گھر سے کوسوں دور تھے اور میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی اور یہ خود تمہارے سر پر مُجھے بہت اچھّا معلوم ہوتا تھا۔ اِسے پھر پہن کر دِکھاؤ۔ میں اپنے نوجوان مجاہد کو سپاہیانہ لباس میں اچھّی طرح دیکھنا چاہتی ہوں۔“

محمدّ بن قاسم نے مُسکراتے ہوئے خُود اپنے سر پر رکھ لیا۔ ماں کُچھ دیر ٹکٹکی باندھ کر اُس کی طرف دیکھتی رہی۔ اُس کے مُنہ سے بے اختیار دُعا نکلی۔ ”میرے اللہ! یہ سر ہمیشہ اُونچا رہے!“

محمدّ بن قاسم سے نظر ہٹا کر اُس نے زبیدہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”بیٹی! تُم کیوں کھڑی ہو، بیٹھ جاؤ!“

زبیدہ جو ابھی تک دروازے کے قریب تھی، جھجکتی اور شرماتی ہوئی آگے بڑھی اور بستر کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

ماں نے محمدّ بن قاسم کی طرف دیکھا۔ ”محمدّ! تُم نے اِسے نہیں پہچانا؟“

اس نے جواب دیا۔ ”میں نے اِسے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ لیکن زبیدہ تُم کیسے آئیں؟ چچا کو تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ امّی جان یہاں ہیں۔“

ماں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”تم اپنے چچا سے مل کر آئے ہو؟“

”ہاں امّی۔ قتیبہ کا ضروری پیغام تھا۔ اِس لیے میں سیدھا اُن کے پاس پہنچا اور وہ مُجھے پکڑ کر گھر لے گئے۔ وہ خود بھی آپ کے پاس آنا چاہتے تھے لیکن میں آپ کی علالت کا حال سُن کر بھاگ آیا اور اُنہیں ساتھ نہ لا سکا۔“

ماں نے مغموم صورت بنا کر کہا۔ ”خُدا کرے یہاں آنے میں اُس کی نیّت نیک ہو۔“

زبیدہ کا سُرخ و سپید چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ اُس نے کرسی سے اُٹھ کر کہا۔ ”چچی

جان! میں جاتی ہوں۔" شامی کنیز بھی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

لیکن اتنے میں باہر کسی کے پاؤں کی چاپ سُنائی دی اور شامی کنیز نے آگے بڑھ کر صحن کی طرف جھانکا اور اُس کے مُنہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

محمدّ بن قاسم پریشان ہو کر اُٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ زبیدہ کی ماں اندر داخل ہوئی اور حجّاج بن یوسف نے دروازے پر رُک کر محمدّ بن قاسم سے کہا۔ "محمدّ! اپنی ماں سے پوچھو مُجھے اندر آنے کی اجازت ہے؟"

محمدّ بن قاسم نے مُڑ کر ماں کی طرف دیکھا اور کہا "کیوں امّی! چچا اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں؟"

ماں نے سر اور چہرہ ڈھانپتے ہوئے جواب دیا۔ "گھر میں آنے والے مہمان کے لیے دروازہ بند نہیں کیا جا سکتا۔ اُنہیں بُلا لو۔"

حجّاج بن یوسف اندر داخل ہوا۔ زبیدہ کے چہرے پر کئی رنگ آ چکے تھے۔ اُس کی ماں نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "بیٹی ڈرتی کیوں ہو؟ تمہارے ابّا خود تمہاری چچی کی مزاج پُرسی کے لیے آئے ہیں۔"

حجّاج بن یوسف کو وہاں بیٹھے چند ساعتیں نہ گزری تھیں کہ گلی میں لوگوں کا شور سُن کر محمدّ بن قاسم باہر نکلا اور تھوڑی دیر بعد مُسکراتا ہوا واپس آکر کہنے لگا۔ ”آپ کو دیکھ کر محلے کے تمام لوگ ہمارے دروازے پر جمع ہو گئے تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ آپ ہمیں قتل کرنے کے لیے آئے ہیں۔“ حجّاج بن یوسف کے چہرے پر ایک دردناک مُسکراہٹ نمودار ہوئی اور اُس نے سر جھُکا لیا۔

(۵)

تیسرے دِن محمدّ بن قاسم پھر حجّاج بن یوسف کے پاس پہنچا اور ترکستان جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ حجّاج بن یوسف نے پوچھا۔ ”تمہاری ماں کی طبیعت اب کیسی ہے؟“

محمدّ بن قاسم نے جواب دیا۔ ”اُن کی حالت اب پہلے سے کُچھ اچھّی ہے اور اُنہوں نے مُجھے واپس جانے کی اجازت دے دی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ میں آج ہی روانہ ہو جاؤں۔“

حجّاج بن یوسف نے جواب دیا۔ ”میں نے آج صُبح قتیبہ کے پاس اپنا قاصد روانہ کر دیا ہے اور اُسے لکھ بھیجا ہے کہ مُجھے تمہاری تجویز سے اتّفاق ہے۔ اب تم کُچھ عرصہ یہیں رہو گے۔“

”لیکن میرا وہاں جانا ضروری ہے۔ قتیبہ نے مُجھے جلد واپس آنے کے لیے بہت تاکید کی تھی۔“

حجّاج نے جواب دیا۔ ”لیکن مُجھے اِس جگہ تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔ مُجھ پر ایک بہت بڑا بوجھ ہے اور تم میرا ہاتھ بٹا سکتے ہو۔ میں یہاں سے اکیلا ہر محاذ کی نگرانی نہیں کر سکتا۔ اِس کے علاوہ تمہارے متعلّق میں نے دربارِ خلافت میں لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ تمہیں وہاں ایک فوجی مشیر کا عہدہ سنبھالنا پڑے۔“

”لیکن دمشق میں مُجھ سے کہیں زیادہ تجربہ کار لوگ موجود ہیں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ دربارِ خلافت میں آپ کے اثر و رسوخ کا ناجائز فائدہ اٹھاؤں۔“ ابھی مُجھے بہت کُچھ سیکھنا ہے۔ آپ مُجھے ترکستان جانے کی اجازت دیں۔“

"محمدؐ! تمہارا یہ قیاس غلط ہے۔ تم اگر بھتیجے ہونے کی بجائے میرے بیٹے بھی ہوتے تو بھی میں تمہاری بے جا حمایت نہ کرتا۔ مجھے یقین ہے کہ تم بڑی سے بڑی ذمّہ داری سنبھال سکتے ہو۔ یہ محض اتّفاق ہے کہ تم میرے بھتیجے ہو۔ پرسوں کی ملاقات میں جو اثر تم نے مجھ پر ڈالا ہے، اس کے بعد خواہ تم کوئی ہوتے، میں یقیناً تمہارے لیے یہی کچھ کرتا۔ قتیبہ بذاتِ خود غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ وہ تمہارے بغیر کام چلا سکے گا۔ تم میدانِ جنگ کی بجائے دمشق یا بصرہ میں رہ کر اُس کی زیادہ مدد کر سکتے ہو۔ تم نوجوان ہو۔ وہ نوجوان جو بوڑھوں کی آواز سے ٹس سے مس ہونے کے عادی نہیں، یقیناً تمہاری آواز پر لبیک کہیں گے۔ قتیبہ کی سب سے بڑی مدد یہ ہو گی کہ تم یہاں دمشق میں بیٹھ کر اُس کے لیے مزید سپاہی بھرتی کرتے رہو۔ دوسرے محاذ پر ہماری افواج مغربی افریقہ تک پہنچ چکی ہیں۔ ممکن ہے کہ موسیٰ بن نصیر کسی دِن سمندر عبور کر کے سپین پر حملہ کرنے کے لیے تیّار ہو جائے۔ اس صورت میں ہمارے لیے مغربی محاذ ترکستان کے محاذ سے بھی زیادہ اہم ہو جائے گا۔ اس لیے جب تک دربارِ خلافت سے میرے مکتوب کا جواب نہیں آتا تم یہیں رہو اور تمہارے ماموں جان

بھی تک کوفہ سے آئے کہ نہیں؟“

محمدّ بن قاسم نے جواب دیا۔ ”وہ شاید آج آجائیں۔“

”انہیں آتے ہی میرے پاس بھیجنا اور کہنا کہ والئی بصرہ کا حکم نہیں، حجّاج بن یوسف کی درخواست ہے۔“

محمدّ بن قاسم باہر نکلا تو ایک کنیز نے کہا۔ ”آپ کی چچی آپ کو اندر بُلاتی ہیں۔“

محمدّ بن قاسم حرم سرا میں داخل ہوا۔ زبیدہ اپنی ماں کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ محمدّ بن قاسم کو دیکھ کر اس کے چہرے پر حیا کی سُرخی چھاگئی اور وہ اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

چچی نے محمدّ بن قاسم کو اپنے سامنے ایک کرسی پر بٹھالیا اور پوچھا۔ ”بیٹا! تمہارے ماموں جان آئے ہیں یا نہیں؟“

محمدّ بن قاسم نے جواب دیا۔ ”وہ آج آجائیں گے لیکن اِن کی کیا ضرورت پڑگئی۔ چچا بھی مُجھ سے انہی کے متعلق پوچھتے تھے۔“

"کُچھ نہیں بیٹا! ایک کام ہے۔"

محمدؐ بن قاسم چچی سے رخصت ہو کر گھر پہنچا تو حجّاج بن یوسف کی ایک بوڑھی خادمہ باہر نکل رہی تھی۔ وہ اندر داخل ہوا تو ماں بستر پر تکیے کا سہارا لے بیٹھی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی مُسکرا کر بولی۔ "بیٹا! اب تو شائد تمہیں چند دِن اور یہیں رہنا پڑے گا۔"

"ہاں امّی چچا نے دربارِ خلافت میں فوجی مشیر کے عہدے کے لیے میری سفارش کی ہے اور مُجھے جواب آنے تک یہیں ٹھہرنا پڑے گے!"

"بیٹا! حجّاج کبھی کسی پر مہربان نہیں ہوا لیکن تُم بہت خوش نصیب ہو!"

"امّی! میں اپنے پاؤں پر اُٹھنا چاہتا ہوں۔ اگر دمشق جا کر مُجھے معلوم ہوا کہ میں اپنے نئے عہدے کا اہل نہیں تو میں واپس چلا جاؤں گا۔ مُجھے ڈر ہے کہ وہاں بڑی بڑی عُمر کے لوگ مُجھ پر ہنسیں گے اور سب یہ کہیں گے کہ میرے ساتھ خاص رعایت کی گئی ہے۔"

"بٹیا! حجّاج میں لاکھ بُرائیاں ہیں لیکن اُس میں ایک خوبی ضرور ہے کہ وہ

عہدیداروں کا انتخاب کرتے وقت غَلَطی نہیں کرتا۔ میں خود یہ نہیں چاہتی کہ وہ میرے بیٹے کے ساتھ کوئی رعایت کرے لیکن اگر اُس نے تمہاری کوئی بے جا رعایت بھی کی ہے تو میں یہ چاہتی ہوں کہ تم نہ صرف خود کو اپنے منصب کا اہل ثابت کر دکھاؤ بلکہ یہ ثابت کر دو کہ تم اس سے زیادہ اہم ذمّہ داری سنبھال سکتے ہو۔ میں تمہیں ایک اور خوشخبری سُنانا چاہتی ہوں۔"

"وہ کیا؟"

"پہلے وعدہ کرو کہ میں جو کُچھ کہوں گی، تُم اس پر عمل کرو گے؟"

"امّی! آج تک آپ کا کوئی حکم ایسا ہے جس سے میں نے سرتابی کی ہو؟"

"جیتے رہو بیٹا! میری دُعا ہے کہ جب تک دِن کو سورج اور رات کو چاند اور ستارے میسّر ہیں۔ تمہارا نام دنیا میں روشن رہے اور قیامت کے دِن مجاہدینِ اسلام کی ماؤں کی صف میں میری گردن کسی سے نیچی نہ ہو۔"

"ہاں امّی! وہ خوشخبری کیا تھی؟"

ماں نے مُسکراتے ہوئے تکیے کے نیچے سے ایک خط نکالا اور کہا۔ ”لو پڑھ لو۔ تمہاری چچی کا خط ہے۔“

محمدّ بن قاسم نے خط کھولا اور چند سطور پڑھنے کے بعد اُس کا چہرہ حیا سے سُرخ ہو گیا اس نے خط ختم کیے بغیر ماں کے آگے رکھ دیا اور دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا۔

”کیوں بیٹا! کیا سوچ رہے ہو۔“

”کُچھ نہیں امّی!“

”بیٹا! یہ میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو تھی اور حجّاج سے نفرت کے باوجود میں یہ دُعا کرتی تھی کہ زبیدہ میری بہو بنے۔ پچھلے دِنوں وہ باپ سے چھپ چھپ کر میری تیمار داری کرتی رہی۔ سچ کہتی ہوں کہ اگر میری کوئی اپنی لڑکی بھی ہوتی تو شاید میرا اسی قدر خیال کرتی۔۔۔۔ مُجھے یہ ڈر تھا کہ حجّاج بن یوسف کبھی یہ گوارا نہ کرے گا اور میں خدا سے تمہاری عزّت، ترقّی اور شہرت کے لیے دُعائیں کیا کرتی تھی۔ میں جب بھی زبیدہ

کو دیکھتی، میرے منہ سے یہ دُعا نکلتی۔ ”یا اللہ! میرے بیٹے کو ایسا بنا دے کہ حجّاج اُسے اپنا داماد بنانے پر فخر محسوس کرے۔ آج میری آرزوئیں پوری ہوئیں۔ لیکن یہ خیال نہ کرنا کہ میں صرف اس لیے خوش ہوں کہ تم والئ بصرہ کے داماد بنو گے۔ بلکہ میں اس لیے خوش ہوں کہ مدینہ، دمشق اور بصرہ میں میں نے زبیدہ جیسی لڑکی نہیں دیکھی۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ دمشق میں یا کہیں اور جانے سے پہلے تمہاری شادی کر دی جائے، تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہو گا بیٹا!“

”امّی! آپ کو خوش رکھنا میں دنیا کی سب سے بڑی سعادت سمجھتا ہوں لیکن ماموں جان حجّاج سے بہت نفرت کرتے ہیں۔“

”اس کے باوجود وہ زبیدہ کو انہی نگاہوں سے دیکھتے ہیں جن سے میں دیکھتی ہوں۔ تُم ان کی فکر نہ کرو۔

(۶)

تین ہفتوں کے بعد بصرہ، کوفہ اور عراق کے دوسرے شہروں میں یہ خبر

حیرت و استعجاب سے سُنی گئی کہ حجّاج بن یوسف نے جو عالمِ اسلام کی کسی بڑی شخصیت کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ اپنے بھائی قاسم کے یتیم اور غریب لڑکے کے ساتھ اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی کر دی۔ دعوتِ ولیمہ میں شہر کے معزّزین کے محمدّ بن قاسم کے بہت سے دوست اور ہم مکتب شریک تھے۔

اگلے دِن حجّاج بن یوسف نے محمدّ بن قاسم کو بلا کر یہ خوشخبری سُنائی کہ دمشق سے خلیفۃ المسلمین کا ایلچی آ گیا ہے۔ اُنہوں نے لکھا ہے کہ تمہیں فوراً دمشق بھیج دیا جائے۔

محمدّ بن قاسم نے کہا۔ "میں جانے کے لیے تیّار ہوں لیکن دربارِ خلافت کے بڑے بڑے عہدہ دار مُجھے دیکھ کر یہی سمجھیں گے کہ آپ کی وجہ سے میرے ساتھ پہلے جا رعایت کی گئی ہے۔"

حجّاج نے جواب دیا۔ "قیمتی پتھّر اپنی ضخامت سے نہیں، بلکہ چمک سے پہچانے جاتے ہیں۔ میں نے فقط تمہاری فطری صلاحیتوں کی نشو و نما ایک موزوں ماحول تلاش کیا ہے، دربارِ خلافت میں تم صیغۂ امورِ حرب کی

مجلس شوریٰ کے ایک رکن کی حیثیت سے کام کرو گے اور اگر تم اپنے رفقائے کار اور خلیفہ کو میری طرح متاثر کر سکے تو یقین رکھو کہ کسی کو تمہاری کم عُمری کی شکایت نہیں ہو گی۔"

محمدؐ بن قاسم نے کہا۔ "لیکن میں حیران ہوں کہ صیغۂ امور حرب کی مجلسِ شوریٰ دمشق میں کیا کرتی ہے! خلیفہ نے امورِ حرب کی تمام ذمّہ داری تو آپ کو سونپ رکھی ہے۔ سپہ سالاروں کے ایلچی براہ راست آپ کے پاس آتے ہیں، نقل و حرکت کے تمام احکام آپ کی طرف سے جاتے ہیں۔"

"یہ اس لیے کہ مجلسِ شوریٰ میں تمہارے جیسے سرگرم اور بیدار مغز ارکان کی کمی ہے اور اُن کا بہت سا بوجھ مُجھ پر ڈال دیا گیا ہے۔ اب تُم وہاں جاؤ گے تو کم از کم میرے سر سے افریقہ کے محاذ کی نگرانی کا بوجھ ختم جائے گا۔ افریقہ کے حالات میں ذرا سی تبدیلی پر امیر المومنین مُجھے ہر دوسرے تیسرے مہینے مشورے لینے کے لیے بُلاتے ہیں۔ مُمکن ہے کہ تمہاری صلاحیتیں دیکھ کر مُجھے وہ بار بار بلانے کی ضرورت محسوس نہ کریں اور میں ترکستان کے محاذ کی طرف زیادہ توجّہ دے سکوں۔"

محمدؒ بن قاسم نے پوچھا۔ "مجھے کب جانا چاہیے؟"

"میرے خیال میں تم کل ہی روانہ ہو جاؤ۔ میں چند دِنوں تک تمہاری والدہ اور زبیدہ کو دمشق بھیجنے کا انتظام کر دوں گا۔" محمدؒ بن قاسم رُخصت ہونے کو تھا کہ حبشی غلام نے اندر آ کر حجّاج بن یوسف کو اطلاع دی کہ ایک نوجوان حاضر ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں سراندیپ سے نہایت اہم خبر لے کر آیا ہوں۔"

حجّاج بن یوسف نے کہا۔ "بلاؤ اسے اور محمدؒ تم بھی ٹھہرو! میرا دِل گواہی دیتا ہے کہ سراندیپ سے کوئی اچھّی خبر نہیں آئی۔"

غلام کے جانے کے تھوڑی دیر بعد زبیر اندر داخل ہوا۔ اس کے کپڑے گرد و غبار سے اٹے ہوئے تھے اور خوبصورت چہرے پر حزن و ملال اور تھکاوٹ کے آثار تھے۔ حجّاج بن یوسف نے اُسے دیکھتے ہی پہچان لیا اور کہا۔ "زبیر! آ گئے۔ تمہارا جہاز۔۔۔۔!"

زبیر نے جواب دیا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے پاس اچھّی خبر لے

کر نہیں آیا۔ سندھ کے ساحل پر دیبل کے گورنر نے ہمارا جہاز لُوٹ لیا ہے۔ دوسرا جہاز جس پر سراندیپ کے راجہ نے آپ کے اور خلیفہ کے لیے تحائف بھیجے تھے، وہ بھی لوٹ لیا ہے اور مسلمانوں کے یتیم بچّے جنہیں میں لینے کے لیے گیا تھا، قید کر لیے ہیں۔"

حجّاج نے کہا۔ "تُم یہاں کیسے پہنچے۔ مُجھے تمام واقعات بتاؤ۔"

زبیر نے شروع سے لے کر آخر تک اپنی سرگزشت سُنائی۔ حجّاج بن یوسف کی آنکھوں میں غم و غصّہ کے شعلے بھڑکنے لگے۔ اس کے چہرے پر پُرانی ہیبت چھا گئی اور وہ ہاتھوں کی مُٹھّیاں بھینچتا اور ہونٹ چباتا ہوا کمرے میں چکّر لگانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک دیوار کے قریب رُک کر ہندوستان کے نقشے کی طرف دیکھنے لگا اور اُس کے مُنہ سے ایک زخمی شیر کی گرج سے ملتی جُلتی آواز نکلی۔ "سندھ کے راجہ کی یہ جرأت؟ بکریاں بھی شیروں کو سینگ دکھانے لگیں۔ شاید اُسے بھی یہ معلوم ہو گیا ہے کہ ہماری افواج شمال اور مغرب میں پھنسی ہوئی ہیں۔"

یہ کہہ کر حجّاج زبیر کی طرف متوجّہ ہوا۔ "تُم نے ابھی تک بصرہ میں تو کسی

کو یہ خبر نہیں سُنائی۔"

زبیر نے جواب دیا۔ "نہیں! میں سیدھا آپ کے پاس آیا ہوں۔"

حجّاج بن یوسف نے کہا۔ "سندھ کی طرف سے اس سے زیادہ صریح الفاظ میں ہمارے خلاف اعلانِ جنگ نہیں ہو سکتا لیکن تُم جانتے ہو کہ اِس وقت ہماری مجبوریاں ہمیں ایک نئے محاذ کی طرف پیش قدمی کی اجازت نہیں دیتیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ الم ناک خبر ابھی عوام تک نہ پہنچے، وہ خود جہاد پر جانے کے لیے تیّار ہوں یا نہ ہوں لیکن مُجھے کوسنے میں کوتاہی نہیں کریں گے۔"

زبیر نے کہا۔ "آپ کا مطلب ہے کہ آپ یہ سب کُچھ خاموشی سے برداشت کرلیں گے۔"

حجّاج نے جواب دیا۔ "سرِ دست خاموشی کے سوا میرے لیے کوئی چارہ نہیں۔ میں مکران کے گورنر کو لکھتا ہوں کہ وہ خود سندھ کے راجہ کے پاس جائے۔ مُمکن ہے کہ وہ اپنی غَلَطی کی تلافی کے لیے آمادہ ہو جائے اور

مسلمان بچّوں کو اُس کے حوالے کر دے۔“

زبیر نے کہا۔ ”میں آپ کو یقین دِلاتا ہوں کہ وہ اپنی غَلَطی کے اعتراف کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ ابو الحسن کا جہاز لاپتہ ہونے پر بھی آپ نے مکران کے گورنر کو وہاں بھیجا تھا لیکن اُنہوں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا اور مُجھے یقین ہے کہ ابو الحسن کا جہاز بھی لوٹا گیا تھا اور وہ اور اس کے چند ساتھی ابھی تک راجہ کی قید میں ہیں۔ میں خود بھی مکران کے عاملِ سے مل کر آیا ہوں۔ وہ یہ کہتے تھے کہ اُن کے ساتھ راجہ اور اُس کے اہل کار گزشتہ ملاقات میں نہایت ذِلّت آمیز سلوک کر چکے ہیں۔ اس لیے وہ بذاتِ خود دوبارہ اُس کے پاس جانا پسند نہیں کرتے۔ تاہم اُنہوں نے آپ کا مشورہ لیے بغیر مکران کے سالارِ اعلیٰ عبید اللہ کی قیادت میں دیبل کے حاکم کے پاس ایک وفد بھیج دی ہے۔ جو کُچھ میں دیکھ چکا ہوں اس سے میرا اندازہ ہے کہ دیبل کا راجہ انتہا درجے کا بے رحم اور ہٹ دھرم ہے اور عبید اللہ بھی کافی جوشیلا ہے، مُمکن ہے کہ وہاں ان کے ساتھ بھی وہی سلوک ہو جو ہمارے ساتھ ہو چکا ہے اور وہ راجہ سے ملاقات کرنے سے

پہلے ہی کسی خطرے کا شکار ہو جائیں۔‘‘

حجّاج نے کہا۔ ’’تاہم میں عبید اللہ کی واپسی کا انتظار کروں گا۔‘‘

’’اور اگر وہ بھی اچھّی خبر نہ لایا تو؟‘‘

’’میں کُچھ نہیں کہہ سکتا۔ سندھ ایک وسیع ملک ہے اور ہمیں وہاں لشکر کشی سے پہلے ایک لمبی تیّاری کی ضرورت ہے۔ یہ بھی مُمکن ہے کہ امیر المومنین، ترکستان، افریقہ اور اُس کے بعد شاید اندلس کی فتح سے پہلے ہمیں سندھ پر لشکر کشی کی اجازت نہ دیں۔‘‘

محمدّ بن قاسم اب تک خاموشی سے یہ باتیں سُن رہا تھا۔ اُس نے زبیر کی مایوس نگاہوں سے متاثر ہو کر کہا۔ ’’خلیفہ کو رضا مند کرنے کی ذمّہ داری میں لیتا ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں کل کی بجائے آج ہی دمشق روانہ ہو جاؤں۔‘‘

حجّاج نے جواب دیا۔ ’’برخوردار! جاتے ہی خلیفہ کو ایسا مشورہ دے کر تم اپنی سپاہیانہ صلاحیتوں کا اچھّا مظاہرہ نہیں کرو گے۔ تمہاری غیرت اور

شجاعت میں کلام نہیں لیکن دُشمنوں کے قلعے خالی تدبیروں سے فتح نہیں ہوتے۔ اس مہم کے لیے بہت سے سپاہیوں کی ضرورت ہو گی اور عراق، عرب اور شام کے کسی مستقر میں ہمارے پاس زائد افواج نہیں۔۔۔‘‘

محمدؐ بن قاسم نے جواب دیا۔ ’’میں مسلمانوں کی غیرت سے مایوس نہیں۔ ایسی خبر اُن لوگوں کو بھی متاثر کر سکتی ہے جنہیں آرام کی زندگی جذبۂ جہاد سے محروم کر چکی ہے۔ مُمکن ہے کہ آپ اپنی عمر کے لوگوں سے مایوس ہوں لیکن میں نوجوانوں سے مایوس نہیں۔ وہ نوجوان جو آپ اور خلیفہ سے اختلاف کے باعث ترکستان اور افریقہ جا کر لڑنا پسند نہیں کرتے۔ مسلمان بچّوں پر سندھ کے راجہ کے مظالم کی داستان سُن کر یقیناً متاثر ہوں گے۔ ہزاروں نوجوان ایسے ہیں جن کی حمیت ابھی تک فنا نہیں ہوئی۔ وہ مسلمان جن سے آپ مایوسی ہیں، مرے نہیں، سو رہے ہیں اور قوم کے یتیم بچّوں کی فریاد یقیناً اُن کے لیے صورِ اسرافیل ثابت ہو گی۔‘‘

حجّاج بن یوسف گہری سوچ میں پڑ گیا۔ زبیر نے موقع دیکھ کر ایک سفید رومال جس پر ناہید کی تحریر تھی، اپنی جیب سے نکال کر اُسے پیش کیا اور

کہا۔

”آپ کے نام یہ مکتوب ابو الحسن کی لڑکی نے اپنے خون سے لکھا تھا اور مُجھ سے کہا تھا کہ اگر حجّاج بن یوسف کا خون منجمد ہو چکا ہو تو میرا یہ خط پیش کر دینا ورنہ اس کی ضرورت نہیں۔“

حجّاج بن یوسف رومال پر خون سے لکھی ہوئی تحریر کی چند سطور پڑھ کر کپکپا اُٹھا اور اُس کی آنکھوں کے شعلے پانی میں تبدیل ہونے لگے۔ اس نے رومال محمدؐ بن قاسم کے ہاتھ میں دے دیا اور خود دیوار کے پاس جا کر ہندوستان کا نقشہ دیکھنے لگا۔ محمدؐ بن قاسم نے شروع سے لے کر آخر تک یہ مکتوب پڑھا۔ مکتوب کے الفاظ یہ تھے۔

”مُجھے یقین ہے کہ والئ بصرہ قاصد کی زبانی مسلمان بچّوں اور عورتوں کا حال سُن کر اپنی فوج کے غیوّر سپاہیوں کو گھوڑوں پر زینیں ڈالنے کا حکم دے چکا ہو گا اور قاصد کو میرا یہ خط دِکھانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اگر حجّاج بن یوسف کا خون منجمد ہو چکا ہے تو شاید میری تحریر بھی بے سود ثابت ہو۔ میں ابو الحسن کی بیٹی ہوں۔ میں اور میرا بھائی ابھی تک

دُشمن کی دسترس سے محفوظ نہیں لیکن ہمارے ساتھی ایک ایسے دُشمن کی قید میں ہیں جس کے دِل میں رحم کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ قید خانے کی اس تاریک کوٹھری کا تصوّر کیجیے جس کے اندر اسیروں کے کان مجاہدینِ اسلام کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سُننے کے لیے بے قرار ہیں۔ یہ ایک معجزہ تھا کہ میں اور میرا بھائی دُشمن کی قید سے بچ گئے تھے لیکن ہماری تلاش جاری ہے اور مُمکن ہے کہ ہمیں بھی کسی تاریک کوٹھڑی میں پھینک دیا جائے۔ مُمکن ہے کہ اِس سے پہلے ہی میرا زخم مُجھے موت کی نیند سُلا دے اور میں عبرت ناک انجام سے بچ جاؤں لیکن مرتے وقت مُجھے یہ افسوس ہو گا کہ وہ صبا رفتار گھوڑے جن کے سوار ترکستان اور افریقہ کے دروازے کھٹکھٹا رہے ہیں، اپنی قوم کے یتیم اور بے بس بچّوں کی مدد کو نہ پہنچ سکے۔ کیا یہ مُمکن ہے کہ وہ تلوار جو روم و ایران کے مغرور تاجداروں کے سر پر صاعقہ بن کر کوندی، سندھ کے مغرور راجہ کے سامنے کُند ثابت ہو گی۔ میں موت سے نہیں ڈرتی لیکن اے حجّاج! اگر تُم زندہ ہو تو اپنی غیوّر قوم کے یتیموں اور بیواؤں کی مدد کو پہنچو!!

ناہید! ایک غیّور قوم کی بے بس بیٹی محمدّ بن قاسم نے رومال لپیٹ کر زبیر کے حوالے کیا اور حجّاج بن یوسف کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ گرد و پیش سے بے خبر سا ہو کر نقشے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

محمدّ بن قاسم نے پوچھا۔ ”آپ نے کیا فیصلہ کیا؟“

حجّاج بن یوسف نے خنجر نکالا اور اُس کی نوک سندھ کے نقشے میں پیوست کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں سندھ کے خلاف اعلانِ جہاد کرتا ہوں۔ محمدّ تم آج ہی دمشق روانہ ہو جاؤ۔ زبیر کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ یہ مکتوب بھی امیر المومنین کو دِکھا دینا۔ جتنی فوج دمشق سے فراہم ہو لے کر یہاں پہنچ جاؤ۔ میرا خط بھی امیر المومنین کے پاس لے جاؤ۔ واپس آنے میں دیر نہ کرنا۔ ہاں! اگر امیر المومنین متاثر نہ ہوں تو دمشق کی رائے عامہ کو اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کرنا اور مُجھے یقین ہے کہ امیر المومنین عوام میں زندگی کے آثار دیکھ کر سندھ کے خلاف اعلانِ جہاد میں پس و پیش نہیں کریں گے۔ میں تمھیں ایک بہت بڑی ذمّہ داری سونپ رہا ہوں اور دمشق سے واپس آنے پر شاید تمھیں اِس سے کہیں زیادہ اہم ذمّہ داری

سونپ دی جائے۔ میرا خط دِکھانے پر تمہیں راستے کی ہر چوکی سے تازہ دم گھوڑے مل جائیں گے۔ اب جا کر تیّار ہو آؤ۔ اتنی دیر میں میں خط لکھتا ہوں اور زبیر تُم بھی تیّار ہو جاؤ۔“

حجّاج بن یوسف نے تالی بجائی اور ایک حبشی غلام بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا۔

حجّاج نے کہا۔ ”اُنہیں مہمان خانے میں لے جاؤ۔ کھانا کھلانے کے بعد اِن کے کپڑے تبدیل کراؤ اور اِن کے سفر کے لیے دو بہترین گھوڑے تیّار کرو۔“

بصرہ سے دمشق تک

چند دِنوں کی یلغار کے بعد محمدؒ بن قاسم اور زبیر ایک صُبح دمشق سے چند کوس کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی بستی سے باہر فوجی چوکی پر اُترے۔ محمدؒ بن قاسم نے چوکی کے افسر کو حجّاج بن یوسف کا خط دِکھایا اور تازہ دم گھوڑے تیّار کرنے اور کھانا لانے کا حکم دیا۔

افسر نے جواب دیا۔ ”کھانا حاضر ہے لیکن آج گھوڑے شاید آپ کو نہ مل سکیں۔ ہمارے پاس اِس وقت صرف پانچ گھوڑے ہیں۔“

محمدؒ بن قاسم نے کہا۔ ”لیکن ہمیں تو صرف دو چاہئیں۔“

"لیکن اُن گھوڑوں پر امیر المومنین کے بھائی سلیمان بن عبد الملک اور اُن کے ساتھی دمشق روانہ ہونے والے ہیں۔ کل چونکہ دمشق میں فنونِ حرب کی نمائش ہو گی، اِس لیے ان کا آج شام تک وہاں پہنچنا ضروری ہے۔ میں نہ والیٔ بصرہ کے حکم سے سرتابی کر سکتا ہوں اور نہ امیر المومنین کے بھائی کو ناراض کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ بہت سخت طبیعت کے آدمی ہیں۔"

"وہ کہاں ہیں؟"

"وہ وہ اندر آرام فرما رہے ہیں۔ غالباً! دوپہر کے بعد یہاں سے روانہ ہوں گے۔ اگر آپ کا کام بہت ضروری ہے تو اُن سے اجازت لے لیجیے۔ دوپہر تک اُن کے گھوڑے تازہ دم ہو جائیں گے۔ ویسے بھی کوئی بڑی منزل طے کر کے نہیں آئے۔ آپ کھانا کھا کر اُن سے پوچھ لیں۔ بذاتِ خود میں آپ کو منع نہیں کرتا۔ آپ لے جائیں تو آپ کی مرضی لیکن ہماری شامت آجائے گی۔"

زبیر اور محمدؐ بن قاسم نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر کھانا کھایا اور محمدؐ بن

قاسم اندر جانے کے ارادے سے اٹھا لیکن زبیر نے کہا۔ ”کیا یہ ضروری ہے کہ ہم سلیمان کی اجازت حاصل کریں۔ یہ گھوڑے صرف فوجی ضروریات کے لیے یہاں رکھے گئے ہیں اور سلیمان سیر و تفریح کے لیے دمشق جا رہا ہے۔ اُسے فوجی معاملات میں رکاوٹ پیدا کرنے کا حق نہیں دیا جا سکتا۔ گھوڑے اصطبل میں تیّار کھڑے ہیں۔ شہزادہ سلیمان دوپہر تک آرام فرمائے گا۔ اس کے بعد کُچھ دیر آئینہ سامنے رکھ کر اپنے خادموں سے اپنی خوبصورتی کی تعریف کرے گا۔ اُس کے بعد اپنے اشعار کی داد لے گا۔ پھر اپنی نیزہ بازی اور شہسواری کی تعریف سُنے گا۔ اِس کے بعد مُمکن ہے کہ شام کے وقت سپاہیوں کو حُکم دے کہ گھوڑوں کی زینیں اُتار دو، ہم صُبح جائیں گے۔“

محمدؐ بن قاسم نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے آپ سلیمان بن عبد الملک کے متعلّق بہت کُچھ جانتے ہیں۔“

”ہاں! میں اُسے اچھّی طرح جانتا ہوں۔ عالمِ اسلام میں شاید اُس سے زیادہ مغرور اور خود پسند آدمی کوئی نہ ہو۔ اِس لیے میں یہ کہتا ہو کہ مُجھے اُس سے

کسی اچھّے جواب کی اُمّید نہیں۔" محمدّ بن قاسم نے جواب دیا۔ "مجھے صرف یہی خیال ہے کہ ہمارے چلے جانے کے بعد چوکی کے سپاہیوں کی شامت آجائے گی۔ اِس لیے اُس سے پوچھ لینے میں کوئی حرج نہیں۔"

"آپ کی مرضی، لیکن آپ پوچھنے جائیں اور میں اتنی دیر میں اصطبل سے دو گھوڑے کھول کر لاتا ہوں۔"

محمدّ بن قاسم نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ سلیمان اپنے ساتھیوں کے درمیان دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ دو خادم اُس کے پاؤں دبا رہے تھے۔

محمدّ بن قاسم السّلام علیکم کہہ کر اندر داخل ہوا۔ سلیمان نے بے پروائی سے اُس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔ "تم کون ہو؟ کیا چاہتے ہو؟"

محمدّ بن قاسم نے اُس کی ترش کلامی سے لاپروائی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"معاف کیجیے، میں آپ کے آرام میں مخل ہوا۔ میں آپ کو یہ بتانے آیا تھا کہ میں دمشق میں ایک ضروری پیغام لے کر جارہا ہوں۔"

"جاؤ، ہم نے کب روکا تمہیں؟" سلیمان کے ساتھیوں نے اُس پر ایک قہقہہ لگایا لیکن محمدؐ بن قاسم نے اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا:

"ہمارے گھوڑے بہت تھکے ہوئے ہیں اور میں اِس چوکی سے دو تازہ گھوڑے لے جارہا ہوں۔ اِس کے لیے مُجھے آپ کی اجازت کی ضرورت تو نہ تھی لیکن میں نے اس خیال سے آپ کی ملاقات ضروری سمجھی کہ آپ خوامخواہ چوکی کے سپاہیوں کو بُرا بھلا نہ کہیں۔"

سلیمان نے ذرا اکڑ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اگر تمہارے گھوڑے تھکے ہوئے ہیں تو تُم پیدل جاسکتے ہو۔"

محمدؐ بن قاسم نے جواب دیا۔ "ایک سپاہی کے لیے پیدل چلنا باعثِ عار نہیں لیکن میں بہت جلد دمشق پہنچنا چاہتا ہوں۔"

"تو تم سپاہی ہو۔ تمہارے نیام میں لکڑی کی تلوار ہے یا لوہے کی؟" سلیمان کے ساتھیوں نے پھر ایک قہقہہ لگایا۔

محمدؐ بن قاسم نے پھر اطمینان سے جواب دیا۔ "اگر بازوؤں میں طاقت ہو تو

لکڑی سے بھی لوہے کا کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن میں آپ کو یقین دِلاتا ہوں کہ میری تلوار بھی لوہے کی ہے اور مُجھے اپنے بازوؤں پر بھی بھروسہ ہے۔"

سلیمان نے اپنے ایک ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "صالح! یہ لڑکا باتوں میں کافی ہوشیار معلوم ہوتا ہے۔ ذرا اٹھو، میں اِس کے سپاہیانہ جوہر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

ایک گندمی رنگ کا قوی ہیکل شخص فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور نیام سے تلوار نکال کر آگے بڑھا۔

محمدّ بن قاسم نے کہا۔ "میں راہ چلتوں کے سامنے اپنی سپاہیانہ صلاحیتوں کی نمائش کرنے کا عادی نہیں اور نہ میرے پاس اتنا وقت ہی ہے اور اگر وقت ہوتا تو بھی میں کرائے پر قہقہے لگانے والوں سے دل لگی کرنا ایک سپاہی کے لیے باعثِ عار سمجھتا ہوں۔"

محمدّ بن قاسم یہ کہہ کر باہر نکل آیا لیکن صالح نے آگے بڑھ کر تلوار کی

نوک سامنے کرتے ہوئے اُس کا راستہ روک لیا اور کہا۔ ”بے وقوف! اگر تمہاری عمر دو چار سال اور زیادہ ہوتی، تو میں تمہیں بتاتا کہ کرائے پر قہقہہ لگانے والا کسے کہتے ہیں۔“

سامنے زبیر ایک گھوڑے پر سوار ہو کر دوسرے گھوڑے کی لگام تھامے ہوئے تھا۔ سلیمان نے باہر نکل کر کہا۔ ”اسے جانے دو یہ بے چارہ خُدا جانے کہاں سے تلوار اُٹھا لایا ہے۔ لیکن وہ کون ہے؟“

اُس نے زبیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اُسے روکو!“

صالح زبیر کی طرف متوجہ ہوا لیکن آنکھ جھپکنے میں محمدؐ بن قاسم کی تلوار نیام سے باہر آچکی تھی۔ اُس نے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ ایّامِ جاہلیت کے عرب اب بھی اِس دنیا میں موجود ہیں لیکن تُم ہمیں نہیں روک سکتے۔“

صالح تلوار کی نوک اُس کے سینے کی طرف بڑھاتے ہوئے چلّایا۔ ”اگر تمہاری زبان سے ایک لفظ اور نکلا تو میری تلوار خون میں نہائے بغیر نیام میں۔۔۔۔“

لیکن اُس کا فقرہ پورا ہونے سے پہلے محمدؐ بن قاسم کی تلوار کی جُنبش سے ہوا میں ایک سنسناہٹ اور پھر دو تلواروں سے ٹکرانے سے جھنکار پیدا ہوئی اور اُس کے ساتھ ہی صالح کی تلوار اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دس قدم دور جا پڑی اور وہ حیرت، ندامت اور پریشانی کی حالت میں اپنے ساتھیوں اور اُس کے ساتھی دم بخود ہو کر محمدؐ بن قاسم کی طرف دیکھ رہے تھے۔

سلیمان نے اپنے ساتھی کی بے بسی کو دیکھ کر زور سے قہقہہ لگایا لیکن محمدؐ بن قاسم کو گھوڑے پر سوار ہوتا دیکھ کر قہقہے کی آواز اُس کے گلے میں اٹک گئی اور اُس نے چلّا کر کہا۔ "ٹھہرو!"

محمدؐ بن قاسم نے گھوڑے کی لگام موڑتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "آپ کا ساتھی بہادر ہے لیکن تلوار پکڑنا نہیں جانتا۔ میرا مشورہ ہے کہ اپنے ساتھیوں کو دمشق کی نمائش میں لے جانے سے پہلے کسی سپاہی کے سپرد کریں۔ "

یہ کہہ کر محمدؐ بن قاسم نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی اور دونوں آن کی آن

میں درختوں کے پیچھے غائب ہو گئے۔ صالح غصّے سے اپنے ہونٹ کاٹتا ہوا اصطبل کی طرف بھاگا۔ سلیمان نے کہا:

"بس اب رہنے دو۔ تُم اُن کا کُچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ایک نوجوان لڑکا ہم سب کا منہ چڑا کر نکل گیا۔"

راستے میں زبیر نے محمّد بن قاسم سے کہا۔ "دیکھ لیا شہزادہ سلیمان کو۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ وہ خلافت کا اُمّیدوار بھی ہے۔"

محمّد بن قاسم نے کہا۔ "خُدا مسلمانوں کو شر سے بچائے۔"

زبیر نے کہا۔ "محمّد! آج میں نے پہلی دفعہ تمہارے چہرے پر جلال دیکھا ہے۔ تلوار نکالتے وقت تُم اپنی عمر سے کئی سال بڑے معلوم ہوتے تھے اور جانتے ہو وہ شخص جسے تُم نے مغلوب کیا ہے کون تھا؟ وہ صالح تھا۔ قریباً ڈیڑھ سال ہوا، میں نے اِسے کوفہ میں دیکھا تھا۔ اِسے تیغ زنی میں اپنے کمال پر ناز ہے لیکن آج اِس کا غرور اُسے لے ڈوبا۔"

(۲)

دمشق کی جامع مسجد میں نمازِ عصر ادا کرنے کے بعد محمدؐ بن قاسم اور زبیر قصرِ خلافت میں داخل ہوئے۔ خلیفہ ولید کے دربان نے اُن کی آمد کی اطلاع پاتے ہی اُنہیں اندر بُلا لیا۔ ولید بن عبد الملک نے یکے بعد دیگرے اُن دونوں کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پوچھا ''تُم میں سے محمدؐ بن قاسم کون ہے؟''

محمدؐ بن قاسم نے جواب دیا۔ ''میں ہوں۔''

حاضرینِ دربار جن کی نگاہیں زبیر پر مرکوز ہو چکی تھیں، حیرت زدہ ہو کر محمدؐ بن قاسم کی طرف متوجّہ ہوئے اور اُن کی خاموش نگاہیں آپس میں سرگوشیاں کرنے لگیں۔ حجّاج بن یوسف کے گزشتہ مکتوب سے ولید کو معلوم ہو چکا تھا کہ محمدؐ بن قاسم بالکل نوجوان ہے لیکن اِس کے باوجود وہ بھی درباریوں کی طرح زبیر ہی کو حجّاج بن یوسف کا ہونہار بھتیجا سمجھ رہا تھا۔ اور سولہ سترہ سالہ نوجوان کو قتیبہ کے لشکر کے ہراول کا سالارِ اعلیٰ تسلیم کرنے کے لیے تیّار نہ تھا۔

آنکھوں کے اِشاروں کے ساتھ دربار کی زبانیں بھی ملنے لگیں۔ ولید نے اچانک یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اُس کے خاندان کے سب سے بڑے محُسن حجّاج بن یوسف کے متعلّق کُچھ کہا جارہا ہے، مسند سے اُٹھ کر محمدؐ اور زبیر سے مصافحہ کیا اور اُنہیں اپنے قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔ ”وہ مجاہد جس کے متعلّق حجّاج بن یوسف جیسا مردم شناس اور قتیبہ بن مسلم جیسا سپہ سالار اِس قدر بُلند رائے رکھتے ہوں، میرے لیے یقیناً قابلِ احترام ہے۔“ پھر اُس نے محمدؐ بن قاسم سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ”اور تمہارا بڑا بھائی ہے؟“

”نہیں امیر المومنین، یہ زبیر ہے۔“

ولید نے زبیر کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے شاید پہلے بھی تمہیں دیکھا ہے۔ شاید تُم سراندیپ کے ایلچی کے ساتھ گئے تھے۔ تُم کب آئے اور وہ بچّے کہاں ہیں؟“

خلیفہ کی طرح حاضرینِ دربار کی توجّہ بھی زبیر پر مرکوز ہو گئی اور بعض نے اُسے پہچان لیا۔ زبیر کا تذبذب دیکھ کہ محمدؐ بن قاسم نے جلدی سے حجّاج

بن یوسف کا خط پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”امیر المومنین! ہم ایک نہایت ضروری پیغام لے کر آئے ہیں۔ آپ ملاحظہ فرمائیں۔۔۔۔۔ “

ولید نے خط کھول کر پڑھا اور کُچھ دیر سوچنے کے بعد حاضرینِ دربار سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”سندھ کے راجہ نے ہمارا جہاز لوٹ لیا ہے۔ سراندیپ سے آنے والی بیواؤں اور یتیم بچّوں کو قید کر لیا ہے۔ زبیر تُم اپنی تمام سرگزشت خود سناؤ!“ زبیر نے شروع سے لے کر آخر تک تمام واقعات بیان کیے لیکن دربار میں جوش و خروش کی بجائے مایوسی کے آثار پا کر اختتام پر اُس کی آواز بیٹھ گئی اور اُس نے جیب سے رومال نکال کر خلیفہ کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”ابو الحسن کی بیٹی نے یہ خط والئ بصرہ کے نام لکھا تھا۔ “

حجّاج بن یوسف کی طرح ولید بھی یہ خط پڑھ کر بے حد متاثر ہوا۔ اُس نے اہلِ دربار کو سُنانے کے لیے خط کو دوسری بار بُلند آواز میں پڑھنے کی کوشش کی لیکن چند فقرے پڑھنے کے بعد اُس کی آواز رُک گئی۔ اُس نے مکتوب محمدؐ بن قاسم کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ ”تم پڑھ کر سُنا دو!“

محمدؒ بن قاسم نے سارا خط پڑھ کر سُنایا۔ مجلس کا رنگ بدل چُکا تھا۔ حاضرین میں سے اکثر کے چہرے یہ ظاہر کر رہے تھے کہ جذبات کا طوفان عقل کی مصلحتوں کو مغلوب کر چکا ہے لیکن ولید کو خاموش دیکھ کر سب کی زبانیں گنگ تھیں۔ شہر کا عمر رسیدہ قاضی دیر تک اِس خاموشی کو برداشت نہ کر سکا۔ اُس نے کہا۔ ”امیر المومنین! اب آپ کو کس بات کا انتظار ہے۔ یہ سوچنے کا موقع نہیں۔ پانی سر سے گُزر چکا ہے۔“

ولید نے پوچھا۔ ”آپ کی کیا رائے ہے؟“

قاضی نے جواب دیا۔ ”امیر المومنین! فرض کے معاملے میں رائے سے کام نہیں لیا جاتا۔ رائے صرف اُس وقت کام دے سکتی ہے جب سامنے دو رائے ہوں لیکن ہمارے سامنے صرف ایک ہی راستہ ہے۔“

ولید نے کہا۔ ”میں آپ سب کی رائے پوچھتا ہوں۔“

ایک عہدیدار نے کہا۔ ”ہم میں سے کوئی بھی اُلٹے پاؤں چلنا نہیں جانتا۔“

ولید نے کہا۔ ”لیکن ہمارے پاس افواج کہاں ہیں؟ موسیٰ کا پیغام آ چکا ہے

کہ وہ اندلس پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ دوسری طرف ترکستان میں عراق کی تمام افواج کو قتیبہ اپنے لیے کافی نہیں سمجھتا۔ ہمیں نیا محاذ کھولنے کے لیے یا تو اُن میں سے ایک محاذ کمزور کرنا پڑے گا یا اور کُچھ مدّت انتظار کرنا پڑے گا۔"

قاضی نے جواب دیا۔ "امیر المومنین! یہ خط سُننے کے بعد ہم میں سے کوئی ایسا نہیں جو انتظار کا مشورہ دے۔ اگر آپ یہ معاملہ عوام کے سامنے پیش کریں تو مُجھے اُمّید ہے کہ سندھ کی مہم کے لیے ترکستان یا افریقہ سے افواج منگوانے کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔"

ولید نے کہا۔ "اگر آپ عوام کو جہاد کے لیے آمادہ کرنے کی ذمّہ داری لینے کے لیے تیّار ہیں۔ تو میں بھی اعلانِ جہاد کرنے کے لیے تیّار ہوں۔"

قاضی متذبذب سا ہو کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔

ولید نے کہا: "میں عوام سے مایوس نہیں۔ مُجھے صرف یہ شکایت ہے کہ ہمارا اہل الرائے طبقہ خود غرض اور خود پسند ہو چکا ہے۔ آپ جانتے ہیں

جب موسیٰ بن نصیر نے افریقہ میں پیش قدمی کی تھی تو اُونچے طبقے کے کئی آدمیوں نے ہماری مخالفت کی تھی۔ جب قتیبہ نے مرو پر حملہ کیا تھا تو میرے اپنے ہی بھائی سلیمان نے مخالفت کی تھی۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ بااثر طبقے میں جو لوگ کُچھ مخلص نہیں، وہ کاہل اور تن آسان ہیں اور گھروں میں بیٹھے روئے زمین پر غلبہ اسلام کے لیے اپنی نیک دعاؤں کو کافی سمجھتے ہیں۔ اگر آپ سب کو عوام تک پہنچنے کی کوشش کریں تو چند دِنوں میں ایک ایسی فوج تیّار ہو سکتی ہے جو نہ صرف سندھ بلکہ تمام دِیا کی تسخیر کے لیے کافی ہو۔ لیکن بُرا نہ مانیں، آپ تھوڑی دیر کے لیے متاثر ہوئے ہیں اور ایک یا دو دِن عوام کو بلکہ اپنے جیسے اُونچے طبقوں کے بے عمل لوگوں کو یہ خبر سُنانے میں ایک لذّت محسوس کریں گے۔ سندھ کے ظالم راجہ کو بُرا بھلا کہیں گے اور اِس کے بعد بنی اسرائیل کی طرح دُنیا اور عاقبت کا بوجھ خدا کے سر تھوپ کر آرام سے بیٹھ جائیں گے لیکن اگر آپ ہمّت کریں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ عامۃ المسلمین ابھی تک زندہ ہیں۔ اگر آپ اُونچے طبقے کی تفریحی مجالس کی بجائے دمشق کے ہر گھر میں جانا، عوام میں بیٹھنا اور اُن سے باتیں کرنا گوارا کریں تو سندھ کے اسیر

جو قید خانے کی دیواروں سے کان لگائے کھڑے ہیں بہت جلد ہمارے گھوڑوں کی ٹاپ سُن سکیں گے اور خُدا اِس لڑکی کو زندگی اور صحت دے، وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے گی کہ ہماری تلواریں کُند نہیں ہوئیں۔"

محمدّ بن قاسم نے کہا۔ "اگر امیر المومنین مجُھے اجازت دیں تو میں یہ ذمّہ داری لینے کے لیے تیّار ہوں۔"

ولید نے کہا۔ "تمہیں میری اجازت کی ضرورت نہیں۔"

محمدّ بن قاسم کے بعد دربار سے ہر عہدیدار نے ولید کو نئی فوج بھرتی کرنے کا یقین دِلایا اور نئی مجلس برخاست ہوئی۔

عشاء کی نماز کے بعد محمدّ بن قاسم اور زبیر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک ایلچی نے آکر یہ پیغام دیا کہ امیر المومنین محمدّ بن قاسم کو بلاتے ہیں۔ محمدّ بن قاسم سپاہی کے ساتھ چلا گیا اور زبیر اپنے بستر پر لیٹ کر کُچھ دیر اُس کا انتظار کرنے کے بعد اونگھتے اونگھتے سپنوں کی حسین وادی میں کھو گیا۔ دمشق سے کوسوں دور وہ ناہید کی تلاش میں سندھ کے شہروں میں

بھٹک رہا تھا۔ قلعوں کی فصیلوں قید خانوں کے دروازے توڑ رہا تھا۔ قیدیوں کی آہنی بیڑیاں کھول رہا تھا۔ ناہید کی سیاہ اور چمک دار آنکھوں کے آنسو پونچھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ناہید میں آگیا ہوں تُم آزاد ہو۔ تمہارا زخم کیسا ہے؟ دیکھو برہمن آباد کے قلعے پر ہمارا جھنڈا لہرا رہا ہے۔“

اور وہ کہہ رہی تھی۔ ”زبیر! میں اچھّی ہوں لیکن تُم دیر سے آئے میں مایوس ہو چکی تھی۔“

میٹھے اور سُہانے سپنے کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ وہ انتہائی بے کسی کی حالت میں پابہ زنجیر کھڑا ہے۔ راجہ کے چند سپاہی ننگی تلواریں اٹھائے اُس کے چاروں طرف کھڑے اور باقی ناہید کو پکڑ کر قید خانے کی طرف لے جا رہے ہیں اور وہ مُڑ مُڑ کر ملتجی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتی ہے۔ ناہید کے پاؤں اندر رکھتے ہی قید خانے کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور وہ سخت جدوجہد کے بعد اپنے ہاتھوں اور پاؤں کی زنجیریں توڑ کر سپاہیوں کو دھکیلتا، مارتا اور گراتا ہوا قید خانے کے دروازے تک پہنچتا ہے اور اُسے کھولنے کی جدوجہد کرتا ہے۔

زبیر نے ”ناہید! ناہید!“ کہتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور سامنے محمدّ بن قاسم کو کھڑا دیکھ کر پھر بند کر لیں۔

محمدّ بن قاسم سے خواب کی حالت میں ہاتھ پاؤں مارتے اور ناہید کا نام لیتے ہوئے سُن چکا تھا۔ تاہم اُس نے اُسے گفتگو کا موضوع بنانا مناسب نہ سمجھا اور چُپکے سے اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد زبیر نے دوبارہ آنکھیں کھولیں اور کہا: ”آپ آ گئے؟“

محمدّ بن قاسم نے جواب دیا۔ ”ہاں میں آ گیا ہوں۔“ اور پھر کُچھ سوچ کر پوچھا۔ ”آپ نیزہ بازی اور تیغ زنی میں کیسے ہیں؟“

زبیر نے جواب دیا۔ ”میں نے بچپن میں جو کھلونا پسند کیا تھا، وہ کمان تھی اور جب گھوڑے کی رکاب میں پاؤں رکھنے کے قابل ہوا، میں نے نیزے سے زیادہ کسی اور چیز کو پسند نہیں کیا۔ رہی تلوار، اس سے متعلّق کسی عرب سے یہ سوال کرنا کہ تُم اِس کا استعمال جانتے ہو یا نہیں؟ اُس کے عرب ہونے میں شک کرنے کے مترادف ہے۔ آپ یقین رکھے! میری تربیت آپ کے ماحول سے مختلف ماحول میں نہیں ہوئی۔“

محمدؐ بن قاسم نے کہا۔ ”کل میرا اور آپ کا امتحان ہے۔ امیر المومنین نے مجھے اِسی لیے بُلایا تھا۔ اُن کی خواہش ہے کہ ہم دونوں فنونِ حرب کی نمائش میں حصّہ لیں۔ اگر ہم مُقابلے میں دوسروں پر سبقت لے گئے تو دمشق کے لوگوں پر پر بہت اچھّا اثر پڑے گا اور ہمیں جہاد کے لیے تبلیغ کا موقع مل جائے گا۔ امیر المومنین کی خواہش ہے کہ ہمارا مُقابلہ سلیمان اور اُن کے ساتھیوں سے ہو۔ “

زبیر نے کہا۔ ”امیر المومنین کا خیال درست ہے۔ خُدا نے ہمارے لیے یہ اچھّا موقع پیدا کیا ہے لیکن میں آپ کو یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ صالح اور سلیمان کے متعلّق غَلَط اندازہ نہ لگائیں۔ راستے میں آپ کے ہاتھوں اُس کا مات کھا جانا ایک اتّفاق کی بات تھی۔ وہ دونوں نیزہ بازی میں اپنی مثال نہیں رکھتے۔ تاہم میں تیّار ہوں۔ “

محمدؐ بن قاسم نے کہا۔ ”ہمیں اپنی بڑائی مقصود نہیں۔ ہم ایک اچھّے مقصد کے لیے نمائش میں حصّہ لیں گے۔ خُدا ہماری ضرور مدد کرے گا۔ امیر المومنین نے کہا ہے کہ وہ ہمیں اپنے بہترین گھوڑے دیں گے۔ “

(۳)

سلیمان بن عبد الملک نے ایک قدِّ آدم آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر زرہ پہنی اور خُود سر پر رکھتے ہوئے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کہا۔ ”کیوں صالح! میں عام لباس میں اچھا معلوم ہوتا ہوں یا سپاہیانہ لباس میں؟“

صالح نے جواب دیا۔ ”خُدا نے آپ کو ایک ایسی صورت دی ہے جو ہر لباس میں اچھّی لگتی ہے۔“

سلیمان آئینے کی طرف دیکھ کر مُسکرایا اور پھر کُچھ سوچ کر بولا۔ ”مُجھے اُس لڑکے کی صورت پر رشک آگیا تھا۔ وہ نمائش دیکھنے ضرور آئے گا۔ اگر تُم میں سے کسی کو مل جائے تو اُسے میرے پاس لے آؤ۔ وہ ایک ہونہار سپاہی ہے اور میں اُسے اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔“

صالح نے ایسا محسوس کیا کہ سلیمان اُس کی دکھتی رگ پر نشتر چبھو رہا ہے۔ وہ بولا۔ ”آپ مجُھے زیادہ شرمندہ نہ کریں۔ اُس وقت تلوار پر میرے ہاتھ کی گرفت مضبوط نہ تھی اور یہ بات میرے وہم میں بھی نہ تھی کہ وہ

میری لاپرواہی سے فائدہ اُٹھائے گا۔"

سلیمان نے کہا۔ "اپنے مدِّ مقابل کو کمزور سمجھنے والا سپاہی ہمیشہ مات کھاتا ہے۔ خیر یہ تمہارے لیے اچھّا سبق تھا۔ اچھّا یہ بتاؤ! آج ہمارے مُقابلے میں کوئی آئے گا یا نہیں؟"

صالح نے جواب دیا۔ "مُجھے یہ توقّع نہیں کہ کوئی آپ کے مُقابلے کی جرأت کرے گا۔ گزشتہ سال نیزہ بازی میں تمام نامور سپاہی آپ کے کمال کا اعتراف کر چکے ہیں۔"

"لیکن امیر المومنین مُجھ سے خوش نہ تھے۔"

"اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ اُن کے بھائی ہیں اور وہ یہ جانتے ہیں کہ آپ کی ناموری اور شہرت اُن کے بیٹے کی ولی عہدی کے راستے میں رکاوٹ ہو گی۔ لیکن لوگوں کے دِلوں میں جو جگہ آپ پیدا کر چکے ہیں وہ کسی اور کو حاصل نہیں ہو سکتی۔"

سلیمان نے کہا۔ "لیکن میری راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ حجّاج بن

یوسف ہے۔ وہ عراق پر اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے اِس بات کی کوشش میں ہے کہ میرے بھائی کے بعد میرا بھتیجا مسندِ خلافت پر بیٹھے۔"

صالح نے کہا۔ "خدا میرے بھائی کے قاتل کو غارت کرے۔ مُجھے یقین ہے کہ اُس کی یہ خواہش کبھی پوری نہ ہو گی۔ لوگوں کے دِلوں پر اثر ڈالنے کے لیے جو خوبیاں آپ میں ہیں، وہ نہ آپ کے بھائی میں ہیں نہ کسی اور میں۔ آپ گزشتہ سال فنونِ حرب کی نمائش میں نام پیدا کر کے اپنا راستہ صاف کر چکے ہیں۔ رائے عامہ خلافت کے معاملے میں آپ کی حق تلفی گوارا نہ کرے گی۔"

ایک غلام نے آ کر اِطّلاع دی کہ گھوڑے تیّار ہیں اور صالح نے کہا۔ "ہمیں چلنا چاہیے۔ نمائش شروع ہونے والی ہے۔"

سپاہی اور شہزادہ

زمانۂ جاہلیت میں بھی عرب تیر اندازی، شمشیر زنی اور شہسواری میں غیر معمولی مہارت حاصل کرنا اپنی زندگی کا اہم ترین فریضہ سمجھتے تھے۔ سرداری، عزّت، شُہرت اور ناموری کا سب سے بڑا معیار یہی تھا۔ صحرا نشینوں کی محفل میں سب سے بڑا شاعر اُسے تسلیم کیا جاتا تھا جو تیروں کی سنسناہٹ اور تلواروں کی جھنکار کا بہترین تصوّر پیش کر سکتا ہو۔ جسے اپنے صبار فتار گھوڑے کے سموں کی آواز کسی صحرائی دوشیزہ کے قہقہوں سے زیادہ متاثر کرتی ہو، جس کے لیے دور سے محبوبہ کے محمل اور گرد و غبار میں اڑتے ہوئے شہسوار کی جھلک یکساں طور پر جاذبِ نگاہ ہو۔

اسلام نے عربوں کی انفرادی شجاعت کو صالحین کی ناقابلِ تسخیر قوّت میں تبدیل کر دیا۔ روم و ایران کی جنگوں کے ساتھ ساتھ عربوں کے فنونِ حرب میں اضافہ ہوتا گیا۔ خالد اعظم کے زمانے میں صف بندی اور نقل و حرکت کے پرانے طریقوں میں کئی تبدیلیاں ہوئیں۔ عربوں میں زرہ پہننے کا رواج پہلے بھی تھا لیکن روم کی جنگوں کے دوران زرہیں اور خُود سپاہیانہ لباس کے اہم ترین جزو بن گئے۔

قلعہ بند شہروں کے طویل محاصروں کے دوران کسی ایسے آلے کی ضرورت محسوس کی گئی جو پتھّر کی دیواروں کو توڑ سکتا ہو اور اس ضرورت کا احساس منجنیق کی ایجاد کا باعث ہوا۔ یہ ایک لکڑی کا آلہ تھا جس سے بھاری پتھّر کافی دور پھینکے جاسکتے تھے۔ اُس کی بدولت حملہ آور افواج قلعہ بند تیر اندازوں کی زد سے محفوظ ہو کر شہر پناہ پر پتھّر برسا سکتی تھیں۔ اُس کا تخیّل کمان سے اخذ کیا گیا تھا۔ لیکن چند سالوں میں آلاتِ حرب کے ماہرین کی کوششوں نے اُسے ایک نہایت اہم آلہ بنا دیا تھا۔

قلعہ بند شہروں کی تسخیر کے لیے دوسری چیز جسے عربوں نے بہت زیادہ

رواج دیا، دبابہ تھی۔ یہ لکڑی کا ایک چھوٹا سا قلعہ تھا جس کے نیچے پہیے لگائے جاتے تھے۔ چند سپاہی لکڑی کے تختوں کی آڑ میں بیٹھ جاتے اور چند اُسے دھکیل کر شہر کی فصیل کے ساتھ لگا دیتے۔ پیادہ سپاہی اُس کی پناہ میں آگے بڑھتے اور اُس سے سیڑھی کا کام لے کر فصیل پر جا چڑھتے۔

کھلے میدان میں پیادہ فوج کی طرح عرب سوار بھی ابتدا میں تلوار کو نیزے پر ترجیح دینے کے عادی تھے لیکن آہن پوش سپاہیوں کے مُقابلے میں اُنھوں نے نیزے کی اہمیت کو زیادہ محسوس کیا اور چند سالوں میں عرب کے طول و عرض میں تیر اندازی اور تیغ زنی کی طرح نیزہ بازی کا رواج بھی عام ہو گیا۔ شام کے مسلمان روم کی قربت کی وجہ سے زیادہ متاثر تھے اور یہاں نیزہ بازی کو آہستہ آہستہ تیغ زنی پر ترجیح دی جانے لگی تھی۔

عرب گھوڑے اور سوار دُنیا بھر میں مشہور تھے۔ اُس لیے دوسرے فنون کی طرح نیزہ بازی میں بھی وہ ہمسایہ ملک پر سبقت لے گئے

(۲)

دمشق کے باہر ایک کھُلے میدان میں قریباً ہر روز نیزہ بازی کی مشق کی جاتی تھی۔ نیزہ بازی میں یونان کا قدیم رواج مقبولیت حاصل کر رہا تھا۔

ہمّت آزمائی کرنے والے زرہ پوش شاہوار کُچھ فاصلے پر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو جاتے۔ خطرہ سے بچنے کے لیے زرہ، خود اور چار آئینہ کے استعمال کے باوجود اصلی نیزوں کے علاوہ ایسے نیزے استعمال کیے جاتے جن کے پھل لوہے کے نہ ہوں اور اگلا سِرا تیز ہونے کی بجائے کُند ہو۔ ثالث درمیان میں جھنڈی لے کر کھڑا ہو جاتا اور اُس کے اشارے پر یہ سوار گھوڑوں کو پوری رفتار سے دوڑاتے ہوئے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے۔ جو سوار اپنے مقابل کی زد سے بچ کر اُسے ضرب لگانے میں کامیاب ہوتا وہ بازی جیت جاتا۔ مات کھانے والا سوار کُند نیزے کے دباؤ کی وجہ سے اپنا توازن کھو کر گھوڑے سے گِر پڑتا اور تماشائیوں کے لیے سامانِ تضحیک بن جاتا۔

اِس سال حسبِ معمول فنونِ حرب کی نمائش میں حصّہ لینے کے لیے بہت

لوگ دور دور سے آئے تھے۔ ایک وسیع میدان کے چاروں طرف تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ ولید بن عبد الملک ایک کرسی پر رونق افروز تھا۔ اُس کے دائیں بائیں دربارِ خلافت کے بڑے بڑے عہدہ دار بیٹھے تھے۔ دوسری طرف تماشائیوں کی قطار کے آگے سلیمان بن عبد الملک اپنے چند عقیدت مندوں کے درمیان بیٹھا تھا۔

نمائش شروع ہوئی۔ اسلحہ جات کے ماہرین نے منجنیق اور دبابوں کے جدید نمونے پیش کر کے انعامات حاصل کیے۔ تیر اندازوں اور شمشیر زنی کے ماہرین نے اپنے اپنے کمالات دِکھائے اور تماشائیوں سے داد و تحسین حاصل کی۔ سلیمان کے تین ساتھی تیر اندازی کے مُقابلے میں شریک ہوئے اور اُن میں سے ایک دوسرے درجے کا بہترین تیر انداز مانا گیا۔ اُس کا دوسرا ساتھی صالح تلوار کے مُقابلے میں یکے بعد دیگرے دمشق کے پانچ مشہور پہلوانوں کو نیچا دِکھا کر اِس بات کا مُنتظر تھا کہ امیر المومنین اُسے بُلا کر اپنے قریب کرسی دیں گے لیکن ایک نوجوان نے اچانک میدان میں آ کر اُسے مُقابلے کی دعوت دی اور ایک طویل اور سخت

مُقابلے کے بعد اُس کی تلوار چھین لی۔

یہ نوجوان زبیر تھا۔ تماشائی آگے بڑھ بڑھ کر صالح کو مغلوب کرنے والے نوجوان کی صورت دیکھنے اور اُس سے مصافحہ کرنے میں گرم جوشی دِکھارہے تھے اور صالح غصّے اور ندامت کی حالت میں اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔

ولید اُٹھ کر آگے بڑھا اور زبیر سے مصافحہ کرتے ہوئے اُسے مبارک باد دی اور پھر صالح کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ ”صالح! تُم اگر غصّے میں نہ آ جاتے تو شاید مغلوب نہ ہوتے۔ بہر صورت میں اِس نوجوان کی طرح تمھیں بھی انعام کا حقدار سمجھتا ہوں۔“

سب سے آخر میں نیزہ بازی شروع ہوئی۔ کئی مُقابلوں کے بعد آٹھ بہترین نیزہ باز مُنتخب کئے گئے اور آخری مُقابلہ شروع ہوا۔ جوں جوں مُقابلہ کرنے والوں کی تعداد گھٹتی جاتی تھی۔ داد و تحسین میں گلا پھاڑنے والے تماشائیوں کے جوش و خروش میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ بالآخر ایک طرف ایک اور دوسری طرف دو نیزہ باز رہ گئے۔ تنہارہ جانے والے سوار

نے یکے بعد دیگرے اپنے دونوں مخالفین کو گرا کر اپنا خُود اتارا اور عوام اُسے پہچان کر زیادہ جوش و خروش کے ساتھ تحسین و آفرین کے نعرے بُلند کرنے لگے۔ یہ نوجوان ایک یونانی نو مسلم تھا اور اُس کا نام ایّوب تھا۔ ایّوب نے فاتحانہ انداز میں اپنا نیزہ بُلند کرتے ہوئے اکھاڑے میں چاروں طرف ایک چکّر لگایا اور اُس کے بعد پھر میدان میں آ کھڑا ہوا۔

نقیب نے آواز دی۔ ”کوئی ایسا ہے، جو اِس نوجوان کے مُقابلے میں آنا چاہتا ہے۔“

عوام کی نگاہیں سلیمان بن عبد الملک پر مرکوز ہو چُکی تھیں۔ سلیمان نے سر پر خُود رکھتے ہوئے اٹھ کر ایک حبشی غلام کو اشارہ کیا جو پاس ہی ایک خوبصورت مشکی گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا تھا۔ غلام نے گھوڑا آگے کیا اور سلیمان اس پر سوار ہو گیا۔ سورج کی روشنی میں سلیمان کی زرہ چمک رہی تھی اور ہلکی ہلکی ہوا میں اُس کے خُود کے اوپر سبز ریشم کے تاروں کا پھندنا لہرا رہا تھا۔

سلیمان اور ایّوب ایک دوسرے کے مُقابلے میں کھڑے ہو گئے اور عوام

دم بخود ہو کر ثالث کی جھنڈی کے اشارے کا انتظار کرنے لگے۔ ثالث نے جھنڈی ہلائی اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ صبا رفتار گھوڑے ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ سواروں نے ایک دوسرے کے قریب پہنچ کر خود بچنے اور دوسرے کو ضرب لگانے کی کوشش کی۔ سلیمان مُقابلے میں آنے سے پہلے اپنے مدِّ مقابل کے تمام داؤں دیکھ کر اُن سے بچنے کے طریقے سوچ چکا تھا۔ چنانچہ ایّوب کا وار خالی گیا اور سلیمان کا نیزہ اُس کے خُود پر ایک کاری ضرب کا نشان چھوڑ گیا۔

ثالث نے سلیمان کی فتح کا اعلان کیا۔ ولید نے اُٹھ کر اپنے بھائی کو مبارک باد دی اور ایّوب کی حوصلہ افزائی کی۔

سلیمان نے خود اُتار کر فاتحانہ انداز میں تماشائیوں کی طرف نگاہ دوڑائی اور حسبِ معمول اکھاڑے کا چکّر لگا کر پھر میدان میں آ کھڑا ہوا۔

(۳)

نقیب نے تین بار آواز دی۔ ”کوئی ہے جس میں سلیمان بن عبد الملک کے

مُقابلے کی ہمّت ہے؟" لیکن لوگوں کو اس سے پہلے ہی یقین ہو چکا تھا کہ اب کھیل ختم ہو چکا ہے اور وہ امیر المومنین کے اُٹھنے کا انتظار کر رہے تھے لیکن اُن کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب سفید گھوڑے پر ایک سوار نیزہ ہاتھ میں لیے میدان میں آ کھڑا ہوا۔ تماشائیوں کو حیرانی اِس بات پہ نہ تھی کہ ایک نیزہ باز سلیمان بن عبد الملک کو مُقابلے کی دعوت دے رہا تھا بلکہ وہ اِس بات پر ششدر تھے کہ اجنبی سوار کے جسم پر زرہ نہ تھی اور نہ چار آئینہ۔ وہ سیاہ رنگ کا چُست لباس پہنے ہوئے تھا۔ سر پر خُود کی بجائے سفید عمامہ تھا اور آنکھوں کے سوا باقی چہرے پر سیاہ نقاب تھا۔

زرہ کے بغیر صرف وہ لوگ ایسے مُقابلوں میں حصّہ لیتے ہیں جنہیں اپنے حریف کی کمتری کا پورا پورا یقین ہو لیکن سلیمان اُس دِن کا ہیرو تھا اور لوگ سلیمان کے مُقابلے کے لیے زرہ اور خُود کے بغیر میدان میں آنے والے سوار کی بہادری سے متاثر ہونے کی بجائے اُس کی دماغی حالت کے صحیح ہونے میں شک کر رہے تھے۔

ولید اور زبیر کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ کون ہے لیکن اُس کی اس

جرأت پر ولید بھی پریشان تھا۔ اُس نے آہستہ سے زبیر کے کان میں کہا۔
"یہ محمدؐ بن قاسم ہے یا کوئی اور؟"

زبیر نے جواب دیا۔ "امیر المومنین! یہ وہی ہے۔"

"لیکن وہ سلیمان کو کیا سمجھتا ہے۔ اگر اُس کی پسلیاں لوہے کی نہیں تو مجھے ڈر ہے کہ لکڑی کا کُند سِرا بھی اُس کے لیے نیزے کی نوک سے کم خطرناک ثابت نہ ہو گا۔ تم جاؤ اور اُسے بُلا کر سمجھاؤ۔"

زبیر نے جواب دیا۔ "امیر المومنین! میں اسے بہت سمجھا چکا ہوں۔ وہ خود بھی اِس خطرے کو محسوس کرتا ہے لیکن وہ یہ کہتا ہے کہ اِس صورت میں اگر اُس کی جیت ہوئی تو نوجوانوں پر اس کا خوش گوار اثر پڑے گا اور اُسے سندھ کے حالات سُنا کر اُنہیں جہاد کے لیے آمادہ کرنے کا موقع مل جائے گا۔ اس کا یہ بھی خیال ہے کہ زرہ کے بغیر سوار زیادہ چست رہ سکتا ہے۔"

زبیر کا جواب ولید کو مطمئن نہ کر سکا۔ وہ خود اُٹھ کر محمدؐ بن قاسم کی طرف بڑھا اور تماشائی زیادہ پریشانی کا اظہار کرنے لگے۔

محمدؐ بن قاسم سلیمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ولید نے قریب پہنچتے ہی آواز دے کر اُسے اپنی طرف متوجّہ کیا اور کہا۔ ”برخوردار! مجھے تمہاری شجاعت کا اعتراف ہے لیکن یہ شجاعت نہیں نادانی ہے۔ تُم زدہ اور خُود کے بغیر عرب کے بہترین نیزہ باز کے مُقابلے میں جا رہے ہو اور اگر اُس نے اِسے اپنی تضحیک سمجھا تو مُجھے ڈر ہے کہ تم دوبارہ گھوڑے پر سوار ہونے کے قابل نہیں رہو گے۔“

محمدؐ بن قاسم نے جواب دیا۔ ”امیر المومنین! خُدا جانتا ہے کہ مُجھے اپنی ستائش مقصود نہیں۔ میں یہ خطرہ ایک نیک مقصد کے لیے قبول کر رہا ہوں اور یہ کوئی بہت بڑا خطرہ بھی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ زرہ پہن کر سوار چست نہیں رہتا۔“

”لیکن اگر تمہاری چستی تمہاری پسلیاں نہ بچا سکی تو؟“

”تو بھی مُجھے افسوس نہ ہو گا۔ مُجھے اپنی پسلیوں سے زیادہ اُس لڑکی کا خیال ہے جس کے سینے میں ہمارے بے رحم دُشمن کے تیر کا زخم ناسور بن چکا ہے۔ اگر خُدا کو اُس کی مدد منظور ہے تو مُجھے یقین ہے کہ وہ آج مُجھے دمشق

کے لوگوں کے سامنے سامانِ تضحیک نہ بننے دے گا اور مُمکن ہے میں بازی جیتنے کے بعد اس ہجوم میں اس کا پیغام پڑھ کر سُنا سکوں، انفرادی تبلیغ سے جو کام ہم مہینوں میں کر سکتے ہیں وہ ایک آن میں ہو جائے گا۔ آپ مُجھے اجازت دیجیے اور دُعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ میری مدد کرے۔"

ولید نے کہا۔ "لیکن تم کم از کم سر پر خُود تو رکھ لیتے۔"

محمدؐ بن قاسم نے جواب دیا۔ "آپ بُرا نہ مانیں۔ جو سپاہی نیزے کا وار سر پر روکتا ہے۔ اُس کے متعلّق کوئی اچھّی رائے نہیں دی جا سکتی۔ میرے لیے یہ عمامہ کافی ہے۔"

ولید نے کہا: "بیٹا! اگر آج تم سلیمان پر سبقت لے گئے تو انشاء اللہ سندھ پر حملہ کرنے والی فوج کا جھنڈا تمہارے ہاتھ میں ہو گا۔"

ولید واپس مُڑا اور راستے میں نقیب کو کُچھ سمجھانے کے بعد اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

دوسری طرف سلیمان کے گرد چند تماشائی کھڑے تھے۔ صالح نے آگے

بڑھ کر سلیمان کو اپنی طرف متوجّہ کرتے ہوئے کہا۔ ”امیر المومنین آپ کو نیچا دِکھانا چاہتے ہیں۔ آپ ہوشیاری سے کام لیں!“

سلیمان نے پوچھا۔ ”لیکن وہ سر پھرا ہے کون؟“

”مُجھے معلوم نہیں لیکن وہ کوئی بھی ہو مُجھے یقین ہے کہ وہ پھر گھوڑے پر سوار نہیں ہو گا۔“

نقیب نے آواز دی۔ ”حاضرین! اب سلیمان بن عبد الملک اور محمدّ بن قاسم کا مُقابلہ ہو گا۔ سیاہ پوش نوجوان کی عمر سترہ سال سے کم ہے۔“

تماشائی اور زیادہ حیران ہو کر سیاہ پوش نوجوان کی طرف دیکھنے لگے۔

ثالث نے جھنڈی ہلائی اور نیزہ باز پوری رفتار سے ایک دوسرے کی زد سے بچ کر کر نکل گئے اور عوام نے ایک پُر جوش نعرہ بُلند کیا۔

کم سن اور نوجوان دیر تک محمدّ بن قاسم کے لیے تحسین کے نعرے بُلند کرتے رہے اور عمر رسیدہ لوگ یہ کہہ رہے تھے۔ یہ لڑکا بُلا کا چست ہے لیکن سلیمان کے ساتھ اُس کا کوئی مُقابلہ نہیں۔ پہلی مرتبہ سلیمان نے

جان بوجھ کر اس کی رعایت کی ہے لیکن دوسری دفعہ اگر وہ بچ گیا تو یہ ایک معجزہ ہو گا۔ کہاں سترہ سال کا چھوکرا اور کہاں سلیمان جیسا جہاں دیدہ شہسوار!"

لیکن نوجوانوں نے آسمان سر پر اُٹھا رکھا تھا۔ سلیمان کی بجائے اب سترہ سالہ اجنبی اُن کا ہیرو بن چکا تھا۔ وہ کسی کی زبان سے ایک حرف بھی برداشت کرنے کے لیے تیّار نہ تھے بعض تماشائی تکرار سے ہاتھا پائی تک اُتر آئے۔

رواج کے مطابق نیزہ بازوں کو دوسرا موقع دیا گیا اور دونوں پھر ایک دوسرے کے مُقابلے میں کھڑے ہو گئے۔ بچّے اور نوجوان بھاگ بھاگ کر اُس طرف جا رہے تھے جس طرف اُن کا کم سن ہیرو کھڑا تھا۔ سب کی نگاہیں نقاب میں چھُپے ہوئے چہرے کو دیکھنے کے لیے بے قرار تھیں۔ ثالث نے بھاگ کر لوگوں کو پیچھے ہٹایا اور پھر اپنی جگہ پر آ کھڑا ہوا۔ جھنڈی کے اشارے کے بعد تماشائیوں کو پھر ایک بار میدان میں گرد اُڑتی نظر آئی۔ تھوڑی دیر کے لیے پھر ایک بار سکوت چھا گیا۔

محمدّ بن قاسم پھر اچانک ایک طرف جھک کر سلیمان کے نیزے کی ضرب سے بچ گیا۔ سلیمان نے بھی بائیں طرف جھک کر اپنے مدِّ مقابل کے وار سے بچنے کی کوشش کی لیکن اس سے کہیں زیادہ پھرتی کے ساتھ محمدّ بن قاسم نے اپنے نیزے کا رُخ بدل دیا اور اُس کی دائیں پسلی میں ضرب لگا کر اُسے اور زیادہ بائیں طرف دھکیل دیا۔ سلیمان لڑکھڑا کر نیچے گِرنے کے بعد فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور پسلی پر ہاتھ رکھ انتہائی بے چارگی کی حالت میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

چاروں طرف سے فلک شگاف نعروں کی صدا آرہی تھی۔ محمدّ بن قاسم نے تھوڑی دور جا کر اپنے گھوڑے کی باگ موڑلی اور سلیمان کے قریب آ کر نیچے اُترتے ہوئے مصافحہ کے لیے اُس کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن سلیمان مصافحہ کرنے کی بجائے مُنہ پھیر کر تیزی سے قدم اُٹھاتا ہوا ایک طرف نکل گیا۔

آن کی آن میں تماشائی ہزاروں کی تعداد میں محمدّ بن قاسم کے گرد جمع ہو گئے۔ یونانی شاہوار ایّوب نے آگے بڑھ کر محمدّ بن قاسم کے ہاتھ سے

گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور کہا۔ ”میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ اب اگر کوئی مجبوری نہ ہو تو آپ چہرے سے نقاب اتار دیجیے، ہم سب کی آنکھیں آپ کی صورت دیکھنے کے لیے بے قرار ہیں۔“

(۴)

محمدّ بن قاسم نے نقاب اُتار ڈالا۔ کم سن شہسوار کا چہرہ لوگوں کی توقّع سے کہیں زیادہ متین اور سنجیدہ تھا۔ اُس کی خوبصورت سیاہ آنکھوں سے شوخی کی بجائے معصومیت ٹپکتی تھی لوگوں کے نعروں اور پُر اشتیاق نگاہوں کے جواب میں اُس کا سکون یہ ظاہر کر رہا تھا۔ کہ اُسے بڑی سے بڑی فتح بھی متاثر نہیں کر سکتی۔ جو نوجوان اُسے کندھوں پر اُٹھا کر دمشق کی گلیوں میں اُس کا شاندار جلوس نکالنے کے ارادے سے بڑھے تھے۔ دم بخود ہو کر اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایّوب نے اپنے ایک عرب دوست سے کہا۔ ”میں سچ کہتا ہوں کہ میں نے یونان کے مجسّموں میں بھی کوئی صورت بیک وقت اُس قدر خوب صورت معصوم سادہ اور بارُعب نہیں دیکھی۔“

ایک عرب نے پوچھا۔ ”آپ کہاں سے آئے ہیں؟“

محمدّ بن قاسم نے جواب دیا۔ ”بصرہ سے۔“ اس پر کئی لوگ یہ اصرار کرنے کے آپ ہمارے ہاں ٹھہریے۔

محمدّ بن قاسم نے سب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”میں دمشق کے لوگوں کے پاس ایک ضروری پیغام لے کر آیا ہوں، اور مُجھے جلد واپس جانا ہے۔ اگر آپ سب خاموشی سے میرا پیغام سُن لیں تو یہ مُجھ پر بڑی عنایت ہو گی۔“

لوگ اب بہت زیادہ تعداد میں محمدّ بن قاسم کے گرد جمع ہو رہے تھے ولید بن عبد الملک عہدیداروں کی جماعت کے ہمراہ آگے بڑھا۔ لوگ امیر المومنین کو دیکھ کر اِدھر اُدھر ہٹ گئے ولید نے محمدّ بن قاسم کے قریب پہنچ کر کہا۔ ”میرے خیال میں تمہارے لیے بہترین موقع ہے۔ تُم گھوڑے پر سوار ہو جاؤ، تاکہ سب لوگ تمہاری صورت دیکھ سکیں۔“

محمدّ بن قاسم گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ مجمع میں کانوں کان ایک سِرے سے دوسرے سِرے تک یہ خبر پہنچ چکی تھی۔ کہ یہ سیاہ پوش نوجوان کوئی اہم خبر سُنانا چاہتا ہے اور وہ لوگ جو اگلی قطاروں میں تھے، یکے بعد دیگرے

زمین پر بیٹھ رہے تھے۔

محمدؐ بن قاسم نے مختصر الفاظ میں سراندیپ کی مسلمان بیواؤں اور یتیم بچّوں کی المناک داستان بیان کی۔ اس کے بعد زبیر سے رومال لے کر ناہید کا مکتوب پڑھ کر سنایا، بیواؤں اور یتیم بچّوں کی سرگزشت سُننے کے بعد عوام کے دِلوں پر ناہید کے مکتوب کے الفاظ تیر و نشتر کا کام کر رہے تھے۔ مکتوب سنانے کے بعد محمدؐ بن قاسم نے رومال زبیر کو واپس دیتے ہوئے بُلند آواز میں کہا۔

"فدایان اسلام! میں تم میں سے اکثر کی آنکھوں میں آنسو دیکھ رہا ہوں۔ لیکن یاد رکھو! ستم رسیدہ انسانیت کے دامن پر ظلم کی سیاہی کے دھبّے آنسوؤں سے نہیں خون سے دھوئے جاتے ہیں۔ جبر و استبداد کی جو آگ سندھ کے وسیع ملک میں سُلگ رہی ہے۔ ہم نے دور سے اس کی ہلکی سی آنچ محسوس کی ہے، اور وہ اس لیے کہ ہمارے چند بھائی، چند مائیں اور چند بہنیں اس آتش کدہ میں جل رہی ہیں۔ لیکن ہمیں ان لاکھوں بے کسوں کا حال معلوم نہیں، جو مدّت سے سندھ کے استبدادی نظام کی زنجیروں

میں جکڑے ہوئے ہیں۔ یہ تیر جو ایک مسلمان لڑکی کے جسم میں پیوست ہوا، اُن لاکھوں تیروں میں سے ایک تھا جن کی مشق سندھ کا مغرور و جابر حکمران اپنی بے کس رعایا کے سینوں پر کرتا ہے۔ آج سندھ میں اگر ہماری بہنیں اور بھائی قید خانے کی تاریک کوٹھڑی میں مجاہدینِ اسلام کے گھوڑوں کی ٹاپ سُننے کے منتظر ہیں۔ آج اگر وہ اللہ اکبر کے ان نعروں کا انتظار کر رہے ہیں۔ جن میں اب بھی دیبل کے قلعے کی مضبوط دیواروں پر زلزلہ طاری کر دینے کی قوّت موجود ہے، تو مُجھے یقین ہے کہ سندھ کے عوام جو برسوں سے ظلم و استبداد کی آگ میں جل رہے ہیں، افق مغرب سے رحمت کی اِن گھٹاؤں کے مُنتظر ہیں جو آج سے کئی برس پہلے آتش کدۂ ایران کو ٹھنڈا کر چکی ہیں۔ اُن کے مجروح سینوں سے یہ آواز نکل رہی ہے کہ اے کاش! وہ مجاہدین جنہوں نے اپنے خون سے باغِ آدم میں مساوات، عدل، انصاف اور امن کے پودے کی آبیاری کی ہے، سندھ کے حکمران کے ہاتھوں سے ظلم کی تلوار چھین لیں اور اُن کے گھوڑے اُن خار دار جھاڑیوں کو مسل ڈالیں جن کے ساتھ انسانیت اور آزادی کا دامن اُلجھا ہوا ہے۔

مسلمانو! یہ خبر ہمارے لیے بُری بھی ہے اور اچھّی بھی۔ بُری اس لیے کہ ہمیں اپنے بھائیوں اور بہنوں کا حال سُن کر دُکھ ہوا اور اچھّی اِس لیے کہ حق و صداقت کی تلوار کے سامنے قیصر و کسریٰ کی طرح ایک اور مغرور سر اُٹھا ہے۔ آؤ اُسے بتادیں کہ ہماری تلواریں کُند نہیں ہوئیں۔

گُزشتہ چند برسوں میں ہمارے اندرونی خلفشار نے ہمیں بہت نقصان پہنچایا ہے۔ وہ سلطنتیں جو ہمارے آباؤ اجداد کے نام سے تھرّاتی تھیں، آج ہمارے خلاف اعلانِ جنگ کر رہی ہیں۔ ایک مظلوم لڑکی کا یہ خط اگر تمہاری رگوں میں حرارت پیدا نہ کر سکا تو یاد رکھو! روئے زمین پر ہماری عظمت اور عروج کے دِن گِنے جا چکے ہیں۔ لیکن میں مایوس نہیں، میں تم میں سے کسی کے چہرے پر مایوسی نہیں دیکھتا۔ میں صرف یہ کہوں گا کہ ایک شجاع قوم غفلت کی نیند سو رہی ہے اور اِس قوم کی ایک غیوّر بیٹی بُلند آواز میں یہ کہہ رہی ہے کہ اسلام کے غیوّر بیٹو! تُم تو روئے زمین کی ہر بہو بیٹی کی عصمت کی حفاظت کے لیے پیدا ہوئے تھے اور آج تمہاری یہ حالت کہ تمہاری اپنی بہو بیٹیوں کو پابہ زنجیر برہمن آباد کے بازاروں میں

کھینچا جارہا ہے۔"

عوام جذبات سے مغلوب ہو کر ولید بن عبد الملک کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک معمّر شخص نے آگے بڑھ کر کہا۔ "اگر ہم سے پہلے یہ خبر امیر المومنین تک پہنچ چکی ہے تو ہم حیران ہیں کہ اُنہوں نے ابھی تک سندھ کے خلاف اعلانِ جہاد کیوں نہیں کیا؟" ہجوم آتش فشاں پہاڑ کی طرح بھرا بیٹھا تھا۔ چاروں طرف "جہاد جہاد" کے فلک شگاف نعرے گونجنے لگے۔ محمدؒ بن قاسم نے دونوں ہاتھ بُلند کرتے ہوئے لوگوں کو خاموش کیا اور پھر اپنی تقریر شروع کی:

"میرے مخاطب وہ لوگ ہیں جو ایک ہنگامی جوش کے باعث چند نعرے لگا کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ زندہ قومیں نعرے بُلند کرنے سے پہلے اپنی تلواریں بے نیام کر کے میدان میں کود تی ہیں۔ تُم دمشق میں چند نعرے لگا کر اُن نگاہوں کی تشفی نہیں کر سکتے جو یہاں سے ہزاروں میل دور تمہاری تلواروں کی چمک دیکھنے کے لیے بے قرار ہیں۔ امیر المومنین کو اپنی ذمّہ داری کا احساس ہے لیکن اُنہوں نے ابھی تک تمہارے نعرے

سُنے ہیں۔ کاش! اُن نعروں کے ساتھ وہ تلواریں بھی نیام سے باہر آنے کے لیے بے قرار ہوتیں، جن کی نوک کے ساتھ تمہارے آباؤ اجداد سطوتِ اسلام کی داستان لکھ گئے ہیں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ قادسیہ اور اجنادین کے مجاہدوں کی اولاد میں زندگی کی کوئی رمق باقی ہے یا نہیں؟ اِس میں شک نہیں کہ ہماری تمام افواج ترکستان اور افریقہ کے میدانوں میں مصروفِ جہاد ہیں لیکن تُم میں سے کون ایسا ہے جو تلوار کا استعمال نہیں جانتا؟ اگر ہمّت کریں تو ہم سندھ کے میدانوں میں یرموک اور دمشق کی یاد پھر زندہ کر سکتے ہیں۔ آج تُم کو اپنے آباؤ اجداد کی طرح یہ ثابت کرنا ہے، کہ ضرورت کے وقت ہر مسلمان سپاہی بن سکتا ہے۔ اب تمہاری تلواریں دیکھ کر میں امیر المومنین سے اعلانِ جہاد کی درخواست کرتا ہوں۔"

محمدّ بن قاسم گھوڑے سے اُتر پڑا۔ اُس کی تقریر کے اختتام تک کئی بوڑھے اور نوجوان تلواریں بُلند کر چکے تھے۔ ایک دس سال کا لڑکا سخت جدوجہد کے بعد لوگوں کو اِدھر اُدھر ہٹاتا ہوا آگے بڑھا اور ولید کے قریب جا کر

بولا۔ ”امیر المومنین! کیا مُجھے بھی جہاد پر جانے کی اجازت ہو گی؟ مُجھے معلوم نہ تھا۔ ورنہ میں تلوار لے کر آتا لیکن میں ابھی لے آتا ہوں۔ آپ اُنہیں تھوڑی دیر روکیں۔“

ولید نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں ابھی چند سال اور انتظار کرنا پڑے گا۔“

لڑکا دل برداشتہ ہو کر محمدؐ بن قاسم کے قریب آ کھڑا ہوا۔ ولید کے اشارے پر ایک شخص ایک کرسی اُٹھا لایا اور اُس نے کرسی پر کھڑے ہو کر کہا۔ ”اس نوجوان کی تقریر کے بعد مُجھے کُچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔ خُدا کا شکر ہے کہ تمہاری غیرت زندہ ہے۔ میں سندھ کے خلاف اعلانِ جہاد کرتا ہوں۔“

ہجوم نے پھر ایک بار نعرے بُلند کیے۔ ولید نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ہفتہ کے اندر اندر دمشق کی فوج بصرہ روانہ ہو جائے۔ وہاں اگر محمدؐ بن قاسم جیسے چند اور نوجوان موجود ہیں تو مُجھے یقین ہے کہ کوفہ اور بصرہ سے بھی سپاہیوں کی ایک اچھّی خاصی

تعداد جمع ہو جائے گی۔ آپ میں سے جن لوگوں کے پاس گھوڑے نہیں، اُن کے لیے گھوڑوں اور جِن کے پاس اسلحہ جات نہیں، اُن کے لیے اسلحہ جات کا انتظام کیا جائے گا۔ میں جو اہم ترین خبر آپ کو سُنانا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ محمدؒ بن قاسم کو سندھ پر حملہ کرنے والی افواج کا سپہ سالار مقرر کرتا ہوں۔ میں نے اِس ہونہار مجاہد کے لیے عماد الدّین کا لقب تجویز کیا ہے۔ آپ دُعا کریں کہ یہ صحیح معنوں میں عماد الدّین ثابت ہو۔

(۵)

رات کے تیسرے پہر محمدؒ بن قاسم دمشق کی جامع مسجد میں نماز تہجّد ادا کرنے کے بعد ہاتھ اُٹھا کر انتہائی سوز و گُداز کے ساتھ یہ دُعا کر رہا تھا۔ یا ربِّ العالمین! میرے نحیف کندھوں پر ایک بھاری بوجھ آ پڑا ہے، مُجھے اِس ذمّہ داری کو پورا کرنے کی توفیق دے اور میرا ساتھ دینے والوں کو اُن کے آبا و اجداد کا عزم اور استقلال عطا فرما۔ حشر کے دِن فدایانِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جماعت کے سامنے میری نگاہیں شرمسار نہ ہوں۔ مُجھے خالدؓ کا عزم اور مثنیؓ کا ایثار عطا کر۔ میری زندگی کا ہر لمحہ تیرے

دین کی سربلندی کے لیے وقف ہو۔"

اِس دُعا کے اختتام پر زبیر کے علاوہ ایک اور شخص نے بھی جو محمدؒ بن قاسم کے دائیں ہاتھ بیٹھا ہوا تھا، آمین کہی، اور یہ دونوں اُس کی طرف دیکھنے لگے۔ اس کے سادہ لباس اور نورانی صورت میں غیر معمولی جاذبیت تھی۔ وہ کھِسک کر محمدؒ بن قاسم کے قریب ہو بیٹھا اور اُس کی طرف محبّت اور پیار سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"تُم محمدؒ بن قاسم ہو؟"

"جی ہاں! اور آپ؟"

"میں عمر بن عبدالعزیز ہوں۔"

محمدؒ بن قاسم عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کی بزرگی اور پاکیزگی کے متعلّق بہت کُچھ سُن چکا تھا۔ اس نے عقیدت مندانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ میرے لیے دُعا کریں۔"

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ "خُدا تمہارے نیک

ارادے پورے کرے!"

محمدّ بن قاسم نے کہا۔ "ایک مدّت سے میرا ارادہ تھا کہ آپ سے نیاز حاصل کروں۔ آج آپ کی ملاقات کو تائیدِ غیبی سمجھتا ہوں۔ مجُھے کوئی نصیحت فرمائیں؟" عمر بن عبدالعزیز نے کہا۔ "میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمہارے جیسے بہادر اور ہونہار سپہ سالار کی قیادت میں انشاء اللہ دُشمن کے خلاف تلوار کی مہم جلد ختم ہو جائے گی لیکن اگر تُم سندھ میں جہاد کا صحیح جذبہ لے کر جارہے ہو تو تمہیں وہاں اپنے اخلاق اور کردار سے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ تُم سندھ کے لوگوں کو غُلام بنانے کے لیے نہیں بلکہ اُنہیں نظامِ باطل کی زنجیروں سے آزاد کر کے سلامتی کا راستہ دِکھانے کے لیے آئے ہو۔ تُمہیں اُنہیں یہ بتانا ہے کہ دائرۂ توحید میں قدم رکھنے والا ہر انسان دُنیا کی غلامی سے آزاد ہو سکتا ہے۔ تُم ایک ایسے ملک میں جا رہے ہو جس میں پنچ ذات کے لوگ اپنے اوپر اونچی ذات والوں کے جبر و اختیار کا پیدائشی حق تسلیم کرتے ہیں۔ سندھ کے استبدادی نظام کی جڑیں کٹ جانے کے بعد اگر تُم لوگوں کے سامنے اسلامی مساوات کا صحیح نقشہ

پیش کر سکے تو مجھے یقین ہے کہ تُم اُن کے قلوب پر بھی فتح پا سکو گے۔ جو آج تمہارے دُشمن ہیں کل تمہارے دوست ہو جائیں گے۔

مسلمان بیواؤں اور یتیموں پر سندھ کے حکمران کے مظالم کی داستان سُن کر بعض نوجوان صرف جذبہ انتقام کے تحت تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیّار ہو گئے ہیں لیکن اُن میں سے کسی کو گِرے ہوئے دُشمن پر وار کرنے کی اجازت نہ دینا؛ خُدا زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ظالم کے ہاتھ سے اُس کی تلوار چھین لو لیکن اُس پر ظلم نہ کرو! بلکہ اگر وہ تائب ہو جائے تو اُس کی خطا معاف کر دو! اگر وہ دینِ الہٰی قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے تو اُسے سینے سے لگا لو! اگر وہ زخموں سے نڈھال ہو کر تُم سے پناہ مانگے تو تُم اس کے زخموں پر مرہم رکھو! ہمارے یتیموں اور بیواؤں پر ظُلم ہوا ہے لیکن تُم ان کے یتیموں اور بیواؤں کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھنا اور یہ یاد رکھو کہ خُدا ہمسایہ ممالک پر عرب قوم کا سیاسی تفوق نہیں چاہتا، بلکہ کفر کے مُقابلے میں اپنے دین کی فتح چاہتا ہے اور یہ کام اگر عربوں کے ہاتھوں پورا ہو تو وہ دُنیا میں بھی فلاح پائیں گے اور اُن کی آخرت بھی اچھی

ہو گی۔"

نمازِ صُبح کی اذان سُن کر عمر بن عبد العزیز نے اپنی تقریر ختم کی۔ نماز کے بعد محمدؐ بن قاسم نے اُن سے رُخصت ہوتے وقت کہا۔ "مُجھے یہاں سے روانہ ہونے میں پانچ دِن اور لگ جائیں گے۔ اِس عرصے میں میں آپ کے علم و فضل سے اور زیادہ مُستفید ہونا اپنی خوش بختی خیال کروں گا لیکن دِن کا بیشتر حصّہ مُجھے نئے سپاہیوں کو تربیت دینے میں صرف کرنا پڑے گا۔ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو رات کو کسی وقت میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو جایا کروں؟"

عمر بن عبد العزیز نے جواب دیا۔ "تم جس وقت چاہو میرے پاس آ سکتے ہو۔ خاص طور پر اِس وقت تُم ہر روز مُجھے یہاں پاؤ گے۔ آٹھ دس دِن کے بعد میں بھی مدینہ چلا جاؤں گا۔"

محمدؐ بن قاسم، حضرت عمر بن عبد العزیز سے رُخصت ہو کر مسجد سے باہر نکلا، تو نوجوانوں کی ایک خاصی جماعت اُس کے آگے اور پیچھے تھی۔ دروازے کی سیڑھیوں پر پہنچ کر اُس نے اُنہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”آپ سب میدان میں پہنچ جائیں، میں بھی تھوڑی دیر میں پہنچ جاؤں گا۔“

(۶)

محمدؒ بن قاسم کی قیام گاہ کے دروازے پر دو سپاہی گھوڑے لیے کھڑے تھے۔ مجد اور زبیر نے گھوڑوں پر سوار ہو کر سپاہیوں کے ہاتھوں سے نیزے لے لیے اور گھوڑوں کو ایڑ لگا دی۔ شہر کے مغربی دروازے سے باہر نکلنے کے بعد وہ سر سبز باغات سے گزرتے ہوئے ایک ندی کے کنارے آ کر رُکے اور گھوڑوں سے اُتر کر پانی میں کود پڑے۔ ندی کے صاف اور شفاف پانی میں تھوڑی دیر تیرنے اور غوطے لگانے کے بعد کپڑے بدل کر وہ کچھ دیر اپنے سامنے دِل کش اور سر سبز پہاڑوں کا منظر دیکھتے رہے۔ محمدؒ بن قاسم نے اپنے ساتھی کو محویت کی حالت میں دیکھ کر کہا۔ ”کل ہم بہت سویرے یہاں آئیں گے۔ اب ہمیں چلنا چاہیے۔ لوگ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔“

زبیر نے چونک کر محمدؒ بن قاسم کی طرف دیکھا۔ ”کیا کہا آپ نے؟“

”ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“

”چلیے!“

دونوں پھر گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ محمدؐ بن قاسم نے پوچھا۔ ”تم ابھی کیا سوچ رہے تھے؟“

زبیر نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔ ”میں تصوّر میں سراندیپ کے سبزہ زار دیکھ رہا تھا۔“

”لیکن ہماری منزلِ مقصود تو سندھ کے ریگستان ہیں؟“

”اُنہیں میں ہر وقت دیکھتا ہوں۔ لیکن کبھی کبھی سراندیپ کے سبزہ زار بھی یاد آجاتے ہیں۔“

محمدؐ بن قاسم نے کہا۔ ”کل تُم خواب کی حالت میں ناہید کو آوازیں دے رہے تھے۔ میں نے اُس کا ذکر مناسب نہ سمجھا۔ اب اگر بُرا نہ مانو تو میں پوچھتا ہوں کہ خواب میں تُم نے کیا دیکھا تھا؟“

زبیر نے اپنے چہرے پر ایک اداس مُسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے خواب دیکھا تھا کہ دیبل کے چند سپاہی میرے چاروں طرف ننگی تلواریں لیے کھڑے ہیں اور کُچھ ناہید کو پکڑ کر قید خانے کی طرف لے جا رہے ہیں اور میں بھاگ کر اُسے چھڑانا چاہتا ہوں۔ “

محمدّ بن قاسم نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ ناہید کی یاد کا آپ کے دِل و دماغ پر گہرا اثر ہے۔“

”میں اِس سے انکار نہیں کرتا۔ جن حالات میں ہم ایک دوسرے سے ملے اور بچھڑے ہیں، اُن حالات میں شاید کوئی بھی اُس بہادر اور غیوّر لڑکی کو اپنے دِل میں جگہ دینے سے انکار نہ کرتا۔“

ایک ہرن بھاگتا ہوا قریب سے گُزر گیا۔ محمدّ بن قاسم نے نیزہ سنبھالتے ہوئے کہا: ”اِس کی پچھلی ٹانگ زخمی ہے۔ کیسی اوچھے تیر انداز نے اِس پر وار کیا ہے۔ آؤ اِس کا تعاقب کریں۔“

زبیر اور محمدّ نے ہرن کے پیچھے گھوڑے سرپٹ چھوڑ دیے۔ زخمی ہرن

زیادہ دور نہ جاسکا اور محمدؐ بن قاسم کے نیزے کی ایک ہی ضرب کے ساتھ نیچے گر پڑا۔ زبیر نے گھوڑے سے اُتر کر اُسے ذبح کیا اور پچھلی ران سے تیز نکالتے ہوئے کہا۔ ''اگر ہم اِسے نہ دیکھتے تو یہ کسی جھاڑی میں بُری طرح جان دے دیتا۔''

چند سوار درختوں کی آڑ سے نمودار ہوئے اور محمدؐ بن قاسم نے اُن میں سے سلیمان کو پہچانتے ہوئے کہا۔ ''ارے! یہ تو ہمارے پرانے دوست ہیں۔ ''

سلیمان نے قریب پہنچ کر اپنے گھوڑے کی باگ کھینچی اور کہا۔ ''یہ شکار ہمارا ہے۔''

محمدؐ بن قاسم نے جواب دیا۔ ''آپ لے سکتے ہیں۔ ہم نے اِسے صرف ایک تکلیف دہ موت سے نجات دی ہے۔ اِس کی ٹانگ زخمی تھی اور ہمارا خیال تھا کہ یہ جھاڑیوں میں چھُپ جائے گا۔'' صالح نے کہا۔ ''تُم غَلَط کہتے ہو۔ تُم نے گِرتے ہوئے ہرن کو ذبح کیا ہے۔''

محمدؐ بن قاسم نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”یہ صحیح ہے ہرن گر پڑا تھا لیکن میرے نیزے کی ضرب سے اور اگر تیر آپ نے چلایا تھا تو آپ اِس کی ٹانگ دیکھ سکتے ہیں۔“

صالح نے غضب ناک ہو کر تلوار نکالی لیکن سلیمان نے سختی سے کہا۔ ”تم اِن دونوں کے جوہر دیکھ چکے ہو۔ تمھیں اپنی تیر اندازی کے متعلّق غَلَط فہمی تھی۔ آج وہ بھی رفع ہو گئی۔“

یہ کہہ کر وہ محمدؐ بن قاسم سے مخاطب ہوا۔ ”میرا یہ دوست جس قدر جوشیلا ہے اُسی قدر کم عقل ہے۔ آپ کو ضرورت ہو تو آپ یہ شکار لے جا سکتے ہیں۔“

محمدؐ بن قاسم نے جواب دیا۔ ”نہیں شکریہ! اگر مُجھے ضرورت ہوتی تو میں خود شکار کر لیتا۔“

یہ کہہ کر اُس نے زبیر کی طرف اشارہ کیا اور دونوں نے باگیں موڑ کر اپنے گھوڑے سرپٹ چھوڑ دیے۔

پہلی فتح

صُبح کی نماز کے بعد دمشق کے لوگ بازاروں اور مکانوں کی چھتوں پر کھڑے محمدؐ بن قاسم کی فوج کا جلوس دیکھ رہے تھے۔ دُنیا کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ ایک دُور اُفتادہ ملک پر حملہ کرنے والی فوج کی قیادت ایک سترہ سالہ نوجوان کے سپرد تھی۔ دمشق سے لے کر بصرہ تک راستے کے ہر شہر اور بستی سے کئی کم سِن لڑکے، نوجوان اور بوڑھے اِس فوج میں شامل ہوئے۔ کوفہ اور بصرہ میں محمدؐ بن قاسم کی روانگی کی اِطلاع مل چکی تھی اور نوجوان عورتیں اپنے شوہروں، مائیں اپنے بیٹوں اور لڑکیاں اپنے بھائیوں کو نوجوان سالار کا ساتھ دینے کے لیے تیّار رہنے پر آمادہ کر رہی

تھیں۔ غیور قوم کی ایک بے کس بیٹی کی فریاد بصرہ اور کوفہ کے ہر گھر میں پہنچ چکی تھی۔ بصرہ کی عورتوں میں زبیدہ کی تبلیغ کے باعث یہی جذبہ پیدا ہو چکا تھا کہ ناہید کا مسئلہ قوم کی ہر بہو بیٹی کا مسئلہ ہے۔ نوجوان لڑکیاں مختلف محلّوں اور کوچوں سے زبیدہ کے گھر آتیں اور اس کی تقاریر سے ایک نیا جذبہ لے کر واپس جاتیں۔ خرابیٔ صحت کے باوجود محمدؐ بن قاسم کی والدہ بصرہ کی معمّر عورتوں کی ایک ٹولی کے ساتھ جہاد کی تبلیغ کے لیے ہر محلّہ کی عورتوں کے پاس پہنچی۔ زبیدہ نے چند نئے سپاہیوں کو گھوڑے اور اسلحہ جات بہم پہنچانے کے لیے اپنے تمام زیورات بیچ ڈالے۔ بصرہ کے تمام امیر و غریب گھرانوں کی لڑکیوں نے اس کی تقلید کی اور مجاہدین کی اعانت کے لیے بصرہ کے بیت المال کو چند دِنوں میں سونے اور چاندی سے بھر دیا۔ عراق کے دوسرے شہروں کی خواتین نے اِس کارِ خیر میں بصرہ کی عورتوں سے پیچھے رہنا گوارانہ کیا اور وہاں بھی لاکھوں روپے جمع ہو گئے۔

محمدؐ بن قاسم نے بصرہ میں تین دِن قیام کیا۔ اُس کی آمد سے پہلے بصرہ میں

حجّاج بن یوسف کے پاس مکران کے گورنر محمدّ بن ہارون کا یہ پیغام پہنچ چکا تھا کہ عبید اللہ کی قیادت میں بیس آدمیوں کا جو وفد دیبل بھیجا گیا تھا اس میں سے صرف دو نوجوان جان بچا کر مکران پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ باقی تمام دیبل کے گورنر نے قتل کر دیے ہیں۔ اِس خبر نے بصرہ کے عوام میں انتقام کی سُلگتی ہوئی آگ پر تیل کا کام دیا۔

دمشق سے روانگی کے وقت محمدّ بن قاسم کی فوج کی تعداد کل پانچ ہزار تھی لیکن جب وہ بصرہ سے روانہ ہوا تو اُس کے لشکر کی مجموعی تعداد بارہ ہزار تھی جن میں سے چھ ہزار سپاہی گھُڑ سوار تھے۔ تین ہزار پیدل اور تین ہزار سامانِ رسد کے اونٹوں کے ساتھ تھے۔

(۲)

محمدّ بن قاسم شیراز سے ہوتا ہوا مکران پہنچا۔ مکران کی سرحد عبُور کرنے کے بعد لس بیلا کے پہاڑی علاقے میں اُسے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بھیم سنگھ بھی دس ہزار فوج کے ساتھ لس بیلا کے سندھی گورنر کی اعانت کے لیے پہنچ چکا تھا۔ اُس نے ایک مضبوط پہاڑی قلعے کو اپنا مرکز بنا

کر تمام راستوں پر اپنے تیر انداز بٹھا دیے۔ اپنے باپ کی مخالفت کے باوجود وہ راجہ کو اِس بات کا یقین دِلا چُکا تھا کہ اُس کے بیس ہزار سپاہی بارہ ہزار مسلمانوں کو لس بیلا سے آگے نہیں بڑھنے دیں گے۔

مسلمانوں کے پہاڑی علاقے میں داخل ہوتے ہی بھیم سنگھ کے سپاہیوں نے اِکّا دُکّا حملے شروع کر دیے۔ تیس چالیس سپاہیوں کا گروہ اچانک کسی ٹیلے یا پہاڑی کی چوٹی پر نمودار ہوتا اور آن کی آن میں محمدّ بن قاسم کی فوج کے کسی حصّے پر تیر اور پتھّر برسا کر غائب ہو جاتا۔ گھوڑوں کے سوار اِدھر اُدھر ہٹ کر اپنا بچاؤ کر لیتے لیکن شُتر سوار دستوں کے لیے یہ حملے بڑی حد تک پریشان کُن ثابت ہوئے۔ بعض اوقات بِدک کر اِدھر اُدھر بھاگنے والے اونٹوں کو منظّم کرنا حملہ کرنے والوں کے تعاقب سے زیادہ مُشکل ہو جاتا۔

محمدّ بن قاسم نے یہ دیکھ کر ہراول کے پیادہ دستوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا لیکن حملہ آوروں کی ایک جماعت آگے سے کترا کر بھاگتی اور دوسری جماعت پیچھے سے حملہ کر دیتی۔ ایک گروہ کسی ٹیلے پر چڑھ کر لشکر کے

دائیں بازو کو اپنی طرف متوجّہ کرتا، اور دوسرا بائیں بازو پر حملہ کر دیتا۔ جوں جوں محمدّ بن قاسم کی فوج آگے بڑھتی گئی۔ اِن حملوں کی شدّت میں اضافہ ہوتا گیا۔ رات کے وقت پڑاؤ ڈالنے کے بعد شب خون کے ڈر سے کم از کم ایک چوتھائی فوج کو آس پاس کے ٹیلوں پر قابض ہو کر پہرہ دینا پڑتا۔

ایک شام محمدّ بن قاسم کو ایک جاسوس نے اطلاع دی کہ شمال کی طرف بیس کوس کے فاصلے پر ایک مضبوط قلعہ اُس لشکر کا مُستقر ہے۔ محمدّ بن قاسم نے اپنے تجربہ کار سالاروں کی ایک مجلسِ شوریٰ بُلائی۔ بعض سالاروں کی یہ صلاح تھی کہ اِس راستے کو چھوڑ کر سمندر کے ساحل کے ساتھ ساتھ نسبتاً ہموار راستہ اختیار کیا جائے۔ ہم اِس قلعے سے جس قدر دور ہوں گے اُسی قدر اِن حملوں سے محفوظ رہیں گے۔ لیکن محمدّ بن قاسم اُن سے متّفق نہ ہوا۔ اُس نے کہا۔ ”جب تک یہ علاقہ دُشمن سے پاک نہیں ہوتا۔ ہمارا آگے بڑھنا خطرے سے خالی نہیں۔ ہمارا مقصد دیبل تک پہنچنا نہیں، سندھ کو فتح کرنا ہے اور یہ قلعہ اُن کے دفاع کی اہم چوکی ہے۔

مُجھے یقین ہے کہ اِس قلعہ کے فتح ہو جانے کے بعد دُشمن یہ تمام علاقہ خالی کرنے پر مجبور ہو جائے گا اور دُشمن کے جو سپاہی یہاں سے فرار ہوں گے۔ وہ دیبل پہنچ کر ایک شکست خوردہ ذہنیت کا مظاہرہ کریں گے۔ لیکن اگر ہم یہاں سے کترا کر نکل گئے تو اُن کے حوصلے بڑھ جائیں گے اور ہمارا عقب ہمیشہ غیر محفوظ رہے گا۔ ہمارا پہلا مقصد اِس قلعے کو فتح کرنا ہے۔ اِس قلعے کی فتح کے بعد اگر پہاڑیوں میں پھیلے ہوئے لشکر کی تعداد کافی ہوئی تو وہ اِس علاقے میں ہمارے ساتھ فیصلہ کُن جنگ لڑنے کی کوشش کرے گا اور اُس میں بھی ہماری بہتری ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری پیش قدمی روکنے کے لیے اِس قلعے کے محافظوں کی زیادہ تعداد آس پاس کی پہاڑیوں پر منقسم ہے۔ میں آج سورج نکلنے سے پہلے اُس قلعے پر حملہ کرنا چاہتا ہوں اور اِس مقصد کے لیے میں اپنے ساتھ فقط پانچ سو پیادہ سپاہی لے جانا چاہتا ہوں۔ آپ باقی فوج کے ساتھ رات بھر پیش قدمی جاری رکھیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ لوگ چاروں اطراف کا خیال چھوڑ کر آپ کا رستہ روکنے کی فکر کریں گے۔ چاندنی رات میں آپ کے لیے آگے بڑھنے کا راستہ زیادہ خطرناک ثابت ہو گا۔ اگر صُبح تک آپ کو قلعہ فتح ہو جانے کی خبر پہنچ

جائے، تو آپ پیش قدمی روک کر میرے احکام کا انتظار کریں۔ اگر قلعہ فتح ہو جانے کے بعد دُشمن نے کسی جگہ منظّم ہو کر مُقابلے کی ہمّت کی تو میں قلعے کی حفاظت کے لیے چند آدمی چھوڑ کر آپ کے ساتھ آملوں گا۔ اور اگر اُنہوں نے قلعے کو دوبارہ فتح کرنا چاہا تو آپ وہاں پہنچ جائیں۔"

ایک بوڑھے سالار نے کہا۔ "مُجھے یقین ہے کہ سندھ کی فتح کے لیے خُدا نے آپ کو منتخب کیا ہے۔ انشاء اللہ آپ کی کوئی تدبیر غَلَط نہ ہو گی لیکن سپہ سالار کا فوج کے ساتھ رہنا ہی مناسب ہے۔ سپہ سالار کی جان بہت قیمتی ہوتی ہے۔ وہ فوج کا آخری سہارا ہوتا ہے۔ اگر اِس خطرناک مہم میں آپ کو کوئی حادثہ پیش آگیا تو۔"

محمدّ بن قاسم نے جواب دیا۔ "قادسیہ کی جنگ میں ایرانیوں کو اپنے زبردست لشکر کے باوجود اِس لیے شکست ہوئی کہ اُنہوں نے اپنی طاقت سے زیادہ رُستم کی شخصیت سے اُمّیدیں وابستہ کیں۔ رُستم مارا گیا تو وہ مسلمانوں کی مُٹھّی بھر جماعت کے مُقابلے سے بھاگ نکلے۔ لیکن اِس کے برعکس مسلمانوں کے سپہ سالار سعدؓ بن وقاص گھوڑے پر چڑھنے کے

قابل نہ تھے اور اُنہیں میدان سے الگ ایک طرف بیٹھنا پڑا۔ لیکن مسلمانوں کی خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ اُنہیں اپنے سپہ سالار کی عدم موجودگی کا احساس تک بھی نہ تھا۔ ہماری تاریخ میں آپ کو کوئی ایسا واقعہ نہیں ملے گا، جب سالار کی شہادت سے بد دِل ہو کر مجاہدوں نے ہتھیار ڈال دیے ہوں۔ ہم بادشاہوں اور سالاروں کے لیے نہیں لڑتے۔ ہم خُدا کے لیے لڑتے ہیں۔ بادشاہوں اور سالاروں پر بھروسہ کرنے والے اُن کی موت کے بعد مایوس ہو سکتے ہیں، لیکن ہمارا خُدا ہر وقت موجود ہے۔ قرآن میں ہمارے لیے اس کے احکام موجود ہیں۔ میں دُعا کرتا ہوں کہ خُدا مُجھے قوم کے لیے رستم نہ بنائے بلکہ مُجھے مثنیٰ بننے کی توفیق دے۔ جِن کی شہادت نے ہر مسلمان کو جذبۂ شہادت سے سرشار کر دیا تھا۔ میرے لیے اُس سپہ سالار کی جان کی کوئی قیمت نہیں جو اُسے اپنے سپاہیوں کی تلواروں کے پہرے میں چھُپا کر رکھتا ہے اور اپنے بہادروں کو جان کی بازی لگانے کی بجائے جان بچانے کی ترغیب دیتا ہے۔ اگر اِس قلعہ کو فتح کرنا اِس قدر اہم نہ ہوتا تو میں یہ مُہم شاید کسی اور کے سپرد کر دیتا لیکن اِس مہم کا خطرہ اور اِس کی اہمیّت دونوں اِس بات کے متقاضی ہیں کہ میں خود

اِس کی رہنمائی کروں۔‘‘

زبیر نے کہا۔ ’’میں آپ کے ساتھ چلنا چاہتا ہوں۔‘‘

محمدّ بن قاسم نے جواب دیا۔ ’’نہیں میں ایک قلعہ فتح کرنے کے لیے دو دماغوں کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ میری غیر حاضری میں تمہارا فوج کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔ میں اپنی جگہ محمدّ بن ہارون کو مقرر کرتا ہوں اور تُم اُس کے نائب ہو۔‘‘

(۳)

عشاء کی نماز کے بعد محمدّ بن قاسم نے پانچ سو نوجوان اس مہم کے لیے مُنتخب کیے اور اُن کے گھوڑے باقی لشکر کے حوالے کر کے محمدّ بن ہارون کو پیش قدمی کا حکم دیا اور خود اپنے جان نثاروں کے ساتھ ایک پہاڑی کی اوٹ میں چھُپ کر بیٹھ گیا۔

آدھی رات کے وقت چاند روپوش ہو گیا اور محمدّ بن قاسم نے قلعے کا رُخ کیا۔ راستے کی تمام پہاڑیوں کے محافظ محمدّ بن ہارون کی پیش قدمی کو تمام

لشکر کی پیش قدمی سمجھ کر اپنی اپنی چوکیاں خالی کر کے مشرق کی طرف جا چکے تھے۔ سندھی سواروں نے قلعہ میں بھیم سنگھ کو مشرق کی طرف مسلمانوں کی غیر متوقّع پیش قدمی سے باخبر کر دیا تھا اور وہ تین سو سپاہی قلعے کے اندر چھوڑ کر مسلمانوں کے لشکر کی راہ روکنے کے لیے روانہ ہو گیا۔ تیسرے پہر محمدؐ بن قاسم قلعے سے ایک میل کے فاصلے پر ایک پہاڑی پر پہنچ چکا تھا۔ دور چٹّانوں میں بھیم سنگھ کے سواروں کے گھوڑوں کی آواز گونجی اور محمدؐ بن قاسم نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”وہ قلعہ خالی کر کے جا رہے ہیں۔ ہمیں جلدی کرنی چاہیے، لیکن قلعے کے اندر حفاظت کے لیے تھوڑی بہت فوج ضرور موجود ہو گی۔ اِس لیے تمہاری طرف سے کوئی شور نہ ہو۔ تمہاری طرف سے ذرا سی آہٹ قلعہ کے محافظوں کو باخبر کر دے گی اور اگر اُن کی تعداد چالیس بھی ہوئی تو بھی وہ ہمیں کافی دیر تک قلعے سے باہر روک سکیں گے۔“

یہ ہدایات دینے کے بعد محمدؐ بن قاسم نے اپنے جانبازوں کو چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں تقسیم کیا اور قلعے کی طرف پیش قدمی کی۔

قلعے کے قریب پہنچ کر یہ فوج آس پاس کے ٹیلوں میں چھُپ کر بیٹھ گئی۔ فصیل پر پہرہ داروں کی آوازوں میں تھکاوٹ اور نیند کی جھلک تھی اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ بولنے کی بجائے بڑبڑا رہے ہیں۔ محمدؐ بن قاسم اپنے ساتھ دس نوجوان لے کر فصیل کے ایک نسبتاً پُر سکون حصّے کی طرف بڑھا اور کمند ڈال کر اوپر پڑھنے کے بعد رسّیوں کی سیڑھی پھینک دی۔ اِس جگہ دو پہرے دار گہری نیند سو رہے تھے۔ آن کی آن میں محمدؐ بن قاسم کے چھے ساتھی فصیل پر چڑھ گئے لیکن ساتواں ابھی اوپر نہ پہنچا تھا کہ چند قدم کے فاصلے سے ایک سپاہی نے چونک کر مشعل بُلند کرتے ہوئے کہا۔ ''کون ہے؟''

دوسرے سپاہی نے چلّا کر کہا: ''دُشمن آگیا۔ ہوشیار!''

محمدؐ بن قاسم نے اللہ اکبر کا نعرہ بُلند کیا اور ساتھ ہی ایک زور دار حملے سے فصیل کا بہت سا حصّہ خالی کرالیا۔ یہ نعرہ سُن کر قلعہ کے باہر چھُپے ہوئے سپاہی آگے بڑھے اور کمندیں ڈال کر فصیل پر چڑھنے لگے۔ قلعے کے اندر آرام سے سونے والے سپاہی ابھی اپنی تلواریں سنبھال رہے تھے کہ محمدؐ

بن قاسم کے پچاس سپاہی فصیل پر پہنچ گئے۔ پہرے داروں نے زیادہ دیر فصیل پر مزاحمت کرنے کی بجائے اندر جا کر گہری نیند سونے والے ساتھیوں کو جگانا زیادہ مناسب خیال کیا اور اُنھوں نے زیادہ دیر ڈٹ کر لڑنے پر ایک سُرنگ کے راستے فرار ہونے کو ترجیح دی۔ سُرنگ بہت تنگ تھی اور تمام سپاہی بیک وقت اُس میں گھُسنا چاہتے تھے۔ بعض نے مایوس ہو کر قلعے کا دروازہ کھول دیا اور کوئی پیدل اور کوئی گھوڑے پر سوار ہو کر قلعے سے باہر نکل آیا۔ قلعے کا دروازہ کھُلتا دیکھ کر مسلمان بھی فصیل پر چڑھنے کا خیال ترک کر کے اُس طرف بڑھے، اور زیادہ آدمیوں کو فرار کا موقع نہ مل سکا۔ دُشمن نے چاروں طرف سے مایوس ہو کر تلواریں سونت لیں، لیکن تھوڑی دیر مُقابلہ کرنے کے بعد ہتھیار ڈال دیے۔

قلعے کے اندر سُرنگ میں جمع ہونے والے سپاہی بُری طرح ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہے تھے۔ اُن کا شور سُن کر محمدؐ بن قاسم ایک پہرے دار کی نیچے گری ہوئی مشعل اُٹھا کر چند سپاہیوں کے ساتھ مختلف کمروں سے گُزرتا ہوا ایک تہہ خانے کے ایک دروازے تک پہنچا اور

فارسی زبان میں بولا:

”تُم میں سے جو فرار ہونا چاہے اس کے لیے قلعے کا دروازہ کھُلا ہے۔ تُم اپنے ہتھیار پھینک کر جاسکتے ہو۔“

یہ کہہ کر محمدؒ بن قاسم ایک طرف ہٹ گیا۔ راجہ کے سپاہیوں میں سے جو فارسی جانتے تھے، اُنھوں نے ایک دوسرے کو محمدؒ بن قاسم کا مطلب سمجھایا اور محمدؒ بن قاسم کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے تہہ خانے سے باہر نکل آئے۔ بعض نے سُرنگ کو ترجیح دی لیکن محمدؒ بن قاسم کے اشارے سے چند سپاہی تہہ خانے میں داخل ہوئے اور تلواریں سونت کر سُرنگ کے منہ پر کھڑے ہو گئے۔ محمدؒ بن قاسم نے کہا: ”جب تمہارے لیے ایک کھُلا راستہ موجود ہے تو تُم تنگ اور تاریک راستہ کیوں اختیار کرتے ہو۔ ہم پر اعتبار کرو۔ اگر تمہیں قتل کرنا مقصود ہوتا تو تمہاری گردنیں ہماری تلواروں سے دور نہیں۔“

محمدؒ بن قاسم کے یہ الفاظ سُن کر باقی سپاہی بھی ہتھیار پھینک کر تہہ خانے سے باہر نِکل آئے۔ محمدؒ بن قاسم نے واپس قلعے کے دروازے پر پہنچ کر

اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ قلعے سے باہر نکلنے والوں کے راستے میں مزاحم نہ ہوں۔

یہ لوگ جھجک جھجک کر قدم اُٹھاتے اور مُڑ مُڑ کر پیچھے دیکھتے ہوئے قلعے سے باہر نکل گئے۔ مفتوح دُشمن کے ساتھ یہ سلوک سندھ کی تاریخ میں ایک نیا باب تھا۔ ایک معمّر سپاہی آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا دروازے تک پہنچا اور کُچھ سوچ کر واپس آ گیا۔

محمدّ بن قاسم نے اُس سے کہا۔ ”اگر قلعے میں تمہاری کوئی چیز کھو گئی ہے، تو تلاش کر سکتے ہو۔“ اُس نے غور سے محمدّ بن قاسم کی طرف دیکھا اور سوال کیا۔ ”کیا عرب فوج کے سپہ سالار آپ ہیں؟“

”ہاں میں ہوں۔“ محمدّ بن قاسم نے جواب دیا۔

”دُشمن کسی حالت میں بھی نیک سلوک کا مستحق نہیں ہوتا۔ کیا میں پُوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے ہمارے ساتھ سلوک کیوں کیا؟“

”ہمارا مقصد دُشمن کو تباہ کرنا نہیں بلکہ اُس کو سلامتی کا راستہ دکھانا ہے۔“

”تو یقین رکھیے کہ آپ پر کوئی فتح نہیں پا سکتا۔ یہ لوگ جنہیں آج آپ اپنے رحم کا مُستحق سمجھتے ہیں، کل آپ کے جھنڈے تلے جمع ہو کر اِن مغرور بادشاہوں کے خلاف جنگ کریں گے، جو ِگرے ہوئے دُشمن پر رحم کرنا نہیں جانتے۔“ یہ کہہ کر وہ دروازے سے باہر نکل گیا۔ محمدؐ بن قاسم نے قلعے کا چکّر لگایا۔ چند تہہ خانے کھانے پینے کی اشیا سے بھرے پڑے تھے اور اصطبل میں ساٹھ گھوڑے موجود تھے۔

محمدؐ بن قاسم کو یقین تھا کہ محمدؐ بن ہارون کے تعاقب میں جانے والی فوج یہ قلعہ فتح ہو جانے کی خبر سُنتے ہی واپس آ جائے گی۔ اُس نے محمدؐ بن ہارون کے پاس چار سوار یہ پیغام دے کر روانہ کیے کہ وہ کسی محفوظ مقام پر پڑاؤ ڈال کر اُس کے احکام کا انتظار کرے۔ اِس کے بعد اُس قلعے کا دروازہ بند کر کے فصیل پر چاروں طرف تیر انداز بٹھا دیے اور قلعے پر جابجا اسلامی پرچم نصب کر دیے۔

(۴)

محمدؐ بن قاسم فصیل پر کھڑا طلوعِ آفتاب کا منظر دیکھ رہا تھا۔ اُسے مشرق

سے میں چالیس سواروں کا ایک دستہ قلعے کی طرف آتا دکھائی دیا۔ محمدؐ بن قاسم اور اُس کے ساتھی اُسے سندھ کی فوج کا دستہ سمجھتے ہوئے کمانوں پر تیر چڑھا کر بیٹھ گئے۔ یہ سوار قلعے سے کوئی تین سو قدم کے فاصلے پر آکر رُک گئے اور ایک سوار اپنے ساتھیوں سے علیحدہ ہو کر گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا فصیل کی طرف بڑھا۔ تیر انداز محمدؐ بن قاسم کے اشارے کے مُنتظر تھے۔ محمدؐ بن قاسم نے اُنہیں ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ سوار نے فصیل کے نیچے پہنچ کر گھوڑا روکا اور عربی زبان میں کہا۔ ”ہم زبیر کے ساتھی ہیں۔ ہمیں اندر آنے دو۔“

محمدؐ بن قاسم نے آگے جھک کر پوچھا۔ ”تمہارا نام خالد ہے۔ “

”جی ہاں۔“ اُس نے جواب دیا۔

”اپنے ساتھیوں کو بُلا لو۔“ خالد نے پیچھے مُڑ کر اپنے ساتھیوں کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور محمدؐ بن قاسم نے سپاہیوں کو قلعے کا دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔ قلعے سے باہر نکل کر خالد سے سوال کیا۔ ”تمہاری بہن کہاں ہے؟“

خالد نے جواب دیا۔ ”وہ میرے ساتھ ہے لیکن زبیر نہیں آیا؟“

”وہ باقی فوج کے ساتھ ہے۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ ہم اِس قلعے میں ہیں؟“

”ہمیں یہ خبر مِل چکی تھی کہ آپ مکران کی سرحد عبُور کر چکے ہیں۔ ہم سندھی سپاہیوں کا بھیس بدل کر یہاں پہنچے اور آپ حیران ہوں گے کہ راجہ کی فوج کا سالار ہمیں یہاں سے چار میل دور ایک پہاڑی پر پہرہ دینے کیلیے متعیّن کر چکا تھا۔ ہم سخت بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہے تھے۔ آج قلعے سے فرار ہونے والے سپاہی وہاں پہنچے اور اُنہوں نے بتایا کہ یہ قلعہ فتح ہو چکا ہے۔ ہم آپ کو مبارک باد دیتے ہیں۔ سپہ سالار کہاں ہیں؟“

محمدؐ بن قاسم نے مُسکراتے ہوئے اپنے ایک ساتھی کی طرف دیکھا اور اس نے جواب دیا۔ ”تُم سپہ سالار سے باتیں کر رہے ہو۔“

تھوڑی دیر میں خالد کے باقی ساتھی اُن کے قریب پہنچ کر گھوڑوں سے

نیچے اُتر رہے تھے۔ محمدؐ بن قاسم نے اُن سب پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد کہا۔ ”لیکن تمہاری بہن کہاں ہے؟“

خالد نے مُسکرا کر مردانہ لباس میں ایک نقاب پوش کی طرف اشارہ کر دیا۔

محمدؐ بن قاسم نے کہا۔ ”خدا کا شکر ہے کہ آپ کی صحت اب ٹھیک ہے۔ ہاں زبیر باقی فوج کے ساتھ ہے۔“

زبیر کا نام سُن کر ناہید نے اپنے کانوں اور گالوں پر اچانک حرارت محسوس کی، اور پیچھے مُڑ کر مایا کی طرف دیکھا۔ مایا بھی اُس کی طرح مردانہ لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس نے آنکھ بچا کر ناہید کے بازو پر چُٹکی لی، اور آہستہ سے کہا۔ ”ناہید مبارک ہو۔“

(۵)

محمدؐ بن قاسم نے پھر ایک بار خالد کے تمام ساتھیوں کی طرف دیکھا، اور ایک سفید ریش قوی ہیکل آدمی کی طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے

ہوئے کہا۔ ”شاید تُم گنگو ہو۔ میں تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا شکر گزار ہوں۔“

گنگو نے محمدّ بن قاسم کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے خالد کی طرف دیکھا اور خالد نے کہا۔ ”گنگو اور اِس کے ساتھی مسلمان ہو چکے ہیں اور گنگو نے اپنے لیے سعد کا نام پسند کیا ہے۔“

محمدّ بن قاسم نے الحمد للہ کہہ کر یکے بعد دیگرے سب سے مصافحہ کیا اور ناصر الدّین (جے رام) کے ساتھ ہاتھ ملاتے وقت اُس نے کہا۔ ”آپ غالباً ناصر الدّین ہیں۔ آپ نے ہمارے لیے بہت تکلیف اُٹھائی۔ خُدا آپ کو جزا دے اور یہ شاید آپ کی ہمشیرہ ہے؟“

خالد نے کہا۔ ”یہ بھی مسلمان ہو چکی ہے۔ اِن کا نام زہرا ہے۔“

زہرا نے ناصر الدّین کے قریب آکر دبی زبان میں پوچھا۔ ”یہ کون ہیں۔۔۔؟“ اور ناصر الدّین نے اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کر کے یہ سوال خالد کے کانوں تک پہنچا دیا۔

خالد نے بُلند آواز میں کہا۔ "یہ ہمارے سپہ سالار ہیں۔"

سعد (گنگو) اور اُس کے ساتھی حیران ہو کر محمدّ بن قاسم کی طرف دیکھنے لگے، دور سے گھوڑوں کی ٹاپ سُنائی دی اور فصیل سے ایک پہرے دار نے آواز دی۔ "دُشمن کی فوج آ رہی ہے۔"

یہ لوگ جلدی سے قلعے میں داخل ہوئے۔ محمدّ بن قاسم نے فصیل پر چڑھ کر دور تک نگاہ دوڑائی۔ جنوب اور مشرق کی طرف سے سندھ کے ہزاروں پیادہ اور سوار سپاہی قلعے کا رُخ کر رہے تھے۔ محمدّ بن قاسم نے اپنے دس سپاہیوں کو گھوڑوں پر سوار ہو کر اپنے نائب تک یہ پیغام پہنچانے کا حکم دیا کہ وہ شام سے پہلے اس جگہ پہنچ جائے۔

سپاہی گھوڑوں پر سوار ہو گئے تو محمدّ بن قاسم نے اُنہیں ہدایت کی کہ وہ مغرب کی طرف سے چکّر کاٹ کر حملہ آور لشکر کی زد سے نکل جائیں اور پھر اپنی منزل کا رُخ کریں۔ سپاہی گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے قلعے سے باہر نِکل گئے۔ حملہ آور قریب آ چکے تھے۔ محمدّ بن قاسم نے قلعے کا دروازہ بند کرنے کا حکم دے کر دوبارہ فصیل پر چڑھ کر چکّر لگایا اور تیر

اندازوں کو ہوشیار رہنے کی تاکید کی۔ فصیل کے ایک کونے پر خالد اور اُس کے ساتھی نہایت بے تابی سے حملہ آوروں کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ اُن کے درمیان ناہید اور زہرا کو دیکھ کر محمدّ بن قاسم نے کہا۔ ”خالد! اُنہیں نیچے لے جاؤ۔ یہاں اِن کی ضرورت نہیں۔“

ناہید نے جواب دیا۔ ”آپ ہماری فکر نہ کریں۔ ہم تیر چلانا جانتی ہیں۔“

”تمہاری مرضی، لیکن ذرا سر نیچے رکھو۔“ محمدّ بن قاسم یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

بھیم سنگھ کے سپاہیوں نے گھوڑوں کو ٹیلوں کے عقب میں چھوڑ کر چاروں طرف سے قلعے کا محاصرہ کر لیا اور چٹّانوں اور پتھّروں کے مورچے بنا کر قلعے پر تیروں کی بارش کرنے لگے۔ قلعے کی فصیل کے مورچوں میں بیٹھنے والوں کے لیے حملہ آوروں کے تیر بے اثر ثابت ہوئے۔ محمدّ بن قاسم نے اپنے سپاہیوں کو کہہ دیا کہ وہ فقط قلعے پر دشمن کی یلغار روکنے کے لیے تیروں کو استعمال کریں۔

بھیم سنگھ نے اپنی فوج کے تیروں کا قلعے سے کوئی جواب دیا کہ ”راجہ داہر کی جے“ کا نعرہ بلند کیا اور چٹانوں اور پتھروں کی آڑ میں چھپ کر تیر چلانے والوں نے چاروں طرف سے قلعے پر دھاوا بول دیا۔ جب یہ لشکر قلعہ کے محافظوں کے تیروں کی زد میں آ گیا تو محمدؒ بن قاسم نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ یہ نعرہ ابھی فضا میں تحلیل نہ ہوا تھا کہ قلعے سے تیروں کی بارش ہونے لگی اور بھیم سنگھ کے سپاہی زخمی ہو ہو کر گرنے لگے۔ لیکن بیس ہزار فوج چند سو سپاہیوں کے نقصان کی پروا نہ کرتے ہوئے قلعے کی فصیل تک پہنچ گئی اور کمندیں ڈال کر قلعے پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگی لیکن تیروں کی بوچھاڑ کے سامنے اُن کی پیش نہ گئی۔ چند ساعتوں کے بعد بھیم سنگھ کے قریباً دو ہزار آدمی قلعے کی دیواروں کے آس پاس ڈھیر ہو کر رہ گئے اور اسے فوج کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیا پڑا۔

دوسرے پہر تک بھیم سنگھ نے قلعے پر تین بار حملہ کی لیکن تینوں مرتبہ اسے مایوس ہو کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ سہ پہر کے وقت بھیم سنگھ ایک فیصلہ کُن حملے کی تیاری کر رہا تھا کہ اسے پیچھے سے محمدؒ بن قاسم کی باقی فوج کی آمد کی

اطلاع ملی۔ اس نے سواروں کو حکم دیا کہ وہ پیچھے ہٹ کر اپنے گھوڑے سنبھالیں اور پیادہ فوج کے تیر اندازوں کو آس پاس کی پہاڑیوں پر متعین کر دیا۔ دشمن کی نقل و حرکت دیکھ کر محمدّ بن قاسم کو یقین ہو گیا کہ دشمن کو محمدّ بن ہارون کی آمد کی اطلاع مل چکی ہے۔ اسے خطرہ پیدا ہوا کہ قلعے کے قریب پہنچ کر وہ چاروں طرف کے ٹیلوں اور پہاڑوں سے تیروں کی زد میں ہو گا۔ اس نے جلدی سے کاغذ پر ایک نقشہ بنایا اور محمدّ بن ہارون کے نام چند ہدایات لکھ کر اپنے سپاہی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”محمدّ بن ہارون کے یہاں پہنچنے سے پہلے اُسے یہ رقعہ پہنچانا ضروری ہے لیکن یہ کام جس قدر اہم ہے اُسی قدر خطرناک ہے۔ اِس وقت دشمن کی توجّہ دوسری طرف مبذول ہو چکی ہے۔ شمال کی طرف سے دُشمن کے مورچے تقریباً خالی ہو چُکے ہیں اور ہم فصیل سے آدمی اُتار سکتے ہیں لیکن پھر بھی محمدّ بن ہارون تک پہنچنے کے لیے اُسے کئی خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اِس مہم کے لیے رضاکار۔۔۔۔۔!“

خالد نے محمدّ بن قاسم کا فقرہ پورا نہ ہونے دیا اور بولا۔ ”مُجھے اجازت

دیجیے۔"

بہت سے سپاہیوں نے خالد کی مخالفت کی اور اپنے نام پیش کیے۔ سعد نے کہا۔ "میں نے سُنا ہے کہ مسلمان اپنے نو مسلم بھائی کی خواہش رد نہیں کرتے۔ آپ مُجھے اجازت دیں۔ میرے لباس سے کسی کو مُجھ پر شک بھی نہیں ہو گا اور میں اِس زمین کے چپّے چپّے سے واقف بھی ہوں۔"

محمدّ بن قاسم کو اپنی فوج دُشمن کے لشکر کے عقب میں دو تین میل کے فاصلے پر ایک ٹیلے سے اُترتی ہوئی دکھائی دی۔ اُس نے سعد کے ہاتھ میں رقعہ دیتے ہوئے کہا۔ "جاؤ خُدا تمہاری مدد کرے۔"

سعد بھاگتا ہوا شمال کی دیوار کی طرف پہنچا اور ایک رسّے کے ذریعے نیچے اُتر گیا۔

(۶)

محمدّ بن ہارون نے دور سے بھیم سنگھ کے سوار دستوں کو حملے کے لیے تیّار دیکھ کر اپنی فوج کو رُکنے کا حکم دیا اور مُقابلے کے لیے صفیں درست

کرنے کے بعد پیش قدمی کا حکم دینے والا تھا کہ لشکر کے دائیں بازو کا سالار سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور اس نے ایک رقعہ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ تحریر تو سپہ سالار کی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن لانے والا ایک سندھی ہے۔ ہم نے اُسے گرفتار کر لیا ہے۔ وہ بھی عربی جانتا ہے اور کہتا ہے کہ زبیر مُجھے جانتا ہے۔ اپنا نام کبھی سعد بتاتا ہے اور کبھی گنگو۔“

زبیر نے چونک کر کہا۔ ”میں اُسے جانتا ہوں۔“

محمدؐ بن ہارون نے رقعہ پڑھنے کے بعد کہا۔ ”سپہ سالار کا رقعہ دیکھنے کے بعد تمہیں اِس کے متعلّق تحقیقات کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر تُم نے اُس کے ساتھ کوئی بدسلوکی کی ہے تو جا کر معافی مانگو، اور اپنے سواروں سے کہو کہ وہ میرے ساتھ آ ملیں۔ زبیر! ہمارے دائیں اور بائیں طرف تمام پہاڑیوں پر دُشمن کے تیر اندازوں کا قبضہ ہے۔ تم میسرہ کے شُتر سواروں کو اونٹوں سے اُتر کر دونوں بازوؤں سے پہاڑیوں پر حملہ کرنے اور بائیں بازو کے سواروں کو مقدمۃ الجیش کے ساتھ شامل ہو جانے کا حکم

دو۔ جب تک دُشمن کے تیر انداز اِن پہاڑیوں پر موجود ہیں، ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔"

بھیم سنگھ کی چال نہایت کامیاب تھی۔ اگر محمدّ بن ہارون سامنے سے فوراً حملہ کر دیتا تو اُس کے لشکر کے دونوں بازوؤں پر پہاڑیوں میں چھُپے ہوئے تیر انداز مسلمانوں کی فوج کے لیے بہت خطرناک ثابت ہوتے لیکن بھیم سنگھ کی توقّع کے خلاف جب دائیں اور بائیں بازو سے مسلمانوں کی پیادہ فوج پہاڑیوں پر چڑھنے لگی تو اُس نے فوراً آگے بڑھ کر حملے کا حکم دے دیا۔

قلعے کے اندر محمدّ بن قاسم اِس موقع کا مُنتظر تھا۔ اُس نے پچاس سپاہیوں کو قلعے کی حفاظت پر متعیّن کیا اور باقی فوج کو قلعے سے باہر نکال کر دُشمن پر عقب سے حملہ کرنے کے لیے تیّار رہنے کا حکم دیا۔ سوار اور پیدل سپاہی قلعے کے دروازے پر جمع ہو گئے۔ اور محمدّ بن قاسم دروازے کے سوراخ میں سے دونوں افواج کی نقل و حرکت دیکھنے لگا۔

خالد ناصر الدّین اور اُس کے ساتھی بھی قلعے میں ٹھہرنے والے سپاہیوں سے خُود، زرہیں اور عربی لباس حاصل کر کے گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔

اچانک ناہید اور زہرا کیل کانٹے سے لیس ہو کر ایک کمرے سے باہر نکلیں اور دروازے کے پاس پہنچ کر کھڑی ہو گئیں۔

خالد نے کہا۔ ”ناہید! زہرا! جاؤ! قلعے کے باہر تمہارا کوئی کام نہیں۔“

ناصر الدّین نے اُس کی تائید کی۔ محمدّ بن قاسم نے مُڑ کر اُن کی طرف دیکھا اور کہا، ”میں تمہارے جذبۂ جہاد کی داد دیتا ہوں، لیکن تُم قلعے کی حفاظت کے لیے سپاہیوں کا ساتھ دے کر ہماری مدد کر سکتی ہو۔ قوم کے لیے بہادر ماؤں کا دودھ خون سے زیادہ قیمتی ہے۔ نازک وقت آنے پر وہ گھروں کی چار دیواری کو ِگرتی ہوئی قوم کے لیے آخری قلعہ بنا سکتی ہیں۔ تُم یہاں ہو گی تو قلعے کی حفاظت میں یہ چند سپاہی اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہانے سے دریغ نہیں کریں گے۔ لیکن میدان میں سپاہیوں کو دُشمن کا مُقابلہ کرنے سے زیادہ تمہاری حفاظت کا خیال ہو گا۔ تم میں سے ایک کا زخمی ہو کر ِگرنا سینکڑوں سپاہیوں کو بد دِل کر دے گا اور یہ معرکہ ایسا نہیں جس کے لیے ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہو۔ تم تھوڑی دیر آرام کر لو شاید رات بھر تمہیں زخمیوں کی مرہم پٹّی کے لیے جاگنا پڑے۔ خالد!

اُنہیں اندر لے جاؤ!"

یہ کہہ کر وہ پھر دروازے کے سوراخ میں سے جھانکنے لگا۔ جب دونوں افواج گتھّم گتھّا ہو گئیں، تو محمدّ بن قاسم نے گھوڑے پر سوار ہو کر دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔

خالد، ناہید اور زہرا کو کمرے میں چھوڑ کر واپس لوٹا اور وہ ابھی دروازے تک نہ پہنچا تھا کہ زہرا نے بھاگ کر اُس کا دامن پکڑ لیا۔ "خدا کے لیے مجُھے ساتھ لے چلیے۔ میں زندگی اور موت میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔"

خالد نے برہم ہو کر جواب دیا۔ "زہرا! نادان نہ بنو! تُم سپہ سالار کا حکم سُن چکی ہو، مجُھے جانے دو۔ فوج قلعے سے باہر نکل رہی ہے۔"

زہرہ نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "خُدا کے لیے مجُھے بزدل خیال نہ کرو۔ میں تمہارے ساتھ جان دینا چاہتی ہوں۔"

"زہرا! زہرا! مجُھے چھوڑ دو!" یہ کہتے ہوئے اُس نے زہرا کے ہاتھ جھٹک

دیے لیکن وہ پھر راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔

اُس نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”اگر آپ اِس سعادت سے محروم نہیں ہونا چاہتے تو مُجھے کیوں محروم رکھنا چاہتے ہیں۔“

”زہرا! یہ امیرِ عساکر کا حکم ہے اور جہاد میں امیرِ عساکر کی حکم عدولی سب سے بڑا جُرم ہے۔“

زہرا نے بد دِل ہو کر خالد کا دامن چھوڑ دیا اور سسکیاں لیتی ہوئی ناہید سے لپٹ گئی۔

خالد بھاگتا ہوا دروازے تک پہنچا، سپاہی جا چکے تھے اور دروازہ بند تھا۔ خالد نے پہرے دار سے دروازہ کھولنے کے لیے کہا لیکن اُس نے جواب دیا جب تک باہر سے سپہ سالار کا حکم نہ آئے، میں دروازہ نہیں کھول سکتا۔ خالد کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اُسے خیال آیا کہ وہ اُسے بزدل سمجھ کر پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ اُس نے بھاگ کر دروازے کے سوراخ سے باہر جھانکا۔ قلعے کی پیادہ فوج عقب سے بھیم سنگھ کے لشکر کے دونوں

بازوؤں پر حملہ کر چکی تھی اور محمدؐ بن قاسم ساٹھ سواروں کے ہمراہ براہ راست قلبِ لشکر پر حملہ کر چکا تھا۔ خالد دُشمن کے لشکر کے عین وسط میں ہلالی پرچم دیکھ کر اپنی مُٹھیاں بھینچتا اور ہونٹ کاٹتا ہوا پہرے داروں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "انہوں نے میرا انتظار کیا ہو گا اور سمجھ لیا ہو گا کہ میں موت کے ڈر سے قلعے میں کہیں چھُپ کر بیٹھ گیا ہوں۔ خُدا کے لیے دروازہ کھول دو، مُجھے جانے دو۔"

پہرے دار نے جواب دیا۔ "آپ اطمینان رکھئے۔ سپہ سالار کو یہ شک نہیں کہ آپ بُزدل ہیں۔ ورنہ شاید آپ کے قتل کا حکم دے جاتے اور یہ کہتے تھے کہ لڑکیوں کے پاس آپ کا ٹھہرنا بہتر ہو گا۔ ہمیں دروازہ کھولنے کی اجازت نہیں۔"

"تو میں فصیل سے کود جاؤں گا۔" یہ کہ کر خالد فصیل کی سیڑھی کی طرف لپکا۔ راستے میں زہرا کھڑی تھی۔ اُس نے کُچھ کہنا چاہا لیکن خالد کے تیور دیکھ کر سہم گئی۔

خالد نے اُس پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالی اور کہا۔ "اب تُم خوش ہو نا؟"

زہرا نے کہا۔ ”مجھے معاف کر دو! میں ایک عورت ہوں۔“

”خدا ایک زندہ قوم کو تمہارے جیسی عورتوں سے بچائے۔“ خالد یہ کہہ کر بھاگتا ہوا زینے پر چڑھا اور رسّا پھینک کر آن کی آن میں فصیل سے نیچے اُتر گیا۔ زہرا نے بھاگ کر کمرے سے تلوار اُٹھائی۔ ناہید نے پوچھا۔ ”زہرا کہاں جا رہی ہو؟“

زہرا نے جواب دیا۔ ”تمہارے بھائی نے ہمیشہ مجھے غَلَط سمجھا، اگر میں واپس نہ آسکوں تو اسے کہہ دینا میں بُزدل نہ تھی۔ کاش! ہمارا سماج عورت کو اپنے پتی کی چِتا پر جلنے کی بجائے کسی مقصد پر قربان ہونا سکھاتا۔“

ناہید نے کہا۔ ”زہرا! ٹھہرو! زہرا! زہرا!“

لیکن زہرا آندھی کی طرح کمرے میں داخل ہوئی اور بگولے کی طرح باہر نکل گئی۔ ناہید اُس کے پیچھے بھاگی لیکن جب تک وہ زینے کے قریب پہنچی وہ فصیل پر چڑھ کر رسّیوں کی سیڑھی نیچے پھینک چکی تھی۔ سپاہیوں نے اس کو روکنا چاہا لیکن اُس نے کہا۔ ”اگر میرا راستہ روکا گیا تو میں فصیل سے

کود جاؤں گی۔“

سپاہی پریشان ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے اور زہرا نیچے اُتر گئی۔ ناہید نے فصیل پر پہنچ کر آوازیں میں۔ ”زہرا! زہرا! پگلی نہ بنو۔ واپس آ جاؤ۔“ لیکن ناہید کی ہر آواز کے ساتھ اُس کی رفتار تیز ہو گئی۔ ناہید نے مایوس ہو کر خود نیچے اُترنے کا ارادہ کیا لیکن ایک عُمر رسیدہ سپاہی نے کہا۔ ”عورت کا جوش اندھا ہوتا ہے۔ اگر آپ نے اُس کا تعاقب کیا تو وہ بے تحاشا دُشمنوں کی صفوں میں جا پہنچے گی۔“

ناہید نے مایوس ہو کر ایک سپاہی سے تیر و کمان منگوایا اور فصیل کے ایک مورچے میں بیٹھ گئی۔ ایک گھوڑا اپنے سوار کو میدان میں گِرا کر اِدھر اُدھر بھاگ رہا تھا۔ زہرا نے بھاگ کر اُس کی لگام پکڑ لی اور اُس پر سوار ہو گئی۔ اُسے گھوڑے پر دیکھ کر ناہید کو قدرے اطمینان ہوا اور وہ اُس کی سلامتی کے لیے دُعائیں مانگنے لگی۔

(۷)

مسلمانوں کی فوج پر بھیم سنگھ کی فوج کا پہلا حملہ بہت زور دار تھا اور اُنہیں ایک تنگ وادی میں چند قدم پیچھے ہٹنا پڑا لیکن پیادہ فوج آس پاس کی پہاڑیوں پر قبضہ جما کر تیر برسانے لگی تو سندھ کے لشکر کی توجّہ دو حصّوں میں بٹ گئی۔ عین اُس موقع پر محمدؐ بن قاسم نے قلعے کا دروازہ کھول کر عقب سے حملہ کر دیا اور چند شہسواروں کے ہمراہ دُشمن کی صفیں درہم برہم کرتا ہو لشکر کے قلب تک جا پہنچا۔

لشکر کے عین درمیان سبز پرچم دیکھ کر محمدؐ بن ہارون نے اپنے لشکر کو تین اطراف سے عام حملے کا حکم دے دیا۔ زبیر، محمدؐ بن قاسم کی اعانت کے لیے پانچ سو سواروں کو لے کر آگے بڑھا اور آن کی آن میں اُس کے ساتھ آملا۔ بھیم سنگھ کی فوج بدحواس ہو کر قلعے کی طرف ہٹنے لگی۔ وادی میں اُٹھتی ہوئی گرد نے شام کے دُھندلکے کے ساتھ مل کر آمدِ شب کے آثار پیدا کر دیے تھے۔ بھیم سنگھ نے آخری بار اپنی فوج کی ٹوٹی ہوئی صفیں منظّم کرنے کی کوشش کی لیکن زبیر کی تقلید میں محمدؐ بن ہارون کے

باقی سپاہی بھی میدان کو صاف کرتے ہوئے محمدؒ بن قاسم کے ساتھ آ ملے۔

بھیم سنگھ کی فوج غیر منظّم ہو کر مختلف ٹولیوں میں لڑنے لگی۔ مسلمانوں کے دباؤ سے کئی ٹولیاں پسپا ہو کر قلعے کے قریب پہنچ چکی تھیں اور جب قلعے کے محافظ اُن پر تیر برسانے لگے تو وہ بد حواس ہو کر اِدھر اُدھر بھاگ نکلے۔

خالد تیر اندازوں کی ایک جماعت کے ساتھ ایک ٹیلے سے اُترا اور نعرۂ تکبیر بُلند کرتے ہوئے دُشمن کی ایک ٹولی پر ٹوٹ پڑا۔ بد حواس سپاہی ایک طرف ہٹ گئے اور خالد اُن کے تعاقب میں اپنے ساتھیوں سے علیحدہ ہو گیا۔ دُشمن کے سپاہیوں نے موقع پا کر اُسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اچانک ایک سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا اور اُس نے اللہ اکبر کہہ کر اُس ٹولی پر حملہ کر دیا۔ خالد اُس کی آواز پہچان کر چونکا۔ یہ زہرا تھی۔ زہرا کی تلوار یکے بعد دیگرے دو سپاہیوں کے سروں پر چمکی اور دونوں گر کر خاک میں لوٹنے لگے۔ ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر زہرا پر وار کیا۔

زہرا کا گھوڑا اچانک بِدکا اور تلوار اُس کی اگلی ٹانگ پر لگی۔ گھوڑے نے چند چھلانگیں لگائیں اور ڈگمگا کر گِر پڑا۔ مسلمانوں کے دستوں کو قریب آتا دیکھ کر بھیم سنگھ کے سپاہیوں نے میدان کا یہ حصّہ بھی خالی کر دیا۔ خالد بھاگتا ہوا زہرا کے پاس پہنچا۔ وہ گھوڑے کے قریب مُنہ کے بل بڑی ہوئی تھی۔ قریب پہنچ کر خالد کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اُس کے منہ سے بیک وقت سسکیاں آہیں اور دُعائیں نکلیں۔ وہ رکا، جھجکا، کپکپایا اور پھر بھاگ کر زہرا کو اُٹھانے لگا۔ معاً اُسے زہرا کی پیٹھ پر خُون کے نشان اور زرہ میں دو تیز اٹکے ہوئے نظر آئے اور زندگی کی تمام حسّیات سمٹ کر اُس کی آنکھوں میں آ گئیں۔ اُس نے یکے بعد دیگرے دونوں تیر نکال کر پھینک دیے۔ زہرا نے ایک جھرجھری لینے کے بعد آنکھیں کھولیں اور اُٹھ کر بیٹھ گئی خالد نے چاند کی ہلکی اور پھیکی روشنی میں اُس کا زرد چہرہ دیکھا اور کہا۔ ”تمہیں تکلیف تو نہیں؟“

اُس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مُسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اُس نے کہا۔ ”نہیں! میں نے اِن تیروں کو محسوس بھی نہیں کیا۔ گھوڑے سے گِرنے

کے بعد میرا سر چکرا گیا تھا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میدان کا کیا حال ہے؟"

"میدان خالی ہو چکا ہے۔ خُدا نے ہمیں فتح دی ہے لیکن ناہید کہاں ہے؟"

"وہ قلعے میں ہے۔ میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"وہ کیا؟"

"آپ مُجھ سے خفا تو نہیں؟"

"زہرا! مُجھے نادم نہ کرو۔ مجھے اپنی سخت کلامی کا بہت افسوس ہے۔"

وہ بولی۔ "نہیں میں غَلَطی پر تھی۔ مجُھے ڈر تھا کہ آپ شاید واپس نہ آ سکیں۔ آج میں دیکھ چُکی ہوں کہ انسان اپنی موت کے معیّن وقت سے پہلے نہیں مرتا۔ میں تیروں کی بارش میں سے گزر کر میدان تک پہنچی لیکن میں نے محسوس کیا کہ قدرت کا زبردست ہاتھ میری حفاظت کر رہا ہے۔"

مسلمانوں کی فوج فتح کے نعرے لگاتی ہوئی قلعے کت دروازے کے سامنے جمع ہورہی تھی۔ خالد نے کہا۔ ”چلو زہرا! ناہید پریشان ہوگی۔“

زہرا نے اُٹھ کر خالد کے ساتھ چند قدم اُٹھائے لیکن اُسے چکّر آیا اور وہ ڈگمگاتی ہوئی زمین پر بیٹھ گئی۔ اُس نے خالد سے پانی مانگا اور خالد نے ایک گِرے ہوئے سپاہی کی چھاگل اُتار کر اُس کے مُنہ سے لگا دی۔ زہرا پانی کے چند گھونٹ پی کر اُٹھ بیٹھی۔ خالد نے کہا۔ ”زہرا! میں اُٹھالوں، خُون بہہ جانے سے تم بہت زیادہ کمزور ہوچکی ہو۔“

زہرا نے کہا۔ ”نہیں مجھے پیاس کی وجہ سے چکّر آگیا تھا۔ مجھے فقط آپ کے سہارے کی ضرورت ہے۔“

خالد نے اُسے اپنے بازو کا سہارا دیا اور آہستہ آہستہ اُس کے ساتھ چلنے لگی۔ چند قدم چلنے کے بعد اُسے ناصر الدّین کی آواز سنائی دی۔ ”زہرا! زہرا!!“ اور اس نے خالد سے کہا۔ ”بھائی مجھے تلاش کر رہا ہے۔ اسے آوازہ دو!“

خالد نے بُلند آواز میں کہا۔ ”زہرا میرے پاس ہے۔اِس طرف۔“

ناصر الدّین، زبیر اور ناہید تیزی سے چلتے ہوئے اُن کے قریب پہنچے۔ناہید نے بھاگ کر زہرا کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ”زہرا! زہرا! میری بہن تُم کیسی ہو؟“

اُس نے جواب دیا۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں؟“

لیکن ناہید نے اپنی انگلیوں پر نمی محسوس کرتے ہوئے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور چونک کر کہا۔ ”زہرا! تُم زخمی ہو؟ بھائی ناصر الدّین! اِسے قلعے کے اندر لے چلو۔“

ناصر الدّین نے آگے بڑھ کر زہرا کو اُٹھانے کی کوشش کی لیکن اُس نے کہا۔ ”بھیّا! میں بالکل ٹھیک ہوں، میں چل سکتی ہوں اور یہ کون ہیں ؟۔۔۔بھیّا زبیر! مجھے معاف کرنا میں پہچان نہ سکی۔“

زبیر نے کہا۔ ”ننھّی بہن! تُم اپنے بھائیوں کو بہت پریشان کرتی ہو۔اب چلو ہمیں تمہاری مرہم پٹّی کرنی چاہیے۔“

چند قدم چلنے کے بعد انہیں سعد نظر آیا۔ وہ جھک جھک کر میدان میں پڑی ہوئی لاشیں دیکھ رہا تھا۔ خالد نے اُسے آواز دی۔ "چچا کسے ڈھونڈ رہے ہو۔ ہم اِس طرف ہیں۔"

وہ بھاگتا ہوا اُن کے قریب آیا اور بے قرار ہو کر بولا۔ "میرے بیٹے! میری بیٹی! تم کہاں تھے؟"

خالد نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "ہم آپ کو تلاش کر رہے تھے۔"

"تُم مجھے تلاش کر رہے تھے؟ چور کہیں کے۔ ناہید سے پوچھو میں کس قدر پریشان تھا۔"

ناہید نے کہا۔ "یہ تمہارے لیے بہت پریشان تھے۔ ہم نے میدان کا صرف ایک چکّر لگایا ہے اور یہ شاید تین چار چکّر لگا چُکے ہیں۔"

سعد نے کہا۔ "صرف اِسی میدان میں نہیں، میں تو آس پاس کی تمام پہاڑیوں پر بھی خوار ہو آیا ہوں۔ تُم نے آواز تو دی ہوتی۔ میرا تو گلا بھی بیٹھ گیا۔"

خالد نے کہا۔ ”میں نے آپ کی آواز نہیں سُنی ورنہ میں جواب ضرور دیتا۔“

سعد نے کہا۔ ”اِن زخمیوں کی چیخ پُکار میں کسی کی آواز سنائی بھی کب دیتی ہے۔“

یہ لوگ باتیں کرتے ہوئے قلعے کے دروازے کے قریب پہنچے تو ناہید نے آہستہ سے سعد کے کان میں کُچھ کہا اور وہ چند بار سر ہلانے کے بعد ناصر الدّین سے مخاطب ہوا۔ میں علیحدگی میں آپ کے ساتھ ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔“

ناصر الدّین نے اُس کے ساتھ چند قدم چلنے کے بعد رُک کے کہا۔ ”کہیے کیا ارشاد ہے؟“

سعد نے آس پاس جمع ہونے والے سپاہیوں کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”یہاں نہیں۔ یہاں بہت سے لوگ ہیں۔“

ناصر الدّین نے کہا۔ ”بہت اچھّا۔ جہاں چاہو چلے چلو۔“

قلعے کے دروازے سے کوئی پانچ سو قدم دور جا کے سعد نے ایک پتھّر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”آپ بھی بیٹھ جائیں۔“

ناصر الدّین اُس کے سامنے دوسرے پتھّر پر بیٹھ گیا۔

سعد نے کہا۔ ”پہلے آپ یہ وعدہ کریں کہ آپ میری بات سُن کر میرا سر پھوڑنے کے لیے تیّار نہیں ہو جائیں گے؟“

ناصر الدّین نے جواب دیا۔ ”اگر کوئی سر پھوڑنے والی بات ہوئی تو ضرور پھوڑوں گا۔“

سعد نے کُچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”بات تو ایسی کوئی نہیں لیکن پرائے ہاتھوں کا کیا اعتبار۔ اچھّا میں کہہ ہی دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ مایا نہیں نہیں!! زہرا آپ کی بہن ہے اور میرے لیے بھی وہ بیٹی سے کم نہیں۔ خالد بھی مُجھے بہت عزیز ہے بالکل اپنے بیٹے کی طرح اور اِس سے آگے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کہوں؟ مُجھے ڈر ہے کہ آپ خفا ہو جائیں گے!“

ناصر الدّین نے کہا۔ ”میں سمجھ گیا۔ تُم یہ کہنا چاہتے ہو کہ خالد اور زہرا کی شادی کر دی جائے!“

”ہاں ہاں!! خدا تمہارا بھلا کرے۔ میں ہی کہنا چاہتا تھا؟ و میں اسی بات کے لیے مجھے یہاں تک گھسیٹ لائے ہو؟“

سعد نے جواب دیا۔ ”مجھے یہ خیال تھا کہ اگر آپ بِگڑ کر میری داڑھی نوچنے پر آمادہ ہو جائیں تو دوسرے ہمارا تماشا نہ دیکھیں۔“

ناصر الدّین نے جواب دیا۔ ”میں حیران ہوں کہ مجھے آپ نے اِس قدر بُرا خیال کیا۔ مجھے گنگو سے نفرت تھی لیکن سعد کی میرے دِل میں وہی عزّت ہے جو ایک راجپوت کے دِل میں اپنے باپ کے لیے ہونی چاہیے۔ آپ جس وقت چاہیں اِن کی شادی کر سکتے ہیں۔“

سعد نے کہا۔ ”میں تو چاہتا ہوں کہ ابھی ہو جائے لیکن زہرا زخمی ہے۔“

سعد نے چونک کر سوال کیا۔ ”زہرا زخمی ہے؟ مجھے کسی نے کیوں نہیں بتایا۔ چلو چلیں۔“

”اُس کے زخم بالکل معمولی ہیں؟“ ناصر الدّین نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔“

سب کا محُسن

آدھی رات تک محمدؐ بن قاسم کے تھکے ہارے سپاہی زخمیوں کی مرہم پٹّی اور شہیدوں کی تجہیز و تکفین میں مصروف رہے۔ میدان میں چاروں طرف سے دُشمن کے زخمی سپاہیوں کی چیخ اور پکار سُنائی دے رہی تھی۔ شہیدوں کی نمازِ جنازہ پڑھانے کے بعد مسلمانوں کی فوج کا سترہ سالہ سپہ سالار جس کا جسم بے آرامی کی کئی راتیں کاٹنے کے بعد تھکاوٹ سے چور ہو چکا تھا، جس کے بازو دِن بھر تلواروں اور نیزوں سے کھیلنے کے بعد شل ہو چُکے تھے، اپنی پیٹھ پر پانی کا مشکیزہ اٹھائے زخموں سے کراہتے ہوئے دُشمنوں کی پیاس بجھا رہا تھا۔ وہ آنکھیں جن میں اُس کے ساتھیوں نے

لڑائی کے وقت قہر و غضب کی آگ کے شعلے دیکھے تھے، اب گر کر تڑپنے والے دُشمن کے لیے عفو اور رحم کے آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ وہ ہاتھ جس کی تلوار دُشمنوں کے سر پر بجلی بن کر کوندی تھی، اب اُن کے زخموں پر مرہم رکھ رہا تھا۔

محمدؐ بن قاسم کے سپاہی بھی تھکاوٹ سے چُور تھے لیکن وہ اپنے بالکل نوجوان سالار کی تقلید میں ایک روحانی لذّت محسوس کر رہے تھے۔ اُنھوں نے دُشمن کے زخمیوں کو اُٹھا اُٹھا کر قلعے کے سامنے قطار در قطار لِٹا دیا۔

محمدؐ بن قاسم کو ایک پہاڑی کے دامن سے کسی کے کراہنے کی آواز آئی اور وہ مشعل اُٹھائے اُس طرف بڑھا۔ سعید، زبیر، سعد، ناصر الدّین اور چند اور سالار اُس کے ساتھ تھے۔ مشعل کی روشنی میں چند لاشوں کے درمیان اُسے ایک زرہ پوش نوجوان دکھائی دیا۔ اُس کی زرہ میں کئی جگہوں پر خون کے نشان تھے اور پسلی میں ایک تیر پیوست تھا۔ اُس کے دائیں ہاتھ سے تلوار کا دستہ چھوٹ چکا تھا لیکن بائیں ہاتھ میں وہ ابھی تک

مضبوطی کے ساتھ سندھ کا جھنڈا تھامے ہوئے تھا۔ محمدؐ بن قاسم نے مشعل اپنے ایک ساتھی کے ہاتھ میں تھما دی اور زمین پر گھٹنا ٹیکتے ہوئے اُسے اُٹھنے کا سہارا دے کر پانی پلایا۔ چند گھونٹ پینے کے بعد نوجوان نے آنکھیں کھولیں اور محمدؐ بن قاسم اور اُس کے ساتھیوں کو غور سے دیکھنے کے بعد جھنڈے کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ لیا۔

ناصر الدّین نے زبیر نے کہا۔ "زبیر تُم نے اِسے پہچانا نہیں؟" زبیر نے آگے بڑھ کر زخمی نوجوان کی طرف دیکھا اور کہا۔ "اُف! یہ بھیم سنگھ ہے؟"

بھیم سنگھ نے آنکھیں کھولیں اور اپنے چہرے پر ایک دردناک مُسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ "تمہیں فتح مبارک ہو؟"

محمدؐ بن قاسم کے استفسار پر زبیر نے بھیم سنگھ کے الفاظ کا عربی میں ترجمہ کیا اور اُس نے کہا۔ "میں حیران ہوں کہ ایسے بہادر سپہ سالار کی موجودگی میں سندھ کی فوج میدان چھوڑ کر بھاگ گئی ہے۔ زبیر! تُم اِسے سہارا دو۔ میں اِس کا تیر نکالتا ہوں۔"

زبیر نے آگے بڑھ کر بھیم سنگھ کو سہارا دیا۔ محمدّ بن قاسم نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بھیم سنگھ نے جھنڈا چھوڑ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

محمدّ بن قاسم نے ناصر الدّین کو اشارہ کیا اور اُس نے بھیم سنگھ کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ محمدّ بن قاسم نے تیر نکال کر ایک طرف پھینک دیا اور ناصر الدّین کو فوراً دروازہ کھول ڈالنے کے لیے کہا۔

بھیم سنگھ کے زخم زیادہ گہرے نہ تھے لیکن خُون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے وہ نڈِھال ہو چکا تھا۔ محمدّ بن قاسم نے اُس کی مرہم پٹّی سے فارغ ہو کر سپاہیوں کو حکم دیا کہ اُسے قلعے کے اندر لے جائیں اور خود دوسرے زخمیوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گیا۔

(۲)

زہرا نے اپنے زخموں کو زیادہ اہمیت نہ دی وہ حسبِ معمول علی الصبح اُٹھ کر ناہید کے ساتھ صُبح کی نماز کے لیے کھڑی ہو گئی۔ نماز ادا کرنے کے بعد زہرا نے اپنے بستر پر لیٹتے ہوئے کہا۔ ”ناہید! کاش میں زیادہ زخمی ہوتی اور

تمہاری تیمار داری کا لُطف اُٹھاتی۔"

ناہید نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "تم میری تیمار داری کا تصوّر کر رہی ہو یا خالد کی تیمار داری کا؟"

زہرا کے گالوں پر تھوڑی دیر کے لیے حیا کی سُرخی چھا گئی۔ دروازے پر ناصر الدّین نے دستک دیتے ہوئے کہا۔ "میں اندر آسکتا ہوں؟"

ناہید نے اُٹھ کر دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے کہا۔ "لو اب اُٹھ جاؤ ورنہ۔۔۔!"

"ورنہ کیا ہوگا؟"

ناہید نے کہا۔ "ورنہ تمہاری شادی شاید دیبل کی فتح تک ملتوی ہو جائے!"

زہرا کا دِل دھڑکنے لگا۔ اُس نے اُٹھ کر ناہید کا دامن پکڑ لیا اور کہا۔ "ناہید! آپا ناہید! سچ کہو یہ کیا معاملہ ہے؟"

ناہید نے اپنا دامن چھڑاتے ہوئے کہا۔ "بھئی تمہارا بھائی باہر کھڑا ہے۔

مجھے چھوڑ دو!“

”نہیں! جب تک تُم مُجھ سے صاف صاف نہ کہو گی میں نہیں چھوڑوں گی۔“

”بھیّا ذرا ٹھہرنا! میں آپا ناہید سے ایک بات کر رہی ہوں۔ ہاں! بتاؤ؟“

ناہید نے کہا۔ ”اچھّا بتاتی ہوں، سُنو! رات کے وقت سعد نے میدان سے آتے ہی تمہارے متعلّق پوچھا اور میں نے تمام واقعات بتا دیے اور تمہارے دِل کی حالت پہلے بھی اُس نے پوشیدہ نہ تھی۔ تمہیں یاد ہے جب ہم قلعے میں داخل ہو رہے تھے۔ وہ تمہارے بھائی کو پکڑ کر ایک طرف لے گیا تھا۔۔۔؟“

”تو اس نے بھائی سے کیا کہا ہو گا؟“

”یہی کہ خالد کے ساتھ تمہاری شادی کر دی جائے؟“

”آپا سچ کہو! تُم مذاق کر رہی ہو!“

”پگلی میں مذاق نہیں کرتی۔ تمہارا بھائی ابھی میری باتوں کی تصدیق کر دے گا۔“

زہرا کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک رہے تھے۔ ناہید نے کہا۔

”ہائیں تم رو رہی ہو۔ کیا تمہیں میرا بھائی پسند نہیں؟ “

اس نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”نہیں!“

”تو میں خود تمہارے بھائی سے کہہ دیتی ہوں کہ وہ تمہیں شادی کے لیے مجبور نہ کرے۔ کہوں اُس سے؟“ یہ کہتے ہوئے ناہید ایک شرارت آمیز تبسّم کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھی لیکن زہرا آگے بڑھ کر اُس کے ساتھ لپٹ گئی۔

”میری بہن! میری آپا!!“ اُس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ناہید نے کہا۔ ”تو تم خالد کے ساتھ شادی کرنے پر رضامند ہو۔“

زہرا نے اُس کی طرف دیکھا، مُسکرائی اور اُسے دوسرے کمرے کی طرف دھکیلتے ہوئے بولی۔ ”جاؤ، تُم بہت شریر ہو!“

ناصر الدّین نے باہر سے آواز دی۔ ”زہرا! تمہاری باتیں کب ختم ہوں گی؟ “

اُس نے بستر پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ ”آ جاؤ بھیّا۔ بہن ناہید دوسرے کمرے میں چلی گئی ہے۔“

(۳)

ناصر الدّین نے اندر پاؤں رکھتے ہی پوچھا۔ ”تمہارے زخموں کا اب کیا حال ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”بھیّا! وہ معمولی خراشیں تھیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔“ ناصر الدّین اُس کے قریب چارپائی پر بیٹھ گیا۔ زہرا کا دِل دھڑک رہا تھا۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد ناصر الدّین نے کہا۔ ”زہرا! خالد ایک بہادر نوجوان ہے۔ میرا ارادہ ہے تمہاری شادی اُس کے ساتھ کر دی جائے۔ تمہیں یہ رشتہ پسند ہے؟“

زہرا نے جواب دینے کی بجائے دونوں ہاتھوں میں اپنا مُنہ چھُپا لیا۔

ناصر الدّین نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "میرا ارادہ تھا کہ سندھ فتح ہونے کے بعد تمہاری شادی دھوم دھام سے ہو لیکن مسلمان ایسی رسومات کو بُرا سمجھتے ہیں۔ اِس کے علاوہ اہلِ سندھ کے ساتھ ابھی فیصلہ کُن جنگ ہونے والی ہے۔ سپاہی کو اپنی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہیں اپنے ہاتھوں سے خالد کو سونپ دوں۔ ناہید تمہیں بہت چاہتی ہے۔ وہ تمہارا خیال رکھے گی اور میں زیادہ اطمینان کے ساتھ اسلام کی خدمت کر سکوں گا۔ زہرا! اِس بے سروسامانی میں میرے پاس تمہارے لیے نیک دعاؤں کے سوا کُچھ نہیں۔ اگر میرے پاس ساری دُنیا کی دولت ہوتی تو میں تُم پر وہ بھی نچھاور کر دیتا!"

"بھیّا بھیّا!" اس نے آگے جھک کہ ناصر الدّین کی گود میں سر رکھ دیا اور ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "مُجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں!"

اس نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "زہرا! میرا ارادہ ہے کہ آج ہی تمہاری شادی کر دوں۔ فوج دو چار دِن اور یہاں ٹھہرے گی لیکن یہ بھی مُمکن ہے کہ اچانک دیبل سے راجہ کی فوج کی پیش قدمی کی

اطلاع آ جائے اور ہمیں فوراً کوچ کرنا پڑے۔ سعد محمدؐ بن قاسم سے ذکر کر چکا ہے اور وہ بہت خوش ہیں۔ سعد خالد سے بھی پوچھ چکا ہے اور بہن ناہید کو بھی مبارکباد دو۔ سالارِ اعظم خود اُس کے بھائی کو بُلا کر اس کی رضامندی حاصل کر چکے ہیں۔ وہ خود تم دونوں کا نکاح پڑھانا چاہتے ہیں؟“

باہر سے سعد نے ناصر الدّین کو آواز دی اور وہ اُٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔ زہرا نے اُٹھ کر برابر والے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”ناہید! ناہید!! تُم نے سُنا، آج تمہاری شادی ہے؟“

”میری شادی؟“ ناہید کے چہرے پر حیا اور مسرّت کی سُرخ و سفید لہریں دوڑنے لگیں۔

”ہاں ناہید! تمہاری شادی۔ اب بتاؤ تمہیں زبیر بھیّا پسند ہیں یا نہیں؟ اور میں ابھی اُنہیں بُلا کر کہتی ہوں کہ وہ اپنے لیے کوئی اور لڑکی تلاش کریں!“ ناہید نے کہا۔ ”تم بہت شریر ہو زہرا!“

خالد نے برآمدے سے برابر کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے ناہید کو آواز دی اور زہرا نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ناہید جلدی جاؤ! ورنہ تمہاری شادی سندھ کی فتح تک ملتوی ہو جائے گی۔ میں مذاق نہیں کرتی تمہارا بھائی ابھی میری باتوں کی تصدیق کر دے گا!“

ناہید زہرا کو محبّت بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی دوسرے کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس کا دِل خوشی کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔ اُس کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔

(۴)

شام کے وقت لشکر کے تمام سالار قلعے کے ایک وسیع کمرے میں جمع ہو کر زہرا اور خالد کو اُن کی شادی پر مبارک باد دے رہے تھے۔ ناہید اور زہرا اپنے کمرے میں بیٹھی آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ ناہید نے کہا۔ ”زہرا! نکاح کے وقت تمہاری زبان گنگ کیوں ہو گئی تھی؟“

”ناہید! مُجھے معلوم نہیں، تُم جانتی ہو، مُجھے یہ اُمّید نہ تھی کہ یہ تمام باتیں

اِس قدر جلدی ہو جائیں گی۔ میرے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ مُجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں کہاں ہوں اور پھر اگر نکاح پڑھانے والا محمدؐ بن قاسم کی بجائے کوئی اور ہوتا تو میں شاید اِس قدر بد حواس نہ ہوتی۔ اُس کے چہرے پر کتنا جلال تھا اور اُس کی آواز کس قدر رُعب دار تھی۔ سچ کہتی ہوں، وہ انسان نہیں دیوتا ہے، اور ہمیں دیوتاؤں سے ڈرنا سکھایا گیا ہے۔ ناہید! اگر تُم میرے پاس نہ ہوتیں تو شاید میری زبان بالکل نہ کھُلتی۔ اُنہوں نے پوچھا۔ تمہیں خالد قبول ہے؟ اور میں شرم سے پانی پانی ہوگئی۔ ناہید مُجھے ابھی تک یقین نہیں آتا کہ تمہارے بھائی کے ساتھ میری شادی ہو چکی ہے۔ کبھی کبھی مُجھے خیال آتا ہے کہ میں ایک خواب دیکھ رہی ہوں۔ کیا تمہیں اپنی شادی ایک خواب معلوم نہیں ہوتی؟“

ناہید مُسکرائی اور زہرا اُس کے گلے میں باہیں ڈال کر اس سے لپٹ گئی۔ ناہید اس کے سیاہ اور خوبصورت بالوں سے کھیلنے لگی۔ اچانک اُس کے دِل میں ایک خیال آیا اور اس نے اپنے گلے سے موتیوں کا ہار اُتار کر زہرا کے گلے میں ڈال دیا۔

زہرا نے کہا۔ ”نہیں! نہیں! یہ تمہیں اچھّا لگتا ہے!“

ناہید نے جواب دیا۔ ”میرے پاس دوسرا ہے۔ مُجھے خالد دے گیا ہے۔“

یہ کہتے ہوئے اپنی ہیرے کی انگوٹھی اُتاری اور زہرا کے احتجاج کے باوجود اُس کی اُنگلی میں پہنادی۔ ”دیکھو! اگر تمہیں میری خوشی منظور ہے تو اِسے مت اُتارو۔“ زہرا مغموم سی ہو کر ناہید کی طرف دیکھنے لگی۔ ناہید نے کہا۔ ”زہرا تُم مغموم کیوں ہو گئیں؟ مُجھے زیور اچھّے نہیں لگتے اور تمہارے ملک میں زیور پہننے کا رواج ہے۔“

زہرا نے کہا۔ ”لیکن ہمارے ملک میں بھابی نند سے لیتی نہیں۔ اُسے دیتی ہے، اور میں گھر سے اتنی دُور۔۔۔۔۔“

ناہید نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”پگلی! بھابھی تُم آج بنی ہو۔ اس سے پہلے ایک عرصہ سے تُم میری ننّھی بہن تھیں۔“

زہرا نے کہا۔ ”ناہید! سندھ کی فتح کے بعد بھائی جان کا ارادہ ہے کہ وہ کاٹھیاواڑ جا کر اسلام کی تبلیغ کریں۔ میرا بھی ارادہ ہے کہ میں چند دِن کے

لیے وہاں جاؤں۔ کاش! تم بھی ہمارے ساتھ چل سکو۔ ہمارا گھر سمندر کے کنارے ایک چھوٹے سے قلعے میں ہے۔ اس کے تین طرف آموں کے وسیع باغات ہیں۔ بیچ میں سے ایک ندی گزرتی ہے۔ میں اس ندی کے کنارے آم کے ایک درخت پر جھولا جھولا کرتی تھی۔ برسات کے دنوں میں اس ندی کا پانی بہت تیز بہتا تھا اور میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ اس میں نہایا کرتی تھی۔ بارش میں ہم آم توڑ کر کھایا کرتیں۔ شہد کی طرح میٹھے آم۔ باغ سے پرے ایک خوبصورت جھیل تھی۔ ہم پانی میں کود کر آنکھ مچولی کھیلتیں اور کنول کے پھول توڑ کر ایک دوسری پر پھینکتیں۔ ناہید! میں تمہیں وہاں ضرور لے چلوں گی۔"

ناہید نے جواب دیا۔ "خدا ہمیں فتح دے ممکن ہے کہ سندھ کے بعد ہماری افواج تمہارے شہر کا رخ کریں؟"

زہرا نے کہا۔ "خدا وہ دن جلد لائے اور میں اپنے ہاتھوں سے اس قلعہ پر اسلام کا پرچم لہراؤں۔ ناہید میں حیران ہوں کہ میرے خیالات میں اتنا بڑا تغیر کیوں کہ آ گیا۔ مجھے اچھُوتوں سے سخت نفرت تھی۔ ایک دن میں

اپنی سہیلیوں کے ساتھ جھیل پر گئی۔ وہاں ایک اچھوت لڑکا نہا رہا تھا۔ ہم نے اسے پتھر مار مار کر بے ہوش کر دیا اور ایک دن ایک نیچ ذات مسافر ہمارے باغ کے پاس سے گزرنے لگا۔ اُس نے نیچے گرے ہوئے چند آم اٹھائے اور ہمارے نوکروں نے اُسے آٹھ پہر تک ایک درخت کے ساتھ باندھے رکھا۔ میں کئی دفعہ وہاں سے گزری اور تم حیران ہو گی کہ اُسے بھوکا اور پیاسا دیکھ کر مجھے ذرا بھی رحم نہیں آیا۔ اب اگر میں وہاں گئی تو آس پاس کی بستیوں کے تمام اچھوتوں کو دعوت دوں گی کہ آؤ ہمارے باغ کے آم کھاؤ اور ہمارے کنوئیں کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی پیو! ان کی سب سے بڑی حسرت ہمارے مندروں میں آکر ہمارے دیوتاؤں کی پوجا کرنی تھی اور میں اُنہیں یہ پیغام دوں گی کہ مسلمان اِس مُلک میں وہ عبادت گاہیں تعمیر کرنے کے لیے آئے ہیں جن میں ایک اچھوت برہمن کے ساتھ بلکہ اُس سے بھی آگے کھڑا ہو سکتا ہے!“

ناہید نے کہا۔ ”خُدا تمہاری خواہش پوری کرے!“

(۵)

قلعے کو تمام فوج کی ضرورت کے لیے تنگ دیکھ کر محمّد بن قاسم نے قلعے سے باہر خیمے نصب کروا دیے۔ اپنی فوج کے زخمیوں کی طرح اُس نے بھیم سنگھ کے فوج کے زخمی سپاہیوں کو بھی خیموں میں جگہ دی اور اپنی فوج کے طبیبوں اور جرّاحوں کو حکم دیا کہ دُشمن کی فوج کے زخمیوں کے علاج میں کوئی کوتاہی نہ کریں۔ محمّد بن قاسم خود بھی علمِ جرّاحی اور طبابت میں خاصی دسترس رکھتا تھا۔ وہ صُبح شام زخمیوں کے خیموں میں چکّر لگاتا اور فرداً فرداً سب کا حال پوچھتا اور اُنھیں تسلّی دیتا۔ دُشمن کے زخمیوں سے تبادلۂ خیالات کے لیے وہ سعد کو اپنا ترجمان بنا کر ساتھ لیے پھرتا۔ اُنھیں ملول و مغموم دیکھ کر وہ کہتا۔ ''تم بہت جلد اچھّے ہو جاؤ گے۔ یہ مت سمجھو کہ تُم ہماری قید میں ہو۔ تندرست ہونے کے بعد تم جہاں چاہو جا سکتے ہو۔''

وہ اُس کی طرف احسان مندانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہتے۔ ''بھگوان کے لیے آپ ہمیں شرمسار نہ کریں۔ ہمیں آپ کو اِس قدر تکلیف دینے

کا حق نہیں، آپ آرام کریں!“

وہ جواب دیتا۔ ”نہیں، یہ میرا فرض ہے۔“

بھیم سنگھ کے ساتھ محمدّ بن قاسم کو گہری دلچسپی تھی۔ وہ دونوں وقت خود اس کے زخموں دیکھتا اور اپنے ہاتھوں سے مرہم پٹّی کرتا۔ ناصر الدّین اور زبیر ہر طریقے سے اُس کی دلجوئی کرتے۔ بھیم سنگھ نے ابتدا میں سمجھا کہ یہ سلوک اس کے اور ساتھیوں کو ورغلانے کے لیے مسلمانوں کی ایک چال ہے۔ لیکن تین چار دِن کے بعد وہ محسوس کرنے لگا کہ یہ تصنّع اور بناوٹ نہیں بلکہ محمدّ بن قاسم اور اُس کے ساتھی فطرتاً عام انسانوں سے مختلف ہیں!

اُس کے زخم زیادہ خطرناک نہ تھے لیکن بہت سا خُون بہہ جانے کی وجہ سے اُس کے جسم میں نقّاہت آچکی تھی۔ محمدّ بن قاسم کے علاج اور زبیر اور ناصر الدّین کی تیمار داری کی بدولت وہ چوتھے دِن چلنے پھِرنے کے قابل ہو گیا۔ پانچویں دِن حسبِ معمول نمازِ عشاء کے بعد محمدّ بن قاسم سعد کے ساتھ زخمیوں کے خیموں کا چکّر لگاتے ہوئے بھیم سنگھ کے خیمے

میں داخل ہوا۔ وہ اپنے بستر پر لیٹا خواب کی حالت میں بڑبڑا رہا تھا۔ ”نہیں نہیں، مجھے دوبارہ اُس کے مُقابلے پر نہ بھیجیئے! وہ انسان نہیں دیوتا ہے۔ آپ قیدیوں کو چھوڑ دیجیے۔ وہ آپ کی خطا معاف کر دے گا۔ نہیں نہیں۔۔۔ میں نہیں جاؤں گا۔ راجہ کے پاپ کی سزا پرجا کو کیوں ملے۔ مجھے موت کا ڈر نہیں لیکن میری جان لے کر تُم آنے والی مُصیبت کو نہیں ٹال سکتے۔ ظالم بُزدل اُف! بھگوان۔۔۔۔۔!“

بھیم سنگھ نے کپکپا کر آنکھیں کھول دیں اور حیرت زدہ ہو کر سعد اور محمدؒ بن قاسم کی طرف دیکھنے لگا۔ محمدؒ بن قاسم نے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ تُم کوئی بھیانک خواب دیکھ رہے تھے۔“

بھیم سنگھ سوچ میں پڑ گیا۔ اُس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے یہ ظاہر کرتے تھے کہ خواب کی حالت میں وہ سخت ذہنی کشمکش میں مُبتلا تھا۔“ محمدؒ بن قاسم نے آگے بڑھ کر اُس کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ زخم میں تکلیف تو نہیں؟“

اُس نے اپنے ہونٹوں پر مغموم مُسکراہٹ لاتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں!"

محمدؐ بن قاسم نے کہا۔ "میری فوج کل صُبح یہاں سے کُوچ کرنے والی ہے۔ مُجھے افسوس ہے کہ بعض مصلحتیں مُجھے یہاں زیادہ دیر قیام کرنے کی اجازت نہیں دیتیں۔ ورنہ میں چند دِن اور تمہاری تیمار داری کرتا۔ بہر صورت میں پانچ سو سپاہی اِس قلعے میں چھوڑ کر جا رہا ہوں وہ تُم لوگوں کا خیال رکھیں گے۔ تمہاری فوج کے جو زخمی تندرست ہو چکے ہیں اُنہیں کل اپنے گھروں کو جانے کی اجازت ہو گی۔ تُم جب تک گھوڑے کی سواری کے قابل نہیں ہوتے ہیں ٹھہرو!"

بھیم سنگھ نے کہا۔ "آپ کا مطلب ہے کہ آپ تمام قیدیوں کو رہا کر دیں گے؟"

محمدؐ بن قاسم نے جواب دیا۔ "ہمارا مقصد لوگوں کو قیدی بنانا نہیں بلکہ ہم اُنہیں ایک ظالم حکومت سے نجات دِلا کر ایک ایسے نظام سے آشنا کرنا چاہتے ہیں، جس کا بنیادی اصول مساوات ہے۔ آپ کے سپاہی ہمیں غیر مُلکی حملہ آور سمجھ کر ہمارے مُقابلے میں آئے تھے لیکن اُنہیں معلوم نہ تھا

کہ ہماری جنگ وطن کے نام پر نہیں۔ قوم کے نام پر نہیں۔ ہم سندھ پر عرب کی برتری نہیں چاہتے۔ ہم روئے زمین کے تمام انسانوں کی بہتری کے لیے ایک عالم گیر انقلاب چاہتے ہیں۔ ایک انقلاب جو مظلوم کا سر اُونچا رکھنے کے لیے ظالم کی لاٹھی چھین لینا چاہتا ہے۔ ہماری جنگ راجوں مہاراجوں کی جنگ نہیں۔ انسانوں اور بادشاہوں کی جنگ ہے۔ ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم سندھ کے راجہ کا تاج اُتار کر اپنے سر پر رکھ لیں۔ ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ کوئی شخص تاج و تخت کا مالک ہو کر دُنیا پر اپنا قانون نافذ کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ تاج و تخت خود غرض انسانوں کے تراشے ہوئے بُت ہیں اور وہ قانون جو صرف اُن بُتوں کی عظمت کو برقرار رکھنے کے لیے بنایا گیا ہو، انسانوں کو ہمیشہ دو جماعتوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک ظالم، دوسری مظلوم۔ تُم اِن جماعتوں کے لیے راجہ اور پرجا کے الفاظ استعمال کرتے ہو۔ سندھ کے راجہ نے ہمارے جہاز لُوٹ کر عورتوں اور بچّوں کو اِس لیے قیدی بنایا کہ وہ تاج و تخت کا مالک ہوتے ہوئے ہر انسان پر ظُلم کرنا اپنا حق سمجھتا ہے اور اب وہ ہمارا مُقابلہ اِس لیے کرے گا کہ اُسے ظُلم کی تلوار چھِن جانے کا خطرہ ہے اور یہ سپاہی ہمارے مُقابلے

میں اِس لیے آئے ہیں کہ اُنہیں ظُلم کی اعانت کا معاوضہ ملتا ہے۔ اِن بے چاروں سے وہی کام لیا گیا ہے جو انسان سواری کے جانوروں سے لیتے ہیں، یہ مجبور تھے۔ ایک استبدادی نظام کی وجہ سے اِن کے لیے زندگی کی راہیں تنگ تھیں اور یہ معمولی معاوضہ لے کر ظُلم کی اعانت کے لیے اپنی جانیں تک پیش ڈالنے کے لیے تیّار تھے۔ اُنہیں معلوم نہ تھا کہ جس انقلاب کی راہ میں یہ رکاوٹ بننا چاہتے ہیں، وہ اُن کی بہتری کے لیے ہے۔ اُنہیں ہماری طرف سے خوفزدہ کیا گیا تھا۔ اب فتح کے بعد میں نہ خود ظالم بننا چاہتا ہوں، نہ اُنہیں مظلوم بنانا چاہتا ہوں!"

بھیم سنگھ نے کہا۔ "تو آپ کو یہ یقین ہے کہ یہ لوگ واپس جا کر راجہ کی فوجوں میں دوبارہ شامل نہیں ہو جائیں گے؟"

محمدؐ بن قاسم نے جواب دیا۔ "میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ واپس جا کر اِن کا طرزِ عمل کیا ہو گا لیکن مُجھے اِن لوگوں سے کوئی خدشہ نہیں۔ مُجھے خُدا کی رحمت پر بھروسہ ہے۔ کسی بُلند مقصد کے لیے لڑنے والوں کی قوّت بڑھتی ہے، کم نہیں ہوتی۔ اِس سے پہلے کئی اقوام اپنے بادشاہوں کی

حمایت میں ہمارے ساتھ لڑ چکی ہیں لیکن جب اُنہیں یہ احساس ہوا کہ ہمارے پاس ایک بہتر نظام ہے، تو وہ ہمارے ساتھ مل گئیں۔ آپ کے سپاہیوں میں سے وہ لوگ جنہیں خُدا نے حق و باطل میں تمیز کی توفیق دی ہے، وہ یقیناً واپس جا کر ظُلم کی ناؤ کو ڈوبنے سے بچانے کی کوشش نہیں کریں اور جو دوبارہ ہمارے مُقابلے پر آنے کی جرأت کریں گے، اُنہیں ایک دو اور معرکوں کے بعد اطمینان ہو جائے گا کہ ہماری تلواریں کُند ہونے والی نہیں!"

بھیم سنگھ نے کہا۔ "آپ تاج و تخت کے دُشمن ہیں اور آپ انسان پر انسان کی حکومت کے قائل نہیں لیکن جب تک کوئی حکومت نہ ہو مُلک میں امن کیسے رہ سکتا ہے؟"

محمدؒ بن قاسم نے جواب دیا۔ "اگر استبداد کا ڈنڈا مظلوم کی آواز اُس کے گلے سے نہ نکلنے دے تو اِس کا مطلب یہ نہیں کہ مُلک میں امن قائم ہو گیا۔ میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ ہم دُنیا میں انسان کا قانون نہیں بلکہ خُدا کا قانون چاہتے ہیں۔"

بھیم سنگھ نے جواب دیا۔ ’’قانون خواہ کوئی ہو اُسے نافذ کرنے والا بہر حال کوئی انسان ہو گا اور وہ راجہ اور بادشاہ نہ بھی کہلائے، تو بھی وہ حکمران ضرور ہو گا اور جب تک دُنیا میں سرکش لوگ موجود ہیں۔ ایسے قانون کی حفاظت طاقت کے ڈنڈے کے بغیر مُمکن نہیں۔‘‘

محمدّ بن قاسم نے کہا۔ ’’یہ درست ہے لیکن اِس قانون کا پہلا مطالبہ یہ ہے کہ اُسے نافذ کرنے والی جماعت صالحین کی جماعت ہو۔ جب تک ہم صالحین کی جماعت سے تعلّق رکھیں گے، خُدا اپنے قانون کی حفاظت کا کام ہم سے لے گا۔ کل اگر تمہارے ملک سے کوئی قوم صالحین کی جماعت بن جاتے تو اِس قانون کے نفاذ کی ذمّہ داری وہ سنبھال لے گی لیکن طاقت کا ڈنڈا اُسے اپنے اقتدار کی حفاظت کے لیے نہیں بلکہ اُس قانون کی حفاظت کے لیے استعمال کرنے کی اجازت ہو گی۔ مسلمانوں کے امیر اور دوسری اقوام کے بادشاہوں میں یہ فرق ہے کہ وہ طاقت کا ڈنڈا ظالم کے خلاف مظلوم کی اعانت کے لیے کام میں لاتے ہیں اور بادشاہ اُسے فقط اپنے دائمی تسلط کے لیے استعمال کرتے ہیں۔‘‘

بھیم سنگھ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد سوال کیا۔ ”تو کیا مجھے بھی ان لوگوں کے ساتھ واپس جانے کی اجازت ہو گی؟“

”میں شاید پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ تم تندرست ہونے کے بعد جب چاہو جاسکتے ہو۔“

بھیم سنگھ نے کہا۔ ”میں سفر کے قابل ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو کل ہی روانہ ہو جاؤں!“

”ابھی تمہارے زخم ٹھیک نہیں ہوئے لیکن اگر تم کل ہی جانا چاہو تو میں تمہیں نہیں روکوں گا۔“

بھیم سنگھ پھر تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولا۔ ”لیکن آپ کو شاید معلوم نہ ہو۔ میں سندھ کے سیناپتی کا لڑکا ہوں اور میرا واپس جا کر فوج کے ساتھ شامل ہو جانا آپ کے لئے خطرناک ہو سکتا ہے۔ اِس لیے اگر آپ مجھے چھوڑنے سے پہلے مجھ سے یہ وعدہ لینا چاہتے ہیں کہ میں دوبارہ آپ کے مقابلے پر نہ آؤں تو میں اِس شرط پر جانے کے لیے تیّار نہیں۔“

"میں نے تمھیں ایسا وعدہ کرنے کے لیے نہیں کہا۔ ہاں میں تُم سے فقط ایک بات کہوں گا، تُم راجہ داہر کو میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ اب اَروَر ہم سے دُور نہیں۔ اگر اس نے عرب قیدیوں کے ساتھ بُرا سلوک کیا تو اس کے لیے اچھّا نہ ہو گا۔"

بھیم سنگھ نے جواب دیا۔ "میں یہ وعدہ کرتا ہوں اور مُجھے اُمّید ہے کہ جب اُسے میرے زخمی سپاہیوں کے ساتھ آپ کے سلوک کا پتہ چلے گا تو وہ یقیناً متاثر ہو گا؟"

"میں نیکی کا بدلہ نہیں چاہتا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تُم اُس کی آنکھیں سے غرور کی پٹّی اُتار دو اور اُسے یہ بھی بتا دو کہ وہ آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر کھڑا ہے۔ اِس گفتگو کے دوران میں مَیں نے شاید کوئی تلخ بات کہہ دی ہو۔ تمھیں کِسی بات سے رنج پہنچا ہو تو مُجھے ایک انسان سمجھ کر درگزر کرنا۔"

محمدّ بن قاسم یہ کہہ کر خیمے سے باہر نکل آیا۔ بھیم سنگھ بار بار اپنے دِل میں یہ کہہ رہا تھا۔ "تُم انسان نہیں دیوتا ہو۔"

صُبح کا ستارہ

چند دِن بعد محمدؐ بن قاسم کی فوج دیبل سے چند میل کے فاصلے پر پڑاؤ ڈال چکی تھی۔ رات کے تیسرے پہر اُس نے اُٹھ کر نماز تہجّد ادا کی اور زبیر کو ساتھ لے کر پڑاؤ کا ایک چکّر لگایا۔ دِن بھر کے تھکے ماندے سپاہی گہری نیند سو رہے تھے۔ پہرے دار اپنی اپنی جگہ پر چوکس کھڑے تھے۔ سمندر کی نمی سے خُنک ہوا میں چند ساعتیں سونے کی وجہ سے محمدؐ بن قاسم اپنے اعضاء میں کسل محسوس کر رہا تھا۔ اس نے زبیر سے کہا۔ ”آؤ زبیر! اِس ٹیلے پر چڑھیں۔ دیکھیں اِس چوٹی پر پہلے کون پہنچتا ہے۔ ہوشیار! ایک۔۔۔۔ دو۔۔۔۔ تین!“

دونوں بھاگتے ہوئے ٹیلے کی چوٹی کے قریب پہنچے۔ محمدّ بن قاسم زبیر سے چند قدم آگے جا چکا تھا لیکن اُوپر سے پہرے دار نے آواز دی۔ ”ٹھہرو! کون ہے؟“

محمدّ بن قاسم نے رُک کر جواب دیا: ”محمدّ بن قاسم!“

پہرے دار نے آواز پہچان کر کہا۔ ”سالارِ اعظم! آپ مطمئن رہیں۔ ہم اپنے فرائض سے غافل نہیں!“ اتنی دیر میں زبیر بھی محمدّ بن قاسم سے آ ملا۔

محمدّ بن قاسم نے سمندر کی تر و تازہ ہوا میں چند سانس لیے اور چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ سولھویں رات کی چاندنی میں ستاروں کی چمک ماند پڑ چکی تھی۔ فضا میں اِدھر اُدھر اُڑنے والے جگنو صُبح کے چراغ نظر آتے تھے۔ چاند کی روشنی نے نیلگوں سمندر کو ایک چمکتا ہوا آئینہ بنا دیا تھا۔ مشرق سے صُبح کا ستارہ نمودار ہوا۔ محمدّ بن قاسم نے زبیر کی طرف دیکھا اور کہا۔

''زبیر! دیکھو یہ ستارہ کس قدر اہم ہے لیکن اِس کی زندگی کتنی مختصر ہے۔ یہ دُنیا کو ہر صُبح آفتاب کی آمد کا پیام دینے کے بعد روپوش ہو جاتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سورج کے چہرے سے تاریکی کا نقاب اُلٹ کر اپنے چہرے پر ڈال لیتا ہے لیکن اِس کے باوجود جو اہمیّت اِسے حاصل ہے وہ دوسرے ستاروں کو حاصل نہیں۔ اگر یہ بھی دوسرے ستاروں کی طرح تمام رات چمکتا تو ہماری نگاہوں میں اِس کا رُتبہ اِس قدر بُلند نہ ہوتا۔ ہم تمام رات آسمان پر کروڑوں ستارے دیکھتے ہیں لیکن یہ ستارا ہمارے لیے اُن سب سے زیادہ جاذبِ توجّہ ہے۔ عام ستاروں کی موت وحیات ہمارے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ بالکل اُن انسانوں کی طرح جو دُنیا میں چند سال ایک بے مقصد زندگی بسر کرنے کے بعد مر جاتے ہیں اور دُنیا کو اپنی موت وحیات کا مفہوم بتانے سے قاصر رہتے ہیں۔ زبیر! مجھے اِس ستارے کی زندگی پر رشک آتا ہے۔ اِس کی زندگی جس قدر مُختصر ہے اُسی قدر اِس کا مقصد بُلند ہے۔ دیکھو! یہ دُنیا کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے کہ میری عارضی زندگی پر اظہارِ تاسف نہ کرو۔ قدرت نے مُجھے سورج کا ایلچی بنا کر بھیجا تھا اور میں اپنا فرض پورا کر کے جا رہا ہوں۔ کاش! میں بھی اِس ملک

میں آفتابِ اسلام کے طلوع ہونے سے پہلے صُبح کے ستارے کا فرض ادا کر سکوں!" زبیر، محمدؐ بن قاسم کی طرف بغور دیکھ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر ایک بچّے کی سی معصومیت، چاند کی سی دِلفریبی، سورج کا سا جاہ و جلال اور صُبح کے ستارے کی سی رعنائی اور پاکیزگی تھی۔

چند قدم کے فاصلے سے ایک پہرے دار نے آواز دی۔ "ٹھہرو کون ہے؟"

نیچے سے جواب آیا۔ "میں سعد ہوں۔"

محمدؐ بن قاسم نے چند قدم آگے بڑھ کر اُسے سندھی لباس میں ٹیلے پر چڑھتے ہوئے دیکھ کر پہرے داروں سے کہا۔ "اِسے میری طرف آنے دو!"

سعد نے ٹیلے پر چڑھ کر پڑاؤ کی طرف اُترنا چاہا لیکن پہرے دار نے اُس کا راستہ روکتے ہوئے محمدؐ بن قاسم کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔ "پہلے اِس طرف جاؤ۔"

سعد نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”نہیں میں سپہ سالار کو دیکھے بغیر کسی سے بات کرنے کے لیے تیّار نہیں۔“

محمدؒ بن قاسم نے آواز دی۔ ”سعد میں اِدھر ہوں!“

سعد نے چونک کر محمدؒ بن قاسم کی طرف دیکھا اور آگے بڑھا۔

محمدؒ بن قاسم نے سوال کیا۔ ”کہو کیا خبر لائے؟“

سعد نے جواب دیا۔ ”دیبل کی حفاظت کرنے والی فوج کی تعداد پچاس ہزار کے قریب ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ سندھ کے باقی شہروں سے مزید کُمک کے انتظار میں قلعہ بند ہو کر لڑنے کی کوشش کریں گے!“

محمدؒ بن قاسم نے کہا۔ ”کیا یہ مُمکن ہے کہ اگر ہم اِس جگہ دو تین دِن قیام کریں تو وہ شہر سے پیش قدمی کر کے ہم پر حملہ کر دیں۔“

سعد نے جواب دیا۔ ”اِس بات کے کوئی آثار نہیں۔ وہ لس بیلا کا پہاڑی قلعہ فتح ہو جانے کے بعد ناہموار زمین پر لڑنا اپنے لیے مُفید خیال نہیں کرتے۔“

محمدؐ بن قاسم نے کہا۔ ”تو ہمیں کسی تاخیر کے بغیر پیش قدمی کر دینی چاہیے۔“

(۲)

دیبل کے محاصرے کو پانچ دِن گُزر چکے تھے۔ اِس دوران میں محمدؐ بن قاسم کی فوج نے دبابوں کی مدد سے متعدّد بار شہر کی فصیل پر چڑھنے کی کوشش کی لیکن اُسے کامیابی نہ ہوئی۔ لکڑی کے دبابے جب شہر پناہ کے قریب پہنچتے، راجہ کے سپاہی اُن پر جلتا ہوا تیل اُنڈیل دیتے اور مسلمانوں کو آگ کے شعلوں میں پیچھے ہٹنا پڑتا۔ محمدؐ بن قاسم اپنے ساتھ ایک بہت بڑی منجنیق لایا تھا جسے پانچ سو آدمی کھینچتے تھے۔ اُس منجنیق کا نام ”عروس“ مشہور ہو چُکا تھا۔ پہاڑی راستے کے نشیب و فراز کا خیال کرتے ہوئے عروس کو سمندر کے راستے دبیل کے قریب لا کر خُشکی پر اُتارا گیا اور محاصرے کے پانچویں دِن محمدؐ بن قاسم کے سپاہی اُسے دھکیل کر شہر پناہ کے سامنے لے آئے۔ اِس سے قبل چھوٹی چھوٹی منجنیقیں شہر کی فصیل کو چند مقامات سے کمزور کر چُکی تھیں۔ شہر کے سپاہی عروس کی غیر معمولی

جسامت سے اُس کی اہمیّت کا اندازہ لگا چکے تھے۔ شام سے پہلے عروس سے چند وزنی پتھّر شہر میں پھینکے گئے اور راجہ نے محسوس کیا کہ دیبل کی مضبوط فصیل زیادہ عرصہ اِس میں ہتھیار کے سامنے نہ ٹھہر سکے گی۔

چھٹے روز علی الصبح محمدّ بن قاسم نے عروس کی مدد سے شہر پر سنگ باری شروع کی۔ شہر کے درمیان ایک مندر کے بُلند کلس پر ایک سُرخ رنگ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ مندر کے کلس کی طرح یہ جھنڈا بھی تمام جھنڈوں سے اونچا تھا۔ محمدّ بن قاسم کو اِس جھنڈے کی اہمیت کا احساس ہوا اور ایک روایت کے مطابق دیبل کے گورنر کے ہاتھوں ستائے ہوئے ایک برہمن نے شہر سے فرار ہو کر محمدّ بن قاسم کو اطلاع دی کہ جب تک یہ جھنڈا نہیں گرتا، شہر کے لوگ ہمّت نہیں ہاریں گے۔

محمدّ بن قاسم کو منجنیق کے استعمال میں غیر معمولی مہارت تھی۔ چنانچہ اُس نے عروس کا رُخ درست کر کے سپاہیوں کو پتھّر پھینکنے کا حکم دیا۔ بھاری پتھّر کی ضرب نے کلس کے ٹکرے اُڑا دیے اور اُس کے ساتھ سُرخ جھنڈا بھی نیچے آرہا۔

اس کلس کے مسمار ہونے اور جھنڈے کے گرنے سے راجہ کے توہم پرست سپاہیوں کے حوصلے ٹوٹ گئے۔ تاہم اُنہوں نے شام تک مسلمانوں کی فوج کو قلعے کے قریب نہ پھٹکنے دیا۔ شام کے دُھندلکے میں فصیل کے تیر اندازوں کی مدافعت کمزور ہونے لگی۔ محمدؐ بن قاسم نے ایک فیصلہ کُن حملے کا حکم دیا اور اس کے سپاہی اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے دبابوں، سیڑھیوں اور کمندوں کی مدد سے قلعے کی دیواروں پر چڑھنے لگے۔

راجہ کی فوج نے رات کے تیسرے پہر تک مُقابلہ کیا لیکن اتنی دیر میں مسلمانوں کی فوج کے سینکڑوں سپاہی فصیل پر چڑھ چکے تھے اور منجنیق کی سنگ باری کی بدولت قلعے کی دیوار بھی ایک مقام سے ٹوٹ چکی تھی۔

راجہ داہر نے حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہی شہر کا مشرقی دروازہ کھلوا دیا اور ہاتھیوں کی مدد سے فوج کے لیے راستہ صاف کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ مسلمان شہر پناہ کے چاروں طرف منقسم ہونے کی وجہ سے دروازے پر مؤثر مزاحمت نہ کر سکے۔ ہاتھی مشرقی دروازے کے سامنے سے اُن

کے مورچے توڑتے ہوئے آگے نکل گئے اور اُن کے پیچھے راجہ کی تیس ہزار فوج لڑتی بھڑتی نکل گئی۔ محمدّ بن قاسم کی فوج نے چاروں طرف سے سمٹ کر دروازے پر حملہ کر دیا اور باقی سپاہیوں کے راستے میں مضبوط صفیں کھڑی کر دیں۔ انہوں نے راجہ کی محبّت سے زیادہ اپنے انجام سے خوفزدہ ہو کر باہر نکلنے کا راستہ صاف کرنے کے لیے چند زور دار حملے کیے لیکن مسلمانوں نے آن کی آن میں دروازے کے سامنے لاشوں کے ڈھیر لگا دیے۔ وہ بد دِل ہو کر پیچھے ہٹے اور مسلمانوں کی فوج پانی کے ایک زبردست ریلے کی طرح شہر کے اندر داخل ہو گئی۔

اتنی دیر میں کئی دستے مختلف راستوں سے شہر پناہ کے اندر داخل ہو چُکے تھے۔

راجہ کی بچی کھچی فوج نے چاروں اطراف سے اللہ اکبر کے نعرے سُن کر ہتھیار ڈال دیے۔

(۳)

محمدؐ بن قاسم نے اپنی فوج کے ساتھ دیبل کے گورنر کے محل میں صُبح کی نماز ادا کی اور طلوعِ آفتاب کے وقت دیبل کے دہشت زدہ باشندے اپنے مکانوں کی چھتوں پر کھڑے ہو کر فاتح افواج کے سترہ سالہ سپہ سالار کا جلوس دیکھ رہے تھے۔ قلعہ کی فتح کے بعد محمدؐ بن قاسم نے جن اسیرانِ جنگ کو آزاد کیا تھا اور جن زخمیوں کی مرہم پٹّی کی بھی وہ عوام کو ہندوستان میں ایک نئے دیوتا کی آمد کا پیغام دے چکے تھے۔ اس کی نوجوانی شجاعت، عفو اور رحم کے متعلّق ایسی داستانیں مشہور ہو چُکی تھیں جن کی صداقت پر استبدادی حکومت کے ستائے ہوئے عوام اعتبار کرنے کو تیّار نہ تھے۔ گزشتہ چند دِنوں میں دیبل کے شہریوں کو راجہ کی فوج کے سپاہی سخت اذیّتیں دے چکے تھے۔ دیبل میں راجہ کی فوجوں کی آمد کے بعد اُن کے گھر اپنے گھر نہ تھے۔ سپاہی رات کے وقت شراب کے نشے میں بدمست ہو کر لوگوں کے گھروں میں آ گھستے اور لوٹ مار کر کے نکل جاتے۔ صُبح کے وقت شرم و حیا کی دیویاں پھٹے ہوئے پیرہن اور بکھرے

ہوئے بالوں کے ساتھ بازاروں میں گشت لگانے والے افسروں کو اپنی مظلومیت کے قصّے سُناتیں لیکن اُنہیں شرمناک قہقہوں کے سوا کوئی جواب نہ ملتا۔

اپنے راجہ کی فوج کا سلوک دیکھ کر دیبل کے باشندے محمدّ بن قاسم کے عفو ورحم کے متعلّق کئی داستانیں سُننے کے باوجود فاتح لشکر سے نیک سلوک کی توقّع رکھنے کے لیے تیّار نہ تھے۔ لیکن جب محمدّ بن قاسم کی فوج اپنے سالار کی طرح نگاہیں نیچے کیے دیبل کے ایک بازار سے گزر رہی تھی ان کے شبہات آہستہ آہستہ دُور ہونے لگے اور مردوں کے علاوہ عورتیں بھی مکانوں کی چھتوں پر چڑھ کر کھڑی ہو گئیں۔ جب محمدّ بن قاسم شہر کا چکّر لگانے کے بعد دوبارہ محل کے قریب پہنچا۔ ایک نوجوان لڑکی نے بھاگ کر اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور ہونٹ بھینچتے ہوئے محمدّ بن قاسم کی طرف مُلتجی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ خوبصورت چہرے پر خراشوں کے نشان تھے۔ آنکھیں غم و غصّے کے باعث سُرخ تھیں۔ محمدّ بن قاسم کو وہ گلاب کے ایک ایسے پھول سے

مشابہ نظر آئی جسے کسی کے بے رحم ہاتھوں نے مسل ڈالا ہو۔

اس نے ترجمان کی وساطت سے کہا۔ ”خاتون! اگر یہ میرے کسی سپاہی کا فعل ہے تو میں اُسے تمہاری آنکھوں کے سامنے قتل کروں گا!“ لڑکی نے نفی میں سر ہلایا۔ اُس کے ہونٹ کپکپائے اور آنکھوں سے آنسوؤں کے دھارے بہہ نکلے۔

ایک عمر رسیدہ اور باوضع آدمی آگے بڑھا اور اُس نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ ”اَن داتا! یہ اُن کئی مظلوم لڑکیوں میں سے ایک ہے، جو راجہ کے سپاہیوں کی بربریت کا شکار ہو چکی ہیں، آپ سے انصاف مانگنے آئی ہے!“

ناصر الدّین نے اُس عمر رسیدہ شخص کی ترجمانی کرتے ہوئے محمدؐ قاسم کو یہ بتایا کہ یہ دیبل کا پروہت ہے۔

محمدؐ بن قاسم نے جواب دیا۔ ”آپ میرے سامنے ہاتھ نہ باندھیں۔ اِس لڑکی کی داد رسی میرا سب سے پہلا فرض ہے۔ راجہ کے بارہ ہزار سپاہی ہماری قید میں ہیں، آپ اِسے وہاں لے جائیں۔ اگر مُجرم اُن میں سے کوئی

ہوا تو میں اُسے آپ کے حوالے کر دوں گا۔ ورنہ میں اِس مُلک کی آخری حدود تک اُس کا تعاقب کروں گا!"

لڑکی نے کہا۔ "میرا مجرم دیبل کا گورنر ہے۔ اُس نے پرسوں میرے پِتا کو قید کر لیا تھا اور مُجھے۔۔۔" یہاں تک کہہ کر اُس کی آواز بھرّا گئی اور آنکھوں سے پھر ایک بار آنسو بہنے لگے۔ محمدّ بن قاسم نے اپنے ایک سالار کو بُلا کر کہا۔

"میں دیبل کے تمام قیدیوں کو آزاد کرنے کا حُکم دیتا ہوں۔ تم قید خانے کے دروازے کھلوا دو!"

(۴)

اگلے دِن دیبل کے سب سے بڑے مندر کا پروہت پُجاریوں کے سامنے عرب کے ایک نوجوان کے روپ میں بھگوان کے ایک نئے اوتار کی آمد کا پرچار کر رہا تھا اور دیبل کا سب سے بڑا سنگ تراش دیبل کے مُحسن کے لیے محبّت اور عقیدت کے جذبات سے سرشار ہو کر شہر کے بڑے مندر

کی زینت میں اضافہ کرنے کے لیے عرب کے کمسن اور نوجوان سالار کی مورتی تراش رہا تھا۔ محمدؐ بن قاسم نے جنگ میں مقتولین کے ورثا کے لیے معقول وظائف مقرّر کیے۔ ناصر الدّین کو دیبل کا گورنر مقرّر کیا۔ ایک گراں قدر رقم اُس مندر کی مرمّت کے لیے مخصوص کی جو منجنیق کے پتھّر کا نشانہ بن کر مسمار ہو چکا تھا۔

دس دِن بعد اُس نے نیرون کا رُخ کیا۔ اِس عرصہ میں اُس کے حُسنِ سلوک سے دیبل کے باشندوں پر اُس کی تلوار کے زخم مندمل ہو چکے تھے۔ رُخصت کے وقت ہزاروں مردوں، عورتوں اور بوڑھوں نے احسان مندی کے آنسوؤں کے ساتھ اُسے الوداع کہی۔ اُس کی فوج میں دیبل کے پانچ ہزار سپاہی شامل ہو چکے تھے۔

محمدؐ بن قاسم نے رُخصت ہونے سے پہلے زبیر، ناہید، خالد اور زبیر کو ناصر الدّین کے ساتھ ٹھہرنے کی اجازت دی لیکن اُنھوں نے شہر کے محلات میں آرام کرنے کی بجائے جنگ کے میدانوں میں بے آرامی کے دِن اور راتیں کاٹنے کو ترجیح دی۔ تاہم زبیر اور خالد نے محمدؐ بن قاسم کی رائے سے

اتّفاق کرتے ہوئے ناہید اور زہرا کو دیبل میں چھوڑ دیا۔

سندھ کا نیا سپہ سالار

نیرون کے ایک وسیع کمرے میں راجہ داہر سونے کی ایک کُرسی پر رونق افروز تھا۔ اودھے سنگھ سندھ کی افواج کا سیناپتی اور جے سنگھ سندھ کا ولی عہد اُس کے سامنے کھڑے تھے۔ اودھے سنگھ نے کہا۔ ”مہاراج! اگر اجازت ہو تو بھیم سنگھ کو اندر بُلاؤں؟“

راجہ نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ ”میں اُس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔ اگر وہ تمہارا بیٹا نہ ہوتا تو میں اُسے مست ہاتھی کے آگے ڈلوا دیتا۔“

اودھے سنگھ نے کہا۔ ”مہاراج! وہ بے قصور ہے۔ اگر ہم پچاس ہزار فوج

کے ساتھ دیبل کی حفاظت نہیں کر سکے تو وہ بیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ اُس کا راستہ کیسے روک سکتا تھا؟"

"لیکن یہ دعویٰ کر کے گیا تھا کہ دُشمن کو پہاڑی علاقے سے آگے نہیں بڑھنے دے گا۔ اُس نے یہ کہا تھا کہ اگر دُشمن کی فوج ہمارے بیس ہزار سپاہیوں کے پتھّروں کی بارش میں دب کر نہ رہ گئی تو واپس آ کر منہ نہیں دِکھائے گا!"

"مہاراج! میں نے کبھی اِس کی تائید نہیں کی۔ مُجھے دُشمن کی شجاعت کے متعلّق کوئی غَلَط فہمی نہ تھی۔ اگر دیبل میں ہماری پچاس ہزار فوج کے تیروں کی بارش میں کمندیں ڈال کر فصیل پر چڑھ سکتے تھے تو بیس ہزار سپاہیوں کے پتھّر انہیں پہاڑیوں پر قبضہ جمانے سے نہیں روک سکتے تھے۔"

راجہ نے گرج کر کہا۔ "میرے سامنے دیبل کے پچاس ہزار سپاہیوں کا نام نہ لو۔ وہ اُن میں نصف کے قریب دیبل کے ڈرپوک تاجر تھے۔ کاش مُجھے معلوم ہوتا کہ پرتاپ رائے نے دیبل کے خزانے سے سپاہیوں کی بجائے

بھیڑیں پال رکھی ہیں۔"

اودھے سنگھ نے کہا۔ "مہاراج! میں شروع سے اِس بات کے خلاف تھا کہ آپ دیبل جائیں۔ راجہ کا شکست کھا کر بھاگنا فوجوں پر بہت بُرا اثر ڈالتا ہے۔"

راجہ نے کہا۔ "بھگوان کا شکر ہے کہ میں نے تمہارا کہا نہیں مانا۔ ورنہ یہ تیس ہزار فوج بھی یہاں بچ کر نہ پہنچتی۔"

اودھے سنگھ نے کہا۔ "مہاراج! اگر آپ بھاگنے میں جلد بازی سے کام نہ لیتے تو۔۔۔۔۔"

راج کمار جے سنگھ نے اودھے سنگھ کا فقرہ پورا نہ ہونے دیا اور چلّا کر کہا۔ "اودھے سنگھ! ہوش میں آکر بات کرو۔ مہاراج کو اِس لیے دیبل چھوڑنا پڑا کہ اُن کے ساتھی تمہاری طرح نکمّے اور بُزدل تھے۔"

اودھے سنگھ کی قوّتِ برداشت جواب دے چکی تھی۔ تاہم اُس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "راج کمار! آپ جانتے ہیں کہ بھیم سنگھ بُزدل

نہیں، وہ آپ کے ساتھ کھیلا ہے!"

"وہ بُزدل نہیں لیکن بے وقوف ضرور ہے۔ پھر بھی میں پِتا جی سے کہوں گا کہ اُسے یہاں حاضر ہونے کا موقع دیں!"

راجہ نے جے سنگھ کی طرف دیکھا اور پھر اودھے کی طرف متوجّہ ہو کر کہا۔ "بُلاؤ اُسے!"

اودھے سنگھ نے دروازے پر ایک سپاہی کو اشارہ کیا اور وہ باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر میں بھیم سنگھ اندر داخل ہوا اور آداب بجالانے کے بعد ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا!

راجہ نے پوچھا۔ "تُم شکست کے بعد سیدھے دیبل کیوں نہ پہنچے؟"

بھیم سنگھ نے جواب دیا۔ "مہاراج! مُجھے یہ علم نہ تھا کہ آپ دیبل پہنچ جائیں گے اور میں نے آپ سے چند ضروری باتیں عرض کرنے کے لیے نیرون پہنچنا ضروری خیال کیا۔"

"لیکن تمہارا فرض تھا کہ تم رہی سہی فوج کے ساتھ دیبل پہنچتے۔"

”مہاراج کو شاید معلوم نہیں کہ میں زخمی ہونے کے بعد چند دِن دُشمن کی قید میں رہا اور جب میں آزاد ہوا، میرے ساتھ صرف چند سپاہی تھے اور اُنہیں کسی محفوظ مقام پر پہنچانا میرا فرض تھا۔“

راجہ نے کہا۔ ”بھیم سنگھ! دیبل اور لس بیلا کی جنگوں میں ہماری شکست کے ذمّہ دار فقط تُم ہو۔ اگر تم پہاڑوں میں دُشمن کا راستہ روک سکتے تو ہمیں دیبل میں ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑتا۔ میں نے تمہارے باپ کی مرضی کے خلاف تمہیں یہ موقع دیا تھا۔ اب میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ آئندہ کوئی مہم تمہارے سپرد نہ کی جائے۔“

بھیم سنگھ نے جواب دیا۔ ”مہاراج! میں خود بھی کوئی ذمّہ داری لینے کے لیے تیّار نہیں۔“

راجہ نے آنکھیں پھاڑ کر بھیم سنگھ کی طرف دیکھا اور بُلند آواز میں کہا۔ ”تو یہاں کیا لینے آئے ہو؟“

اودھے سنگھ نے اپنے بیٹے کے جواب سے پریشان ہو کر کہا۔ ”مہاراج!

بھیم سنگھ کا مطلب یہ ہے کہ اُسے بڑے عہدے کی ضرورت نہیں۔ وہ آپ کی فتح کے لیے ایک سپاہی کی حیثیت میں لڑنا بھی اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتا ہے۔ بھیم سنگھ! اَن داتا تُم سے خفا ہیں۔ اُن کے پاؤں پکڑ لو!"

بھیم سنگھ نے جواب دیا۔ "پِتا جی! اَن داتا کی تعظیم سر آنکھوں پر لیکن میں اِن کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ میں زخمی تھا اور دُشمن کے سپہ سالار نے اپنے ہاتھوں سے میری مرہم پٹّی کی۔ میری جان بچائی اور مُجھ سے دوبارہ اپنے مُقابلے پر نہ آنے کا وعدہ لیے بغیر آزاد کر دیا۔ مُجھے یہاں پہنچنے کے لیے اپنا گھوڑا دیا۔"

اودھے سنگھ نے مداخلت کی۔ "مہاراج! ہمارا دُشمن بہت ہوشیار ہے۔ اُس کا خیال یہ ہو گا کہ وہ اس طرح چاپلوسی کر کے بھیم سنگھ کو ورغلا سکے گا لیکن اُسے کیا معلوم کہ بھیم سنگھ کے باپ دادا آپ کے نمک خوار ہیں اور اس کی رگوں میں راجپوت کا خون ہے اور یہ آپ کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دے گا!"

بھیم سنگھ نے کہا۔ "پِتا جی! اگر وہ میری جان نہ بچاتا تو میرے خُون کا آخری

قطرہ میدانِ جنگ میں بہہ چکا ہوتا۔ میں نہیں جانتا کہ اُس نے میری جان کِس نیّت سے بچاتی ہے لیکن میں اُس کے خلاف تلوار نہیں اُٹھا سکتا؟"

بھیم سنگھ نے اپنی تلوار اُتار کر راجہ کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ "مہاراج! یہ مُجھے آپ نے عطا کی تھی۔ لیجیے!"

راجہ غصّے سے کانپنے لگا اور راج کمار جے سنگھ نے بھیم کے ہاتھ سے تلوار چھینتے ہوئے کہا: "بُزدل! کمینہ!!"

اودھے سنگھ کہہ رہا تھا۔ "بھیم سنگھ تمہیں کیا ہو گیا۔ مہاراج سے معافی مانگو، وہ تمہاری تقصیر معاف کر دیں گے۔ بھیم سنگھ! مُجھے شرمسار نہ کرو۔ دُنیا کیا کہے گی۔ تُم تو کہتے تھے کہ تُم مہاراج کو جنگ سے متعلّق ایک ضروری مشورہ دینے کے لیے آئے ہو۔ مہاراج! مہاراج!! میرا بیٹا بے قصور ہے، دُشمن نے اِس پر جادُو کر دیا ہے!"

بھیم سنگھ نے کہا۔ "ہاں مہاراج! اُس نے مُجھ پر جادُو کر دیا ہے۔ اگر آپ نے اُسے سمجھنے کی کوشش نہ کی تو کسی دِن اُس کا جادو تمام سندھ پر چھا

جائے گا۔ مہاراج! میں آپ کو اُس کے جادُو سے بچنے کا طریقہ بتانے کے لیے آیا تھا!“

اودھے سنگھ نے چلّا کر کہا۔ ”بھیم سنگھ بھگوان کے لیے جاؤ!“

راجہ نے کہا۔ ”اودھے سنگھ! تُم اب خاموش رہو۔ تمہارا بیٹا ہماری اجازت سے یہاں آیا ہے اور ہماری اجازت کے بغیر نہیں جا سکتا۔ ہاں بھیم سنگھ تُم ہمیں دُشمن کے جادُو سے بچنے کا طریقہ بتا رہے تھے؟ “

بھیم سنگھ نے کہا: ”مہاراج! وہ یہ ہے کہ آپ عرب اور سراندیپ کے قیدیوں کو دُشمن کے حوالے کر دیں۔ ورنہ ہمارے خلاف جو طوفان عرب سے اُٹھا ہے، وہ مجھے رُکنے والا نظر نہیں آتا!“

راجہ اچانک کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”تم دُشمن کے طرفدار بن کر مُجھ پر اُس کی طاقت کا رُعب جمانے کے لیے آئے ہو؟“

بھیم سنگھ نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”مہاراج آپ دیبل میں اُسے دیکھ چکے ہیں!“ راجہ نے چلّا کر کہا: ”دیبل! دیبل!! میرے سامنے دیبل کا ذکر نہ

کرو۔ وہاں مندر کا کلس گِر جانے سے تمہارے جیسے بُزدل سپاہیوں نے ہمّت ہار دی تھی۔ "

"مہاراج! میں بُزدل نہیں!"

"تُو اِس کا مطلب یہ ہے کہ میں بُزدل ہوں۔ کوئی ہے؟"

اودھے سنگھ نے ہاتھ باندھ کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "مہاراج! مہاراج! اِس کی خطا معاف کیجیے۔ ہم سات پشتوں سے آپ کے خاندان کی خدمت کر رہے ہیں! "

راجہ نے چلّا کر جواب دیا۔ "مُجھے تمہارے خاندان کی خدمات کی ضرورت نہیں!"

پندرہ بیس سپاہی ننگی تلواریں لے کر کمرے میں داخل ہوئے اور راجہ سے حکم کا انتظار کرنے لگے۔ راجہ نے بھیم سنگھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اسے لے جاؤ اور نیرون کے قید خانے کی سب سے تاریک کوٹھڑی میں

رکھو!"

اودھے سنگھ نے کہا۔ "مہاراج! اِس کی خطا معاف کیجیے! یہ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔"

جے سنگھ نے آگے بڑھ کر راجہ کے کان میں کُچھ کہا اور اُس نے اودھے سنگھ کو جواب دیا۔ "تُم بھی اِس کے ساتھ جا سکتے ہو۔ سندھ کو تمہارے جیسے سپہ سالار کی ضرورت نہیں!"

عقب کے کمرے کا پردہ اُٹھا اور لاڈھی رانی جلدی سے راجہ کے قریب آ کر کہنے لگی۔ "مہاراج! آپ کیا کر رہے ہیں۔ اودھے سنگھ فوج کا سیناپتی ہے۔ اور فوج اِس کے ساتھ بُرا سلوک برداشت نہ کرے گی!" جے سنگھ نے جلدی سے جواب دیا۔ "جب فوج کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ باپ بیٹا دُشمن کے ساتھ ملے ہوئے ہیں، وہ سب کُچھ برداشت کرلے گی!"

رانی نے کہا۔ "بیٹا! دشمن سر پر کھڑا ہے۔ یہ آپس میں پھُوٹ ڈالنے کا وقت نہیں!"

جے سنگھ نے جواب دیا۔ ”دشمن کی آخری منزل دیبل تھی۔ وہ دریائے سندھ کو کبھی عبور نہیں کر سکے گا۔ پتا جی! آپ فکر نہ کریں۔ چند دِنوں میں ملتان سے لے کر قنوج تک تمام راجہ اور سردار ہماری مدد کے لیے پہنچ جائیں گے اور ہم دُشمن کو ایسی شکست دیں گے جو اس کے خواب و خیال میں بھی نہ ہو گی۔ میرا یہ مشورہ ہے کہ اِن دونوں کو یہاں رکھنے کی بجائے اَروَر بھیج دیا جائے۔“

”سپاہیو! کیا دیکھتے ہو۔ تُم نے مہاراج کا حکم نہیں سُنا؟ اُنہیں لے جاؤ؟“

سپاہی آگے بڑھے لیکن اودھے سنگھ نے اُنہیں ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے اپنی تلوار اُتار دی اور جے سنگھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”یہ لیجئے، یہ سیناپتی کی تلوار ہے۔ مجُھے دُشمن پر سندھ کی فوج کی فتح سے زیادہ کسی اور بات کی خواہش نہیں!“

جے سنگھ نے اُس کے ہاتھ سے تلوار پکڑنے کی بجائے چھینتے ہوئے کہا۔ ”فتح کے لیے ہمیں تمہاری دعاؤں کی ضرورت نہیں!“

شام کے وقت اودھے سنگھ اور بھیم سنگھ چند سپاہیوں کی حراست میں اَروَر کا رُخ کر رہے تھے اور بیرن کے مندروں میں فوج کے نئے سیناپتی جے سنگھ کی فتح کے لیے دعائیں ہو رہی تھیں۔

(۲)

راجہ کے حکم کے مطابق بھیم سنگھ اور اودھے سنگھ کو اَروَر کے قید خانے کی ایک زمین روز کوٹھڑی میں بند کیا گیا۔ اُس کوٹھڑی میں ایک قیدی پہلے ہی موجود تھا۔ اُس نے دو نئے قیدیوں کو دیکھتے ہی ٹوٹی پھوٹی سندھی زبان میں کہا: ”جگہ تنگ ہے۔ تاہم ہم تینوں گزارہ کر سکتے ہیں۔ تُم کون ہو؟ اور یہاں کیسے آئے؟“

بھیم سنگھ اور اودھے سنگھ نے جواب دینے کی بجائے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر قیدی کو دیکھنے کی کوشش کی۔

قیدی نے کہا۔ ”شاید آپ مُجھے نہیں دیکھ سکتے لیکن آپ بہت جلد تاریکی میں دیکھنے کے عادی ہو جائیں گے۔ بیٹھ جائیے! آپ تھکے ہوئے معلوم

ہوتے ہیں اور اگر میں غَلطی نہیں کرتا تو آپ دونوں شاید باپ بیٹا ہیں؟“

اودھے سنگھ اور بھیم سنگھ تاریکی میں ہاتھ پھیلا کر سنبھل سنبھل کر پاؤں اُٹھاتے ہوئے آگے بڑھے اور ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

قیدی نے پھر کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی میری طرح بے گناہ ہیں۔ معاف کرنا۔ شاید آپ کو میری باتیں ناگوار محسوس ہوں لیکن کئی مہینوں سے میں نے کسی انسان سے بات نہیں کی۔ اِس لیے آپ کو دیکھ کر میرے دِل میں اپنی بپتا سنانے اور آپ کی سُننے کی خواہش کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ میں ابتدائی چھ مہینے اِس تہہ خانے سے اوپر ایک کشادہ کمرے میں تھا۔ وہاں میرے ساتھ آپ کے مُلک کے کُچھ اور قیدی تھے۔ میں نے آپ کی زبان اُن ہی سے سیکھی تھی۔ اگرچہ مُجھے اِس زبان پر عُبُور حاصل نہیں ہوا۔ پھر بھی مُجھے یقین ہے کہ میں اپنا مطلب بیان کر سکتا ہوں۔ آپ میرا مطلب سمجھتے ہیں نا؟“

بھیم سنگھ نے کہا۔ ”تُمّ اچھّی خاصی سندھی جانتے ہو!“

قیدی نے بھیم سنگھ کی متجسّس نگاہیں دیکھ کر کہا۔ ”شاید آپ مُجھے ابھی تک اچھّی طرح نہیں دیکھ سکے۔ میں قریب آجاتا ہوں!“

قیدی نے ایک کونے سے اُٹھ کر بھیم سنگھ کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں! اب آپ مُجھے دیکھ سکیں گے۔ میں عرب کا ایک مسلمان ہوں۔ آپ کو میرا قریب بیٹھنا ناگوار تو نہیں؟“

بھیم سنگھ نے کہا۔ ”تُم عرب ہو، لیکن عرب کے قیدی تو برہمن آباد میں تھے؟“

قیدی نے جواب دیا، ”وہ کوئی اور ہوں گے۔ میں شروع سے اِس قید خانے میں ہوں!“

اودھے سنگھ نے پوچھا۔ ”تُم سراندیپ سے آئے تھے؟ اور تمہارا جہاز دیبل کے قریب ڈوبا تھا؟ تمہارا نام ابوالحسن ہے؟“

قیدی نے جلدی سے جواب دیا۔ ”ڈوبا نہیں، ڈبویا گیا تھا اور ہاں آپ برہمن آباد کے عرب قیدیوں کے متعلّق کُچھ کہہ رہے تھے۔ وہ اِس مُلک

میں کیسے آئے؟ میرے جہاز سے تو صرف چار آدمی بچے تھے۔ دو زخمی تھے۔ وہ دیبل سے اَرور تک پہنچنے سے پہلے ہی جاں بحق ہو گئے۔ تیسرا جس کے زخم معمولی تھے وہ میرے ساتھ اِس قید خانے میں مر گیا تھا! "

بھیم سنگھ نے جواب دیا۔ "تمہارے جہاز کے بعد سر اندیپ سے دو اور جہاز آئے تھے۔ دیبل کے گورنر نے اُنہیں بھی گرفتار کر لیا تھا۔"

"وہ یہاں کیا لینے آئے تھے؟"

بھیم سنگھ نے جواب دیا۔ "وہ سر اندیپ سے اپنے مُلک جا رہے تھے!"

"آپ اُن میں سے کسی کا نام جانتے ہیں؟"

"ان جہازوں کے کپتان کو میں جانتا ہوں۔ اُس کا نام زبیر ہے اور وہ آزاد ہو چکا ہے!"

"زبیر سر اندیپ میں اِس نام کا کوئی عرب نہ تھا، وہ شاید کسی اور کے جہاز ہوں گے!"

بھیم سنگھ نے کہا۔ "زبیر کو بصرہ کے حاکم نے عرب کی بیوہ عورتیں اور لا

وارث بچّے لانے کے لیے سر اندیپ بھیجا تھا! "

قیدی نے بے تاب سا ہو کر کہا: "عورتیں اور بچّے؟ آپ اُن میں سے کسی کا نام جانتے ہیں؟"

"ان میں سے ایک نوجوان کا نام خالد ہے لیکن وہ قید میں نہیں۔"

"خالد! خالد!! میرا بیٹا!!! وہ کہاں ہے؟"

"وہ اس وقت دیبل میں ہو گا!"

"دیبل میں؟ وہ وہاں کیا کرتا ہے۔ سچ کہو تُم نے اُسے دیکھا ہے؟"

"میں نے اُسے لس بیلا میں مسلمانوں کے ساتھ دیکھا تھا اور اب وہ دیبل فتح کر چُکے ہیں؟"

ابوالحسن پر تھوڑی دیر کے لیے سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یکے بعد دیگرے بھیم سنگھ اور اودھے سنگھ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "سچ کہو، مُجھ سے مذاق نہ

کرو!"

اودھے سنگھ بولا۔ "وہ جن کے ساتھ قُدرت مذاق کر رہی ہو، دوسروں کے ساتھ مذاق کی جرأت نہیں کرسکتے۔ مسلمانوں کی فوج دیبل فتح کرچکی ہے اور انہیں یہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی۔" ابوالحسن دیر تک کوئی بات نہ کر سکا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ خوشی کے آنسو۔۔۔ تشکّر کے آنسو۔۔۔ لیکن اچانک اُس نے بھیم سنگھ کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا: "سراندیپ میں میری بیوی اور ایک بیٹی بھی تھی۔ تُم اُن کے متعلّق کُچھ جانتے ہو؟"

بھیم سنگھ نے جواب دیا۔ "آپ کی بیوی کے متعلّق مُجھے کوئی علم نہیں۔ شاید وہ برہمن آباد کے قیدیوں کے ساتھ ہو لیکن جب میں لس بیلا میں زخمی ہونے کے بعد مسلمانوں کی قید میں تھا، اُس وقت زبیر کے ساتھ خالد کی بہن کی شادی ہوئی تھی۔"

"تو سلمیٰ بھی اُن کے ساتھ ہو گی۔ وہ یقیناً اُن کے ساتھ ہو گی!"

اودھے سنگھ نے پوچھا۔ ''یہ سلمٰی کون ہے؟''

''وہ میری بیوی۔ آپ مُجھے یہ بتائیے کہ مسلمانوں کی فوج نے سندھ پر کب اور کیسے حملہ کیا؟''

اودھے سنگھ نے اُس کے جواب میں مختصراً محمدؐ بن قاسم کے حملے کے واقعات بیان کیے۔ بھیم سنگھ نے ذرا تفصیل کے ساتھ یہ داستان دہرائی اور اِس کے بعد ابو الحسن نے آپ بیتی سُنائی۔ غرض شام تک یہ تینوں قیدی گہرے دوست بن گئے اور قید سے رہا ہونے کی تدابیر سوچنے لگے۔

(۳)

دیبل سے نیرون کی طرف محمدؐ بن قاسم کی پیش قدمی کی خبر ملنے پر راجہ داہر نے اپنے سرداروں اور فوج کے عہدہ داروں سے مشورہ طلب کیا۔ سب نے جے سنگھ کی اِس تدبیر سے اتّفاق کیا کہ عربوں سے فیصلہ کُن جنگ دریائے سندھ کے پار برہمن آباد کے قریب لڑی جائے۔ نیرون میں صرف اِس قدر فوج رکھی جائے ہو چند دِن کے لیے محمدؐ بن قاسم کی

پیش قدمی روکنے کے لیے کافی ہو اور اِس عرصے میں راجہ اور سینا پتی کو برہمن آباد میں ایک زبردست فوج تیّار کرنے کا موقع مل جائے گا۔

موسم گرما شروع ہو چکا تھا اور راجہ داہر کو یہ بھی توقّع تھی کہ طغیانی کے دِنوں میں دریائے سندھ کی سرکش موجیں دیکھ کر محمدّ بن قاسم آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کرے گا اور اُسے سندھ کے طول و عرض سے نئی افواج فراہم کرنے کے علاوہ ہمسایہ ریاستوں سے مدد حاصل کرنے کا موقع مل جائے گا۔ چنانچہ اُس نے بیرون کے ایک بااثر برہمن کو جو شہر کا سب سے بڑا پروہت ہونے کے علاوہ فوجی معاملات میں بھی دسترس رکھتا تھا۔ نیرون کی حفاظت کے لیے منتخب کیا، اور اُس کے پاس آٹھ ہزار سپاہی چھوڑ کر جے سنگھ اور باقی فوج کے ہمراہ برہمن آباد کا رُخ کیا۔

محمدّ بن قاسم کی فوج نے اُس پروہت کی توقّع سے پانچ دِن پہلے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ منجنیق کے بھاری پتھّروں کی بارش سے شہر کی مضبوط فصیل لرز اُٹھی اور تیسرے دِن جب دبابوں کی مدد سے شہر پناہ پر حملے کرنے والی فوج کے مُقابلے میں شہر کے محافظین کی قوّتِ مزاحمت جواب دے

رہی تھی۔ شہر کے باشندوں کو احساس ہوا کہ راجہ نے اِس پروہت کی فوجی قابلیت کے متعلّق غَلَط اندازہ لگایا تھا۔ چوتھے دِن محمدّ بن قاسم کی فوج شہر پر ایک فیصلہ کُن حملے کی تیّاری کر رہی تھی کہ شہر کا دروازہ کھُلا اور چند پروہت صلح کا جھنڈا لہراتے ہوئے باہر نکلے۔

شہر پر قبضہ کرنے کے بعد محمدّ بن قاسم نے نیرون کے باشندوں کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جس کی بدولت وہ دیبل کے باشندوں کے قلوب مسخّر کر چکا تھا۔ نیرون کا نظم و نسق ٹھیک کرنے کے بعد محمدّ بن قاسم نے سہون کا رُخ کیا۔ سہون کا گورنر راجہ داہر کا بھتیجا باج رائے تھا اور شہر کی زیادہ آبادی برہمن پروہتوں اور تاجر پیشہ لوگوں پر مُشتمل تھی۔ ایک ہفتے کے محاصرے کے بعد باج رائے رات کے وقت شہر سے بھاگ نکلا اور شہر کے باشندوں نے ہتھیار ڈال دیے۔

سہون کی فتح کے بعد محمدّ بن قاسم کے بعض آزمودہ کار سالاروں نے اُسے مشورہ دیا کہ اب دریا عبور کر کے برہمن آباد کا رُخ کیا جائے تاکہ راجہ کو مزید تیّاری کے لیے وقت نہ ملے لیکن محمدّ بن قاسم نے جواب دیا کہ دریا

کے اِس کنارے پر سوستان ایک اہم شہر ہے اور اِس وقت جب کہ راجہ کی تمام کوشش برہمن آباد کا محاذ مضبوط بنانے پر لگی ہوئی ہے۔ ہم نیرون اور سہون کی طرح سوستان کو بھی نہایت آسانی سے فتح کر سکیں گے۔ اگر ہم دیبل سے براہ راست برہمن آباد کی طرف پیش قدمی کریں تو نیرون اور سہون کی افواج کو اپنے راجہ کے جھنڈے تلے جمع ہونے کا موقع مل جائے گا۔ ہماری فتوحات راجہ کی طاقت میں کمی اور ہماری فوج کی تعداد میں اضافہ کر رہی ہیں۔ مفتوح شہروں کی کُچھ فوج تتّر بتّر ہو جاتی ہے، کُچھ ہمارے ساتھ مل جاتی ہے اور باقی تھوڑی بہت جو پسپا ہو کر راجہ کے پاس پہنچتی ہے وہ اپنے ساتھ ایک شکست خوردہ ذہنیت لے کر جاتی ہے اور وہ فوج جس کے ایک فیصد سپاہی شکست خوردہ ذہنیت رکھتے ہوں، خواہ وہ لاکھوں کی تعداد میں ہو ہمارا مُقابلہ نہیں کر سکتی۔ جب ہم سندھ کی حدود میں داخل ہوئے تھے ہماری تعداد بارہ ہزار تھی۔ اب دیبل اور لس بیلا کے نقصانات کے باوجود ہماری تعداد بیس ہزار کے لگ بھگ ہے اور ہمارے سندھی ساتھیوں نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ اُن کی تلواریں جو حق کے مُقابلے میں کُند ثابت ہوئیں، باطل کے مُقابلے میں کافی تیز

ہیں۔“

محمدّ بن قاسم کے دلائل سُن کر فوج کے تمام عہدیدار اُس کے ہم خیال ہو گئے۔ باج رائے سہون سے فرار ہو کر سوستان میں جاٹوں کے راجہ کاکا کے پاس پناہ لے چکا تھا۔ راجہ کاکا راجہ داہر کا زبردست حلیف تھا۔ اُس کی شجاعت کی داستانیں سندھ کے طول و عرض میں مشہور تھیں۔ تاہم دیبل نیرون اور سہون میں محمدّ بن قاسم کی شاندار فتوحات نے اُسے کسی حد تک خوفزدہ کر دیا تھا سوستان کی فصیل کافی مضبوط تھی لیکن اُس نے قلعہ بند ہو کر لڑنے والی فوج کے لیے حملہ آوروں کے منجنیق اور دبابے خطرناک سمجھتے ہوئے کھُلے میدان میں لڑنے کو ترجیح دی۔

(۴)

محمدّ بن قاسم یلغار کرتا ہوا سوستان پہنچا تو کاکا کی فوج شہر سے باہر صف بستہ ہو کر حملے کے لیے تیّار کھڑی تھی۔ کاکا نے شجاعت سے زیادہ اپنے جوشیلے پن اور جلد بازی کا ثبوت دیا اور محمدّ بن قاسم کو جنگ کی تیّاری کا موقع دینا مناسب نہ سمجھتے ہوئے اچانک حملہ کر دیا۔ محمدّ بن قاسم نے حملے کی شدّت

دیکھ کر قلبِ لشکر کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ کاکا کی فوج اِس جنگی چال کو نہ سمجھ سکی اور وہ فتح سے پُر اُمّید ہو کر دلیرانہ وار لڑتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ کاکا کو اپنی غَلَطی کا اُس وقت احساس ہوا جب حریف کے لشکر کے قلب سے پسپا ہونے والے دستے اچانک رُک کر ایک آہنی دیوار کی طرح جم کر کھڑے ہو گئے اور بازوؤں کے سوار آندھی کی طرح اُس کی فوج کے عقب میں جا پہنچے۔ کاکا کی فوج چاروں طرف سے ایک زور دار حملے کی تاب نہ لا سکی۔ باج رائے میدان سے بھاگ نکلنے کی کوشش میں مارا گیا۔ اُس کی موت نے کاکا کی فوج کے سپاہیوں کو بددِل کر دیا۔ کاکا نے فوج کا حوصلہ بڑھانے کی بڑی کوشش کی لیکن جب اپنی شکست کے متعلّق کوئی شُبہ نہ رہا تو وہ بھی اپنے چند جاں نثاروں کے ساتھ ایک طرف سے گھیرا ڈالنے والی فوج کی صفیں توڑ کر بھاگ نکلا لیکن محمدّ بن قاسم کے سواروں نے تعاقب کر کے اُسے پھر ایک بار گھیرے میں لے لیا اور اُس نے رہے سہے ساتھیوں سمیت ہتھیار ڈال دیے۔

جب اُسے محمدّ بن قاسم کے سامنے لایا گیا تو اُس نے حیران ہو کر پوچھا۔

”اِس فوج کے سپہ سالار آپ ہیں!“

محمدؐ بن قاسم نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہاں! میں ہوں!“

کاکا نے اور زیادہ متعجّب ہو کر محمدؐ بن قاسم کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پوچھا۔ ”آپ نے میرے لیے کیا سزا تجویز کی ہے؟“

محمدؐ بن قاسم نے جواب دیا۔ ”سندھ پر حملہ کرنے کے بعد تُم دوسرے آدمی ہو جسے میں نے ایک بہادر سپاہی کی طرح لڑتے دیکھا ہے۔ میں تمہارے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو میں بھیم سنگھ کے ساتھ کر چکا ہوں۔ تُم آزاد ہو!“

کاکا نے جواب میں کہا۔ ”اور اِس آزادی کی مُجھے کیا قیمت ادا کرنی ہوگی؟“

محمدؐ بن قاسم نے جواب دیا۔ ”ہم آزادی کی قیمت وصول کرنے کے لیے نہیں آئے؟“

”تو آپ یہاں کیا لینے آئے ہیں؟“

"ظُلم کا ہاتھ روکنے اور مظلوم کا سر اُونچا کرنے کے لیے!"

کاکا نے کُچھ دیر سر جھُکا کر سوچنے کے بعد کہا۔ "اگر آپ کو یقین ہے کہ میں ظالم ہوں تو آپ مُجھے آزاد کیوں کرنا چاہتے ہیں؟"

"اِس لیے کہ مغلوب انسان پر تشدّد اُسے سرکشی کے لیے اُبھارتا ہے۔ اُسے اصلاح کی طرف آمادہ نہیں کرتا۔"

کاکا نے کُچھ دیر تک سوچنے کے بعد کہا۔ "میں نے سُنا تھا کہ آپ بہت بڑے جادُوگر ہیں۔ آپ دُشمن کو دوست بنانے کے ڈھنگ جانتے ہیں۔ کیا مُجھے بھی آپ کے دوستوں میں جگہ مل سکتی ہے؟" یہ کہتے ہوئے اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

محمدؐ بن قاسم نے گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں پہلے بھی تمہارا دُشمن نہ تھا۔"

راجہ داہر کی آخری شکست

راجہ کاکا نے چند دِنوں میں اپنی بچی کھچی فوج دوبارہ منظّم کی اور محمدؐ بن قاسم کے ساتھ شامل ہو گیا۔ محمدؐ بن قاسم نے یہاں سے برہمن آباد کا رُخ کیا اور برہمن آباد سے چند کوس دور دریا کے کنارے پر پڑاؤ ڈال دیا۔ یہاں اُسے دریا عُبُور کرنے کی تیّاریوں میں چند دِن لگ گئے۔ اِس مرحلہ پر سعد (گنگو) اُس کے لیے ایک بہت بڑا مددگار ثابت ہوا۔ اُس کے ساتھی دریا کے کنارے تک ماہی گیروں کی بستیوں میں سندھ کے نجات دہندہ کی آمد کا پیغام لے کر پہنچے اور چند دِنوں میں کئی ملّاح اپنی کشتیوں سمیت محمدؐ بن قاسم کی اعانت کے لیے جمع ہوئے لیکن دریا عُبُور کرنے سے پہلے محمدؐ

بن قاسم کے گھوڑوں میں ایک وبا پھوٹ نکلی اور چند دِنوں میں گھوڑوں کی ایک خاصی تعداد ہلاک ہو گئی۔ حجاج بن یوسف نے یہ خبر سُنتے ہی بصرہ سے دو ہزار اونٹوں پر سرکہ لاد کر بھیج دیا اور یہ سرکہ اِس خطرناک بیماری کے لیے مُفید ثابت ہوا۔

جون ۷۱۲ء میں محمدّ بن قاسم نے کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر دریائے سندھ عُبُور کر لیا۔ راجہ داہر قریباً دو سو ہاتھیوں کے علاوہ اپنی فوج میں پچاس ہزار سواروں اور کئی پیدل دستوں کا اضافہ کر چکا تھا۔ جون کے آخری دِنوں میں دریا زوروں پر تھا اور یہ اُمّید نہ تھی کہ محمدّ بن قاسم اُسے عُبُور کرنے میں اِس قدر مستعدی سے کام لے گا۔ اُس نے اپنے لشکر کو فوراً پیش قدمی کا حکم دیا اور محمدّ بن قاسم کے مستقر سے دو کوس کے فاصلے پر پڑاؤ ڈال دیا۔

چند دِن دونوں افواج کے گشتی دستوں کے درمیان معمولی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ بالآخر ایک شام محمدّ بن قاسم نے ایک فیصلہ کُن جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا۔ رات کے وقت عشاء کی نماز کے بعد اُس نے مشعل کی روشنی میں اپنی

بیوی کے نام ایک خط لکھ کر قاصد کے حوالے کیا

رفیقۂ حیات!

خُدا تمہیں ایک مجاہدہ کی بیوی کا عزم اور حوصلہ عطا کرے۔ میں صُبح دُشمن کی بے شمار فوج کے ساتھ ایک فیصلہ کُن جنگ لڑنے جا رہا ہوں اور یہ مکتوب تمہارے ہاتھوں تک پہنچنے سے پہلے سندھ کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہو گا۔ میرا دِل گواہی دیتا ہے کہ خُدا مُجھے فتح دے گا۔ مجھے اپنے سپاہیوں پر ناز ہے اور اِن سپاہیوں سے زیادہ عرب کی اُن ماؤں پہ ناز ہے جِن کا دُودھ اُن کی رگوں میں خُون بن کر دوڑ رہا ہے جنھوں نے اُنہیں بچپن میں لوریاں دیتے وقت بدر و حُنین کی داستانیں سُنائیں، مُجھے اُن بیویوں پر ناز ہے جن کی فرض شناسی نے اُن کے شوہروں کو غازیوں کی زندگی اور شہیدوں کی موت کی تمنّا کرنا سکھایا ہے جن کی محبّت نے اُن کے پاؤں میں زنجیر پہنانے کی بجائے انہیں تسخیرِ عالم کا سبق دیا ہے اور مُجھے اطمینان ہے کہ جب تک اُن مجاہدوں کی رگوں سے خون کا آخری قطرہ نہیں بہہ جاتا۔ یہ اسلام کا جھنڈا سرنگوں نہ ہونے دیں گے۔

میں تمہاری اور امّاں جان کی جدائی سے کبھی پریشان نہیں ہوا۔ میں تمہاری یاد سے کبھی غافل نہیں لیکن جب میں اپنے ساتھ ہزاروں اُن نوجوانوں کو دیکھتا ہوں جو خُدا کی راہ میں صبر اور شُکر کے ساتھ اپنی بیویوں، ماؤں اور دوسرے عزیزوں کی جُدائی برداشت کر رہے ہیں تو مُجھے اِس بات سے بڑی خوشی ہوتی ہے کہ میں بھی اُن میں سے ایک ہوں۔ پچھلی جنگوں میں جو نوجوان شہید ہو چُکے ہیں، اُن میں سے بعض کی ماؤں نے مُجھ سے خط لکھ کر یہ پوچھا ہے کہ اُن کے بیٹوں کا خُون ایڑیوں پر تو نہیں گِرا اور اگر میں شہید ہو جاؤں تو مُجھے توقّع ہے کہ میری ماں بھی میرے ساتھیوں سے یہی سوال پوچھے گی۔

میں تُم سے یہ وعدہ کر چکا ہوں کہ جب تک بیوہ عورتیں اور یتیم بچّے رہا نہ ہوں گے، میں اپنی رفتار سُست نہ ہونے دوں گا اور میں یہ وعدہ پورا کر کے رہوں گا اور تُم مُجھ سے وعدہ کر چُکی ہو کہ تُم میری شہادت پر آنسو نہیں بہاؤ گی۔ تُم بھی اپنا وعدہ پورا کرنا۔ امّی جان سے میرا مؤدبانہ سلام کہنا۔ میں اُن کے نام ایک علیحدہ خط لکھ رہا ہوں۔

تمہارا محمدؒ"

دوسرا خط ماں کو لکھنے کے بعد محمدؒ بن قاسم میدان جنگ کا نوشتہ دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

(۲)

صُبح کی نماز کے بعد مسلمانوں کی فوج کیل کانٹے سے لیس ہو کر صفوں میں کھڑی ہو گئی۔ محمدؒ بن قاسم نے گھوڑے پر سوار ہو کر ایک پُر جوش تقریر کی:

اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپاہیو! آج تمہاری شجاعت، تمہارے ایمان اور تمہارے ایثار کے امتحان کا دِن ہے۔ دُشمن کی تعداد سے نہ گھبرانا۔ تاریخ شاہد ہے کہ کفر و اسلام کے تمام گزشتہ معرکوں میں باطل کے علمبردار حق پرستوں کے مُقابلے میں زیادہ تھے اور حق پرستوں نے ہمیشہ یہ ثابت کیا کہ فوج کی طاقت کا راز افراد کی تعداد میں نہیں بلکہ اُن کے ایمان کی پُختگی اور اُن کے مقاصد کی بُلندی میں ہے۔

ہماری جنگ کسی قوم کے خلاف نہیں، کسی مُلک کے خلاف نہیں، بلکہ دُنیا کے تمام اُن سرکش انسانوں کے خلاف ہے جو خُدا کی زمین پر فساد پھیلاتے ہیں۔ ہم روئے زمین پر اپنی حکومت نہیں بلکہ خُدا کی حکومت چاہتے ہیں۔ ہم اپنی سلامتی اور اپنے ساتھ دُنیا کے تمام انسانوں کی سلامتی چاہتے ہیں اور خُدا کی زمین پر سلامتی کا راستہ صرف اسلام ہے۔ یہ وہ دین ہے، جو دُنیا سے آقا اور غلام، گورے اور کالے، عربی اور عجمی کی تمیز مٹاتا ہے۔ ہمارا مقصد اِس دین کی فتح ہے اور اِس مقصد کے لیے جینا اور مرنا دُنیا کی سب سے بڑی سعادت ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد اِس مقصد کے لیے لڑے، خُدا نے اُن کی مُٹھی بھر جماعت کے سامنے دُنیا کے بڑے بڑے جابر اور قاہر شہنشاہوں کی گردنیں جھکا دیں۔

عرب کے شہسوارو! اُنہیں اپنے مقدّر پر فخر کرنا چاہیے کہ خُدا نے اپنے دین کی اشاعت کے لیے تمہیں مُنتخب کیا۔ تُم نے خُدا کی راہ میں سر دھڑ کی بازی لگائی اور خُدا نے تمہیں ارض و سما کی نعمتوں سے مالا مال کر دیا۔ وہ وقت یاد کرو جب خُدا نے اپنے تین سو تیرہ بے سر و سامان بندوں کو

بہترین ہتھیاروں سے مسلح لشکر پر فتح دی تھی۔ قادسیہ یرموک اور اجنادین کے میدانوں میں حق کی ایک تلوار کے مُقابلے میں باطل کی دس اور بعض اوقات اِس سے بھی زیادہ تلواریں بے نیام ہوئیں لیکن خُدا نے ہمیشہ حق پرستوں کو فتح دی۔ خُدا آج بھی تمہاری مدد کرے گا لیکن یاد رکھو! قُدرت کے فیصلے اٹل ہیں۔ قدرت صرف اُن کی مدد کرتی ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ تُم اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہوئے بغیر خُدا کے انعامات کے مستحق نہیں ہوسکتے۔ قدرت کا دستِ شفقت صرف اُن کی طرف دراز ہوتا ہے، جو تیروں کی بارش میں سینہ سپر ہوتے ہیں۔ جو خندقوں کو اپنی لاشوں سے پاٹتے ہیں۔ قدرت کے انعامات صرف اُن اقوام کے لیے ہیں جن کی تاریخ کا ہر صفحہ شہیدوں کے خُون سے رنگین ہے۔

یاد رکھو! بنی اسرائیل بھی خُدا کی لاڈلی اُمّت تھی لیکن جب وہ راہِ حق میں جہاد کی ذمّہ داری خُدا اور اُس کے پیغمبر کو سونپ کر آرام سے بیٹھ گئے تو قُدرت نے اُنہیں دھتکار دیا اور اُنہیں آج اس زمین پر جائے پناہ نہیں

ملتی، جس پر کسی زمانے میں اُن کے اقبال کے پرچم لہراتے تھے۔ خُدا وہ دِن نہ لائے کہ تُم بھی بنی اسرائیل کی طرح اپنی کتابِ زندگی سے جہاد کا باب خارج کر دو۔

میرے دوستو اور میرے بھائیو! آج تمہارے لیے ایک سخت آزمائش کا دِن ہے۔ تمہیں بدر و حنین کے مجاہدوں کی سُنّت ادا کرنی ہے۔ تمہیں قادسیہ اور یرموک کے شہیدوں کے نقشِ قدم پر چل کر دکھانا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ آج کے دِن فتح کے لیے خُدا نے جس جماعت کو مُنتخب کیا ہے، وہ تُم ہو۔ مُجھے یقین ہے کہ حق کی تلواروں کے سامنے سندھ کا لوہا روم و ایران کے لوہے کے مُقابلے میں سخت ثابت نہ ہو گا۔ ظالم لوگ کبھی بہادر نہیں ہوتے لیکن میں پھر ایک بار تمہیں یہ ہدایت کرتا ہوں کہ حق کی راہ کو کُفر کے کانٹوں سے پاک کرتے وقت یہ خیال رکھنا کہ تُم کوئی مہکتا ہوا پھُول بھی اپنے پاؤں سے نہ مسل ڈالو۔ گرے ہوئے دُشمن پر وار نہ کرنا۔ عورتوں، بچّوں اور بوڑھوں پر تمہارا ہاتھ نہ اُٹھے۔ میں جانتا ہوں کہ سندھ کے راجہ نے عرب عورتوں اور بچّوں کے ساتھ بہت بُرا سلوک

کیا ہے اور مجھے ڈر ہے کہ انتقام کا جذبہ تمہیں کہیں ظُلم پر آمادہ نہ کرے۔ خُدا کے قانون میں توبہ کرنے والوں کے لیے ہر وقت رحم کی گُنجائش ہے۔ دُشمن کو مغلوب کر دو اور اُس پر یہ ثابت کر دو کہ ہماری غیرت خُدا کی غیرت ہے اور ہماری تلوار خُدا کی تلوار ہے۔ لیکن جب وہ اپنی شکست کا اعتراف کرے اور تُم سے پناہ مانگے تو اُسے اُٹھا کر گلے لگا لو اور کہو کہ اسلام کی رحمت کا دروازہ کسی کے لیے بند نہیں۔

تُم جانتے ہو کہ اِس دُنیا میں کسی کو اتنا نہیں ستایا گیا جِس قدر کفّارِ مکّہ نے پیغمبرِ اسلام علیہ السّلام کو ستایا تھا۔ ظُلم کے ترکش میں کوئی ایسا تیر نہ تھا جس سے اُن کے مقدّس جسم کو مجروح کرنے کی کوشش نہ کی گئی ہو۔ رحمۃ للعالمین کی آنکھوں کے سامنے اُن کے جاں نثاروں کے سینوں پر تپتے ہوئے پتھّر رکھے گئے اور جب آپؐ نے ہجرت کی تو ظالموں نے آپ کا پیچھا نہ چھوڑا۔ مدینے کی جنگوں میں آپؐ کے کئی جاں نثار شہید ہوئے لیکن فتح مکّہ کے بعد اپنے دُشمنوں کے ساتھ جو سلوک حضور پُر نُور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا، اُس کی مثال دُنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی اور یہ اُسی

نیک سلوک کا نتیجہ تھا کہ آپ کے بدترین دُشمن آپ کے بہترین جاں نثار بن گئے۔ آج ترکستان اور افریقہ میں ہر اُس ملک کے باشندے جو کسی زمانے میں ہمارے خلاف نبرد آزما ہوئے تھے، اسلام کی فتح کے لیے ہمارے دوش بدوش لڑ رہے ہیں۔ یہ کون کہہ سکتا ہے کہ سندھ بلکہ یہ سارا ہندوستان کسی دِن ایران، شام اور مصر کی طرح دینِ حق کی فتح کے لیے ہمارا ساتھ نہیں دے گا۔ میرے دوستو! آج تمہاری منزل برہمن آباد ہے۔ آؤ ہم فتح کے لیے دُعا کریں۔"

محمدؐ بن قاسم نے یہ کہہ کر ہاتھ اُٹھائے اور دُعا کی۔ "اے سزا اور جزا کے مالک! ہم تیرے دین کی فتح چاہتے ہیں۔ ہمیں اپنے اسلاف کا جذبہ عطا کر۔ رب العالمین! حشر کے دِن ہماری ماؤں کو شرمسار نہ کرنا۔ ہمیں غازیوں کی زندگی اور شہیدوں کی موت عطا کر۔"

(۳)

شام تک سندھ کی فوج راجہ داہر کے علاوہ تیس ہزار لاشیں میدان میں چھوڑ کر پسپا ہو چکی تھی۔ فوج کے وہ دستے جنہیں تیسرے پہر ہی اپنی

شکست کا یقین ہو چکا تھا، اَروَر کا رُخ کر چکے تھے۔ باقی فوج نے راجہ داہر کے قتل ہو جانے پر ہمّت ہار دی اور برہمن آباد کا رُخ کیا۔

مسلمان کُچھ دیر اُن کا تعاقب کرنے کے بعد کیمپ کی طرف لوٹ آئے۔ اِس جنگ میں مسلمان زخمیوں اور شہیدوں کی تعداد ساڑھے تین ہزار کے قریب تھی۔ سپاہی زخمیوں کو میدان سے اٹھا اٹھا کر قطاروں میں لٹا رہے تھے اور محمدؐ بن قاسم جرّاحوں کی جماعت کے ساتھ اُن کی مرہم پٹّی میں مصروف تھا۔ زبیر ایک زخمی کو پیٹھ پر اُٹھائے ہوئے محمدؐ بن قاسم کے قریب پہنچا اور اُسے زمین پر لٹاتے ہوئے محمدؐ بن قاسم سے مخاطب ہوا۔ ”آپ ذرا اِسے دیکھ لیں۔ یہ بہت بُری طرح زخمی ہوا ہے!“

محمدؐ بن قاسم نے جلدی سے اُٹھ کر زخمی کے قریب پہنچتے ہوئے کہا۔ ”کون؟ سعد؟“

سعد کا چہرہ خون سے رنگا ہوا تھا۔ محمدؐ بن قاسم نے کپڑے سے اُس کا مُنہ پونچھنے کی کوشش لیکن اُس نے محمدؐ بن قاسم کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مُسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ ”اب اِس کی ضرورت نہیں۔

میں صرف آخری بار آپ کو دیکھنا چاہتا تھا۔“

زبیر اور محمدؐ بن قاسم نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ خالد چند قدم کے فاصلے پر زخمیوں کو پانی پلا رہا تھا۔ زبیر نے اُسے آواز دی اور وہ بھاگتا ہوا سعد کے پاس پہنچا۔ ”چچا تُم۔۔۔۔۔“ اُس کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

سعد نے اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیا اور خالد اُسے دونوں ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گیا۔

سعد نے کہا۔ ”مُجھے اب موت کا ڈر نہیں لیکن میں بہت گناہ گار ہوں۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ خُدا مُجھے معاف کر دے گا!“

محمدؐ بن قاسم نے کہا۔ ”شہیدوں کا خُون اُن کے تمام گناہ دھو دیتا ہے!“

سعد نے خالد کی طرف دیکھا اور نحیف آواز میں کہا۔ ”بیٹا! زہرا کا خیال رکھنا اور زبیر! تمہیں ناہید کے متعلّق کُچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ تھوڑی دیر تک اُس نے یکے بعد دیگرے اُن دونوں کی طرف دیکھا اور محمدؐ بن قاسم کے چہرے پر نگاہیں گاڑ دیں۔ اُس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ

گئی۔ سعد نے چند اُکھڑے ہوئے سانس لینے کے بعد خالد اور محمدّ بن قاسم کے ہاتھ چھوڑ دیے۔ اتنی دیر میں سعد کے چند اور رفیق بھی اُس کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ محمدّ بن قاسم نے اُس کی نبض پر ہاتھ رکھ کر انا لِلّٰہ و اِنّا الیہ راجعون کہا اور اپنے ہاتھ سے اُس کی آنکھیں بند کر دیں۔

(۳)

محمدّ بن قاسم اُٹھ کر پھر زخمیوں کی طرف متوجّہ ہونا چاہتا تھا کہ ایک سوار اپنے آگے ایک زخمی کو لادے ہوئے اُس کے قریب پہنچا۔ محمدّ بن قاسم نے اُسے دیکھتے ہی سوال کیا۔ ”بھیم سنگھ تُم۔۔۔۔ یہ کون ہے؟“ ایک سپاہی نے زخمی کو گھوڑے سے اُتار کر نیچے لِٹا دیا۔ بھیم سنگھ نے گھوڑے سے اُترتے ہوئے کہا۔ ”خالد! اپنے باپ کی طرف دیکھو؟“

خالد سر جھکائے سعد کے قریب بیٹھا تھا۔ اُس نے زخمی کو دیکھتے ہی ایک ہلکی سی چیخ ماری اور بھاگ کر اُس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ ”ابّا! میرے ابّا!!“

زخمی کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ بھیم سنگھ کی طرف متوجّہ ہوا۔
"آپ اُنہیں کہاں سے لائے؟ یہ کیسے زخمی ہوئے؟"

بھیم سنگھ نے جواب دیا۔ "میں، پِتا جی اور یہ اَروَر کے قید خانے سے ایک فوجی افسر کی مدد سے فرار ہوئے تھے۔ جب ہم یہاں پہنچے تو راجہ کی فوج فرار ہو رہی تھی۔ اُنہوں نے پِتاجی کے سمجھانے کے باوجود سپاہیوں کے ایک گروہ پر حملہ کر دیا۔ میں اور پِتا جی نے مجبوراً اِن کا ساتھ دیا۔ پِتا جی ایک تیر کھا کر گھوڑے سے گر پڑے اور ایک ہاتھی کے پاؤں تلے کُچلے گئے۔ یہاں تک کہہ کر بھیم سنگھ خاموش ہو گیا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اور یہ بے تحاشا آگے بڑھتے گئے۔ پانچ چھ سپاہیوں کو مارنے کے بعد یہ زخمی ہو کر گھوڑے سے گر پڑے۔ اِن کی آخری خواہش تھی کہ میں اپنے بیٹے سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ اُنہیں اچھّی طرح دیکھیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ ابھی تک زندہ ہیں!"

محمدؐ بن قاسم نے چند سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔ "تُم اِن کے ساتھ

جاؤ اور اِن کے پِتا جی کی لاش اٹھا لاؤ اور خود ابو الحسن کی طرف متوجّہ ہوا اور اس کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”اُنہیں غش آ گیا ہے، پانی لاؤ!“

ایک سپاہی نے اپنے مشکیزے سے پانی کا گلاس بھر کر پیش کیا اور محمدؐ بن قاسم نے ابو الحسن کا مُنہ کھولتے ہوئے اُسے پانی کے چند گھونٹ پلا دیے۔ ابو الحسن نے ہوش میں آ کر آنکھیں کھولیں لیکن خالد کو پہچانتے ہی اُس پر تھوڑی دیر کے لیے پھر غشی طاری ہو گئی۔ اُسے دوبارہ ہوش میں لانے کے بعد محمدؐ بن قاسم نے اُس کے سینے کے زخم کی مرہم پٹّی کی۔

خالد سے ابو الحسن کا پہلا سوال یہ تھا۔ ”تمہاری امّی کہاں ہے؟“

”وہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!“ خالد گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

ابو الحسن نے اپنے چہرے پر ایک دردناک مُسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

”بیٹا گھبراؤ نہیں۔ میں سمجھ گیا وہ زندہ نہیں۔ ناہید کہاں ہے؟“

”وہ دیبل میں ہے!“

”تو تمہاری بیوی بھی وہیں ہو گی۔ کاش! میں موت سے پہلے اُنہیں دیکھ سکتا لیکن وہ، وہ بہت دور ہیں اور میں فقط چند گھڑیوں کا مہمان ہوں!“

محمدّ بن قاسم نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ ”آپ فکر نہ کریں۔ میں ابھی اُنہیں بُلا بھیجتا ہوں۔ انشاء اللہ وہ ڈاک کے گھوڑوں پر پرسوں تک یہاں پہنچ جائیں گی۔“

ابو الحسن نے احسان مندانہ نگاہوں سے محمدّ بن قاسم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”شکریہ! لیکن میں شاید پرسوں تک زندہ نہ رہوں۔“

محمدّ بن قاسم نے جواب دیا۔ ”آپ کا زخم زیادہ خطرناک نہیں۔ اگر قُدرت کو آپ کی ملاقات منظور ہے تو وہ ہو کر رہے گی؟“

چوتھے روز طلوعِ آفتاب سے کُچھ دیر بعد ابو الحسن کے بستر کے گرد محمدّ بن قاسم، خالد اور زبیر کے علاوہ ناہید اور زہرا بھی موجود تھیں۔ ناہید اور زہرا نے شام کے وقت اُس جگہ پہنچنے کے بعد سفر میں تھکاوٹ سے چور ہونے کے باوجود زبیر اور خالد کی طرح ساری رات ابو الحسن کی تیمارداری

میں کاٹی تھی۔

نزع سے کُچھ دیر پہلے ناہید اور زہرا کی طرح خالد کی آنکھوں میں بھی آنسو دیکھ کر ابو الحسن نے کہا: ”بیٹا! میں اپنے لیے اِس سے بہتر موت کی دُعا نہیں کر سکتا تھا۔ موت پر آنسو بہانا دُنیا کی ایک رسم ہے لیکن شہادت کی موت کے لیے اس رسم کو پورا کرنا شہادت کا مذاق اڑانا ہے۔ اِس طرح ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے میری طرف نہ دیکھو۔ مُجھے آنسوؤں سے نفرت ہے۔ زندگی کی کٹھن منازل میں ایک مسلمان کی پُونجی آنسو نہیں، خُون ہے۔“

خالد نے آنسو پونچھ ڈالے اور کہا۔ ”ابّا جان! مُجھے معاف کر دیجیے!“

دوپہر کے وقت ابو الحسن نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

برہمن آباد سے ارَوَر تک

برہمن آباد پہنچ کر جے سنگھ نے چاروں طرف ہرکارے دوڑائے۔ راجہ داہر کی شکست سے پہلے ملتان سے لے کر راجپوتانہ تک کئی راجہ اور سردار اپنی اپنی افواج کے ساتھ اُس کی مدد کے لیے روانہ ہو چکے تھے لیکن نیرون کی فتح کے بعد جب محمدؐ بن قاسم نے برہمن آباد کا رُخ کرنے کی بجائے سہون اور سوستان کی طرف پیش قدمی شروع کی تو اُنہیں یہ اطمینان ہو گیا کہ برہمن آباد کے قریب فیصلہ کُن جنگ لڑنے کے لیے ابھی کافی وقت ہے۔ جون میں دریا بھی زوروں پر تھا اور کسی کو یہ اُمّید نہ تھی کہ محمدؐ بن قاسم اُسے عُبُور کرنے کے لیے پانی اُتر جانے کا انتظار نہیں

کرے گا۔ اِس لیے اُنہوں نے راستے کی منازل نہایت سکون و اطمینان سے طے کیں۔ راجہ داہر کو بذاتِ خود اپنے اندازے سے بہت پہلے محمدؐ بن قاسم کے مُقابلے میں صف آرا ہونا پڑا اور دور دراز سے آنے والے بہت کم مددگار وقت پر پہنچ سکے۔

سندھ کی افواج کی شکست اور اس سے زیادہ راجہ داہر کی موت کی غیر متوقّع خبر نے اُن میں سے اکثر کو بددِل کر دیا اور جے سنگھ کی مدد کے لیے برہمن آباد پہنچنے کی بجائے واپس ہونے لگے۔ جے سنگھ ان لوگوں کی مدد کے بھروسے پر ایک اور فیصلہ کُن جنگ لڑنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ چنانچہ اُس نے یہ مشہور کر دیا کہ راجہ داہر مرا نہیں، وہ شکست کھانے کے بعد جنوبی ہند کے راجاؤں کی مدد حاصل کرنے کے لیے جا چکا ہے اور چند دِنوں تک اپنے ساتھ ایک لشکر جرّار لے کر برہمن آباد پہنچ جائے گا۔ جے سنگھ کے ہرکاروں نے مایوس ہو کر لوٹنے والے راجوں اور سرداروں کو یہی خبر سُنائی تو وہ آخری فتح میں حصّہ دار بننے کی اُمّید پر یکّے بعد دیگرے اُس کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے۔

محمدؐ بن قاسم کے پاس یہ خبریں پہنچیں تو اُس نے فوراً پیش قدمی کی۔ جے سنگھ کے جھنڈے تلے قریباً پچاس ہزار سپاہی جمع ہو چکے تھے۔ اِس لیے اُس نے شہر سے باہر نکل کر محمدؐ بن قاسم کا مُقابلہ کیا۔ محمدؐ بن قاسم کی فوج میں بھی سندھ کے عوام کے علاوہ کئی سردار شامل ہو چکے تھے۔ اُن سرداروں کی قیادت بھیم سنگھ کے سپرد تھی۔ برہمن آباد کی دیواروں کے باہر گھمسان کا رَن پڑا۔ جے سنگھ کے راجپوت ساتھی نہایت بہادری کے ساتھ لڑے اور سندھی سپاہی عربوں کے جھنڈے تلے اپنے ہم وطنوں کی ایک بڑی تعداد دیکھ کر بددِل ہو گئے، بھیم سنگھ کے بعض پُرانے ساتھیوں نے اُس کی آواز پر لبیک کہا اور جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی مسلمانوں کی فوج کے ساتھ آ ملے۔ پھر بھی جے سنگھ کو نئے مددگاروں کی فوج کی تعداد پر بھروسہ تھا اور اُس نے بہادری سے مُقابلہ کیا۔ تیسرے پہر سندھی افواج کے پاؤں اُکھڑ گئے اور جے سنگھ بیس ہزار لاشیں میدان میں چھوڑ کر جنوب کی طرف بھاگ نکلا۔

(۲)

برہمن آباد کے شاہی محل کے ایک کمرے میں راجہ داہر کی سب سے چھوٹی اور سب سے زیادہ محبوب رانی سنہری مسند پر رونق افروز تھی۔ رانی کا نام لاڈھی تھا۔ اُس کے خوبصورت چہرے پر حزن و ملال کے آثار تھے۔ چند خادمائیں اور امراءاِرد گرد ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔

پرتاب رائے سر جھکائے آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا کمرے میں داخل ہوا اور رانی کے قریب پہنچ کر آہستہ سے بولا۔ ”مہارانی! جے سنگھ کو شکست ہو چکی ہے اور دُشمن تھوڑی دیر میں شہر پر قبضہ کرنے والا ہے۔ اب ہمارے لیے بھاگ نکلنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ہم سُرنگ کے راستے نکل سکتے ہیں۔“

رانی نے تُرش روئی سے جواب دیا۔ ”شکست کے متعلّق میرے پاس اِطلاع لانے کے لیے محل کی عورتیں کافی تھیں تُم میدان چھوڑ کر کیوں آئے؟“

"مہارانی کی حفاظت میرا فرض تھا۔ اب باتوں کا وقت نہیں۔ چلیے میں نے سُرنگ کے دوسرے سِرے پر گھوڑوں کا انتظام کر دیا ہے۔ آپ کسی خطرے کا سامنا کیے بغیر اَرُوَر پہنچ سکتی ہیں؟"

رانی نے تُنک کر کہا۔ "میں تمہارے جیسے بندوں کی حفاظت میں جان بچانے پر ایک بہادر دُشمن کے ہاتھوں موت کو ترجیح دوں گی!"

پرتاپ رائے نے کھسیانا ہو کر کہا۔ "یہ میرے ساتھ انصاف نہیں۔ میں آپ کا ایک وفادار خادم ہوں۔"

"تمہارے لیے انصاف کا وقت آ چکا ہے۔" یہ کہتے ہوئے رانی مسند سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

پرتاپ رائے نے پریشان ہو کر کہا۔ "مہارانی! آپ کیا کر رہی ہیں؟ میں آپ کی بھلائی کی بات کہتا ہوں!"

رانی نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔ "تُم اِس مُلک کے سب سے بڑے دُشمن ہو۔ سندھ پر مُصیبت تمہاری وجہ سے آئی۔ مہاراج کو عربوں کے

ساتھ جنگ مول لینے کے لیے تُم نے ورغلایا۔ جے رام کو تُم نے ہمارا دُشمن بنایا۔ بھیم سنگھ، اودھے سنگھ جیسے بہادر سپاہی تمہاری وجہ سے دُشمن کے ساتھ جا ملے۔ پچھلی جنگ کے میدان میں سب سے پہلے بھاگنے والے تُم تھے اور اب تم میری جان بچانے کے لیے نہیں، بلکہ اپنی جان کے خوف سے مُجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہو۔ عرب عورتوں پر ہاتھ نہیں ڈالتے۔ اِس لیے ہماری وجہ سے شاید وہ تمہیں بھی چھوڑ دیں۔"

پرتاپ رائے نے کہا۔ "مہارانی! آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ سُنیے! دُشمن قلعے میں داخل ہو رہا ہے۔ اب وہ کوئی دم میں اِدھر آنے والا ہے۔ اگر آپ کو اُس کی قید کی ذِلّت کا خوف نہیں، تو میں جاتا ہوں۔"

پرتاپ رائے نے یہ کہہ کر واپس مُڑنا چاہا لیکن رانی نے آگے بڑھ کر اُس کا راستہ روک لیا اور ایک چمکتا ہوا خنجر دِکھاتے ہوئے کہا۔ "ٹھہرو! ابھی تمہارا فیصلہ نہیں ہوا۔"

پرتاپ رائے نے لوگوں کو ننگی تلواروں کے ساتھ اپنے گرد جمع ہوتے دیکھا تو ایک طرف جِست لگا کر تلوار سونت لی۔ رانی ایک درباری کے

ہاتھ سے تلوار لے کر آگے بڑھی اور بولی۔ ”بُزدل! تمہارے ہاتھ تلوار اُٹھانے کے لیے نہیں، چوڑیاں پہنے کے لیے بنائے گئے ہیں!“

پرتاپ رائے نے ایک زخمی درندے کی طرح رانی پر حملہ کیا لیکن اچانک کترا کر ایک طرف ہو گئی۔ پیشتر اِس کے کہ پرتاپ رائے دوسری بار تلوار اٹھاتا، چار سپاہیوں کی تلواریں اُس کا سینہ چھلنی کر چکی تھیں۔

(۳)

قلعے میں چاروں طرف اللہ اکبر کے نعرے سُنائی دے رہے تھے۔ رانی نے محل کے بالا خانے کے ایک دریچے سے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ قلعے کے دروازے پر سندھ کے پرچم کی بجائے اسلامی پرچم لہرا رہا تھا۔ نیچے کشادہ صحن میں مسلمانوں کی فوج جمع ہو رہی تھی۔ سب سے آگے ایک نوجوان سفید گھوڑے پر سوار تھا اور سندھ کے بے شمار سپاہی ”محمدؐ بن قاسم کی جے“ کے نعرے لگا رہے تھے۔ ایک درباری نے سفید گھوڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”محمدؐ بن قاسم وہ ہے!“

رانی غضب ناک نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ ایک بُوڑھے سردار نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”مہارانی اب بھی بھاگ نکلنے کا وقت ہے!“

رانی نے ایک سپاہی کے ہاتھ سے تیر کمان چھین کر محمدؐ بن قاسم کی طرف نشانہ باندھتے ہوئے کہا۔ ”بھاگنے والے راجوں اور رانیوں کے لیے اس دُنیا میں کوئی جگہ نہیں!“

لیکن اچانک کسی کے پاؤں کی آہٹ سُنائی دی اور رانی کی توجہ تھوڑی دیر کے لیے دائیں ہاتھ ایک دروازے کی طرف مبذول ہو گئی۔ بھیم سنگھ چند سرداروں کے ہمراہ نمودار ہوا۔ رانی نے اُسے دیکھ کر مُنہ پھیر لیا اور دوبارہ محمدؐ بن قاسم کی طرف نشانہ باندھنے لگی۔ نیچے سے چند سپاہیوں نے شور مچایا اور محمدؐ بن قاسم اچانک ایک طرف جھک گیا۔ پیشتر اِس کے کہ بھیم سنگھ بھاگ کر رانی کا ہاتھ روکتا، تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ رانی نے اپنا وار خالی دیکھ کر دوسرا تیر چڑھانے کی کوشش کی لیکن بھیم سنگھ نے آگے بڑھ کر اُس کے ہاتھ سے کمان چھینتے ہوئے کہا۔ ”مہارانی! آپ کیا کر رہی ہیں۔ بھگوان کا شکر ہے کہ تیر چلاتے وقت آپ کے ہاتھ کانپ رہے

تھے، ورنہ آپ ایک فاتح لشکر کے انتقام کا تصوّر نہیں کر سکتیں۔ اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ اُن کے سپہ سالار کی موت اِس فوج کا حوصلہ پست کر سکتی ہے۔ تو آپ غَلطی پر ہیں۔ یہ فوج وہ نہیں جو سپہ سالار کی موت کے بعد میدان چھوڑ کر بھاگ جاتی ہے۔ اُن کا ہر سپاہی سپہ سالار ہے۔"

رانی نے جذبات کی شدّت سے آبدیدہ ہو کر بھیم سنگھ کی طرف دیکھا اور کہا۔ "بھیم سنگھ! اب تُم کیا چاہتے ہو؟ کیا اب تک تُم اپنا بدلہ نہیں لے چکے۔"

بھیم سنگھ نے جواب دیا۔ "میں صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ عرب قیدی کہاں ہیں۔ قید خانے سے صرف سراندیپ کے ملّاح ملے ہیں۔ مُجھے وہاں سے معلوم ہوا ہے کہ عرب قیدی راجہ کی موت کے بعد اِس محل میں لائے گئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے اُن کے ساتھ کوئی بُرا سلوک نہیں کیا ہو گا لیکن مُجھے پہریدار نے بتایا ہے کہ پرتاپ رائے بھی آپ کے پاس ہے اور مُجھے ڈر ہے کہ آپ نے کہیں اُس کے کہنے میں آ کر اُن کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہ کی ہو!"

رانی نے کہا۔ ”فرض کرو اگر میں نے کوئی بد سلوکی کی ہے تو؟“

”مسلمان عورتوں پر ہاتھ نہیں اُٹھاتے۔ لیکن پرتاپ رائے کو وہ شاید قابلِ معافی نہ سمجھیں!“

رانی نے کہا۔ ”اگر میں نے اپنے حکم سے اُنہیں قتل کروادیا ہو تو؟“

بھیم سنگھ نے چونک کر جواب دیا۔ ”تو میں یہ سمجھوں گا کہ سندھ کو ابھی اور بُرے دِن دیکھتے ہیں۔ لیکن مُجھے آپ سے یہ اُمّید نہیں۔ میں محمدّ بن قاسم کو بتا چکا ہوں کہ آپ نے ہمیشہ قیدیوں کے متعلّق مہاراج اور پرتاپ رائے کے خطرناک ارادوں کی مخالفت کی ہے اور وہ اِس کے لیے آپ کے احسان مند رانی نے کُچھ سوچ کر کہا۔ ”اگر میں اِن قیدیوں کو دُشمن کے حوالے کر دوں تو وہ یہاں سے واپس چلا جائے گا؟“

بھیم سنگھ نے جواب دیا۔ ”فاتح لشکر کو کوئی شرط ماننے کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں اُس کے ساتھ مصالحت کے جو مواقع ملے تھے وہ ہم نے طاقت کے نشے میں ضائع کر دیے ہیں اور اب وہ اپنی فتوحات کے سیلاب

کو ہندوستان کی آخری سرحد تک لے جانا چاہتے ہیں!"

"تمہیں یقین ہے کہ وہ ارَوَر پر حملہ کریں گے؟"

"ہاں، وہ شاید دو چار دِن کے اندر اندر ہی ارَوَر کی طرف پیش قدمی کر دیں اور میں اِس لیے بھی آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں کہ ارَوَر کی حفاظت راج کمار ففّی کر رہا ہے اور آپ شاید یہ پسند نہ کریں کہ وہ مسلمانوں کے گھوڑوں کے سُموں کے نیچے کُچلا جائے۔ قیدیوں کو محمدّ بن قاسم کے حوالے کر کے آپ اُس کی جان بخشی کروا سکتی ہیں۔ اُس کے پاس جس قدر سپاہی ہوں گے۔ اُس سے زیادہ سپاہی اب محمدّ بن قاسم کی فوج میں سندھ سے شامل ہو چکے ہیں۔ راجکمار جس قدر بہادر ہے، اُسی قدر ناتجربہ کار ہے۔ وہ عربوں کا مُقابلہ نہیں کر سکتا۔ اُس کی جان صرف اُسی صورت میں بچ سکتی ہے کہ وہ ہتھیار ڈال دے۔ رانی نے پھر تھوڑی دیر تذبذب کے بعد کہا۔ "اور میں نے سُنا ہے کہ عربوں کو دولت کا بہت لالچ ہے، اگر وہ واپس جانے پر رضامند ہوں تو میں اُنہیں برہمن آباد کے علاوہ ارَوَر کا خزانہ بھی دے سکتی ہوں!"

بھیم سنگھ نے جواب دیا۔ ”وہ ایک اصول کے لیے لڑتے ہیں۔ یہاں تجارت کے لیے نہیں آئے!“

”تمہارے دِل میں عربوں کے لیے بہت عزّت ہے۔ اُنہوں نے تُم پر کیا جادُو کیا؟“

بھیم سنگھ نے چند قدم آگے بڑھ کر نیچے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”جادُو؟ اُدھر دیکھیے! اُن کے جادُو نے کس پر اثر نہیں کیا؟“

رانی نے نیچے نگاہ دوڑائی۔ شہر کے سرکردہ سردار اور پروہت محمدّ بن قاسم کے گرد گھیرا ڈال کر اُس کے پاؤں چھُونے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور وہ گھوڑے سے پیچھے کھڑا انہیں ہاتھوں کے اشاروں سے منع کر رہا تھا۔

بھیم سنگھ نے کہا۔ ”مہارانی دیکھا آپ نے! یہ وہ لوگ ہیں جو تھوڑی دیر پہلے اُسے اپنا بدترین دُشمن سمجھتے تھے۔ جب اُس نے ہمارے ملک پر حملہ کیا تھا اُس کے پاس کل دس بارہ ہزار سپاہی تھے اور اب ہمارے اپنے ملک سے تیس چالیس ہزار کے لگ بھگ سپاہی اُس کی فوج میں شامل ہو چکے

ہیں۔ ہمارے پاس جسم کے بچاؤ کے لیے ڈھالیں ہیں لیکن محبّت اور اخلاق سے دِلوں کے قلعے فتح کرنے والے حملہ آور کا کوئی علاج نہیں۔ سندھ کی آئندہ نسلیں محمدّ بن قاسم کو اپنے دُشمن کی بجائے اپنے بہترین دوست کے نام سے یاد کریں گی۔ آپ جانتی ہیں کہ میں بُزدل نہیں۔ میں شکست کھا کر زندہ واپس آنے کی نیّت سے لس بیلا نہیں گیا تھا۔ لیکن کاش! وہ مُجھے اُس وقت اُٹھا کر اپنے سینے سے نہ لگاتا، جب میں زخموں سے چُور تھا۔ اُس نے مُجھے موت کے منہ سے چھینا، میرے زخموں پر مرہم رکھا۔ میری تیمار داری کی اور میں نے محسوس کیا کہ دُنیا کی کوئی طاقت ایسے دُشمن کا مُقابلہ نہیں کر سکتی۔

میں مہاراج کے پاس اِس لیے آیا کہ اُنہیں آگ میں کودنے سے بچا سکوں۔ لیکن میرے اور پِتا جی کے ساتھ وہ سلوک کیا گیا جو مسلمان اپنے دُشمنوں کے ساتھ بھی نہیں کرتے۔ اب بھی میرے دِل میں اپنی قوم کا درد ہے اور میں آپ کے پاس اسی لیے آیا ہوں کہ آپ کے بیٹے کو تباہی سے بچا سکوں۔ اگر قیدی آپ کے قبضے میں ہیں تو اُنہیں میرے حوالے کر

دیجیے۔ وہ آپ کے محل کے دروازے کے سامنے پہنچ چکے ہیں۔ جب اُنہیں یہ معلوم ہوا کہ یہاں آپ ہیں تو انہوں نے حکم دیا کہ کوئی سپاہی محل کے اندر پاؤں نہ رکھے۔"

رانی نے ایک کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

بھیم سنگھ اپنے ساتھیوں کو وہاں ٹھہرنے کا حکم دے کہ رانی کے ساتھ ہو لیا۔ رانی اُسے پہلے اُس کمرے میں لے گئی جہاں پر تاپ رائے کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ جب رانی نے یہ بتایا کہ پر تاپ رائے اُس کی خواہش سے قتل ہوا ہے تو بھیم سنگھ نے کہا۔ "بھگوان کا شکر ہے کہ آپ کو دوست اور دُشمن کی تمیز ہو گئی ہے۔"

رانی نے جواب دیا۔ "میں اِسے شروع سے اپنا دُشمن سمجھتی تھی لیکن کاش مہاراج میری بات مانتے۔ اب اگر تُم عرب قیدیوں کو دیکھنا چاہتے ہو تو وہ کونے کے کمرے میں موجود ہیں۔ مہاراج نے اپنی زندگی میں میرا کہا نہ مانا۔ اُن کی موت کے بعد میں نے قیدیوں کو اپنے پاس مہمان رکھا ہے۔ لیکن یہ مسلمانوں کو خوش کرنے کی نیّت سے نہ تھا بلکہ میں شروع سے یہ

محسوس کر رہی تھی کہ اِن کے ساتھ ظُلم ہوتا ہے۔ پرتاپ رائے نے اُنہیں قتل کرنے کا مشورہ کیا تھا اور اگر اُس کا بس چلتا تو وہ دریغ نہ کرتا!“

بھیم سنگھ نے کہا۔ ”بُزدل ہمیشہ ظالم ہوتے ہیں۔ قیدی اب کیسا محسوس کرتے ہیں؟“

رانی نے جواب دیا۔ ”جہاں تک میرا بس چلا ہے، میں نے اُنہیں کوئی تکلیف نہیں دی۔ چلو تُم دیکھ لو!“ بھیم سنگھ نے کہا۔ ”کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ محمدؐ بن قاسم خود یہاں آکر دیکھ لے اُسے تشویش ہے!“

رانی نے جواب دیا۔ ”جاؤ لے آؤ اُسے!“

(۴)

رانی کی رہنمائی میں محمدؐ بن قاسم، زبیر، خالد، ناہید اور زہرا کے علاوہ چند سالار محل کے کونے کے کشادہ کمرے میں داخل ہوئے۔ علی خالد کو دیکھتے بھاگ کر اُس کے ساتھ لپٹ گیا، رانی اِس سے پہلے خود اپنی شکست اور مسلمانوں کی فتح کا حال سُنا چکی تھی۔ خالد اور زبیر یکّے بعد دیگرے

مردوں سے بغل گیر ہوئے۔ عورتوں نے ناہید کے ساتھ گلے مل کر تشکّر سے آنسو بہائے۔ محمدّ بن قاسم نے بچّوں کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا۔ مردوں سے یکّے بعد دیگرے مصافحہ کیا اور عورتوں کو تسلّی دی اور سب سے آخر میں رانی سے مخاطب ہوا۔ ”نیک دِل خاتون! میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں!“

رانی نے محمدّ بن قاسم کی طرف غور سے دیکھا۔ اُس کی آنکھیں یہ گواہی دے رہی تھیں کہ یہ الفاظ رسمی نہیں۔

محمدّ بن قاسم نے خالد اور زبیر سے کہا۔ ”میرے لیے ابھی بہت سا کام باقی ہے۔ تُم اُنہیں اپنے ساتھ لے کر قیام گاہ میں پہنچ جاؤ؟“

رانی نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا۔ ”یہ لوگ اِس محل میں رہ سکتے ہیں!“

محمدّ بن قاسم نے جواب دیا۔ ”شکریہ! لیکن آپ کو تکلیف ہوگی!“

رانی نے کہا۔ ”اگر میں آپ کی قید میں نہیں تو کل اَرُور چلی جاؤں گی اور یہ سارا محل آپ کے لیے خالی ہوگا!“ محمدّ بن قاسم نے کہا۔ ”آپ کو یہ کیسے

شک ہوا کہ مسلمان مہمان نوازی کا بدلہ یوں دیا کرتے ہیں۔ آپ اگر اَروَر جانا چاہتی ہیں تو میں برہمن آباد کے چند سردار آپ کے ساتھ بھیج سکتا ہوں۔"

رانی نے سر سے پاؤں تک محمدّ بن قاسم کو دیکھا اور کہا۔ "اگر میں اَروَر چلی جاؤں تو کیا وہاں آپ کی افواج میرا تعاقب نہ کریں گی؟"

محمدّ بن قاسم نے کہا: "اَروَر ظُلم کی بادشاہت کا آخری قلعہ ہے اور میں اُسے فتح کرنے کا ارادہ ترک نہیں کر سکتا۔ میں وہاں ایسے قید خانے کا حال سُن چکا ہوں جس میں ابوالحسن جیسے کئی اور قیدی دم توڑ رہے ہیں!"

رانی نے کہا۔ "لیکن ابوالحسن تو فرار ہو چکا ہے اور اَروَر کے قید خانے میں باقی قیدی ہماری رعایا ہیں۔ اُن کے متعلّق سوچنا ہمارا کام ہے۔ اگر آپ کا قانون ہمارے قانون سے اچھّا ہے تو اُسے اپنے ملک میں چلائیے، ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیجیے۔ عربوں کے ساتھ بدسلوکی کی ہمیں کافی سے زیادہ سزا مل چُکی ہے۔"

"لیکن ہم یہ مقصد لے کر اُٹھے ہیں کہ مُلک خُدا کے ہیں اور قانون بھی خُدا کا ہونا چاہیے۔ ہم راجہ اور رعیّت کی تفریق مٹا کر تمام انسانوں کو ایک سطح پر لانا چاہتے ہیں۔ ہم جبر و استبداد کی بجائے عدل و انصاف کی حکومت چاہتے ہیں۔"

رانی نے کہا۔ "لیکن راجہ اور رعیّت کا جھگڑا تو ہندوستان کی ہر سلطنت میں ہے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ جس طرح باقی ہندوستان میں دوسرے انسانوں کا قانون نظر انداز کرتے ہیں اسی طرح اَرُوَر کو بھی اپنی حالت پر چھوڑ دیں!"

محمدؐ بن قاسم نے جواب دیا۔ "آپ کو ہمارے متعلّق غَلَط فہمی ہے۔ اَرُوَر ہماری آخری منزل نہیں۔ میں ہندوستان کی آخری حدود تک اِس انقلاب کا پیغام لے جانا چاہتا ہوں۔ سندھ سب سے پہلے ہماری توجّہ کا مرکز اِس لیے بنا کہ یہاں ستم رسیدہ انسانیت کی دبی ہوئی آواز ہمارے کانوں تک سب سے پہلے پہنچی!"

رانی نے پھر غور سے محمدؐ بن قاسم کی طرف دیکھا اور کہا۔ "تو آپ تمام

ہندوستان کو فتح کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔"

"ہاں! میں تمام ہندوستان پر اسلام کی فتح چاہتا ہوں اور یہ ایک خواب نہیں۔"

رانی نے کہا۔ "یونان سے سکندر بھی یہی ارادے لے کر آیا تھا۔ اور آپ اس سے عُمر میں بہت چھوٹے ہیں!"

"لیکن سکندر بادشاہوں کے مُقابلے میں شہنشاہ بن کر آیا تھا۔ اس کا مقصد لوگوں کو بادشاہوں کی غلامی سے آزادی دلوانا نہ تھا بلکہ اُنہیں اپنا غلام بنانا تھا۔ میں خُدا کی زمین پر انسان کی بادشاہت سے مُنکر ہوں۔ اُسے اپنی طاقت پر بھروسہ تھا۔ مُجھے خدا کی رحمت پر بھروسہ ہے۔ اُسے انسانوں کی مدد کا بھروسہ تھا۔ لیکن مُجھے اللہ کی مدد کا بھروسہ ہے۔ اُس کی سب سے بڑی شکست یہ تھی کہ اُس کے اپنے سپاہی اس سے بگڑ گئے اور میری سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ جو کل تک میرے دشمن تھے، آج میرے ساتھی ہیں اور یہ میری فتح نہیں، اسلام کی صداقت کی فتح ہے۔

رانی نے مایوس ہو کر کہا۔ ”تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اَروَر پر ضرور حملہ کریں گے؟“

”یہ میرا فرض ہے!“

رانی نے مُلتجی ہو کر کہا۔ ”مجُھے معلوم ہے کہ برہمن آباد اور اَروَر کے درمیان کوئی ایسی خندق نہیں جسے آپ پاٹ نہ سکیں لیکن اگر آپ مجُھے کسی نیک سلوک کی مُستحق سمجھتے ہیں تو میرے بیٹے پر رحم کریں۔ وہ آپ کا آخری دم تک ساتھ دے گا۔ آپ مجُھے اَروَر جا کر اُسے سمجھانے کا موقع دیں۔ اُسے جے سنگھ نے یقین دلایا ہے کہ مہاراج مرے نہیں زندہ ہیں۔ میں اُسے یہ بتانا چاہتی ہوں کہ اب مُقابلے سے کوئی فائدہ نہیں، لیکن آپ کو یہ وعدہ کرنا ہو گا کہ ہتھیار ڈالنے کے بعد آپ اُس سے کوئی بد سلوکی نہیں کریں گے۔ وہ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ اگر آپ کو اُس کا سندھ میں رہنا ناگوار ہو تو میں اُسے کہیں دور لے جاؤں گی۔“

محمدؒ بن قاسم نے کہا۔ ”میں وعدہ کرتا ہوں کہ اُس کے ساتھ کوئی بد سلوکی نہ ہو گی بلکہ حق کے مُقابلے میں باطل کی علمبرداری سے دست کش ہو

جانے کے بعد ہم اُسے قابلِ احترام سمجھیں گے۔ آپ کب جانا چاہتی ہیں؟"

"میں علی الصبح روانہ ہو جاؤں گی۔"

(۵)

سندھ کا دارالحکومت اگرچہ اَروَر تھا لیکن برہمن آباد کی سیاسی اور فوجی اہمیّت اِس سے کہیں زیادہ تھی۔ آبادی کے لحاظ سے بھی یہ شہر سندھ کا سب سے بڑا شہر تھا۔ فتح کے بعد محمدؐ بن قاسم نے جو خطوط حجّاج بن یوسف اور خلیفہ ولید کو بھیجے اُن میں اُس نے لکھا کہ سندھ میں قوّتِ مدافعت عملی طور پر ختم ہو چکی ہے۔ اَروَر کے متعلّق مُجھے یقین ہے کہ وہاں کی افواج لڑے بغیر ہتھیار ڈال دیں گی اور اگر اُنہوں نے مزاحمت بھی کی تو یہ معرکہ سندھ کے باقی معرکوں کے مُقابلے میں نہایت غیر اہم ہو گا۔ سندھ کا آخری اور غالباً مضبوط ترین شہر ملتان ہے اور اُس کی مذہبی تقدیس کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے شاید پنجاب کے بعض راجہ بھی مُلتان کے سندھی حاکم کا ساتھ دیں لیکن مُجھے خدا کی مدد پر بھروسہ ہے برہمن آباد کی فتح سے

پہلے محمدؐ بن قاسم کو حجّاج بن یوسف کی ہدایات موصول ہو چکی تھیں کہ وہ دُشمن کی بے جا ناز برداری نہ کرے لیکن محمدّ بن قاسم نے اِن خطوط کے جواب میں اِس بات کی وضاحت کی کہ سندھ کے باشندے ترکستان اور سپین کے باشندوں سے بہت مختلف ہیں۔ وہ مسلمانوں کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں اور نیک سلوک کے بعد اُن سے بغاوت کی توقّع نہیں۔ اِس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ کل تک جو سپاہی ہمارے خلاف شمشیر بکف تھے، آج ہمارے دوش بدوش لڑ رہے ہیں۔

(۶)

رانی لاڈھی برہمن آباد کے چند سرداروں کی معیّت میں اَروَر پہنچی۔ اُس نے اپنے بیٹے کی یہ غَلَط فہمی دور کرنے کی کوشش کی کہ اُس کا باپ زندہ ہے۔ لیکن ففّی کی سوتیلی ماں نے ہتھیار ڈال دینے کی تجویز کی مخالفت کی اور اُسے طعنہ دیا کہ تمہاری ماں ملیچھ دُشمن کی آلہ کار بن چکی ہے۔ اِس کے ساتھ ہی شہر کے پروہت نے یہ مشہور کر دیا کہ رانی لاڈھی مسلمان

سپہ سالار سے ہم کلام ہو کر اپنا دھرم بھرشٹ کر چکی ہے[2]۔ مختلف زبانوں کی حاشیہ آرائی کے ساتھ یہ خبر شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی۔

اَرَوَر کے چند عہدیدار پرتاپ رائے کے رشتہ دار تھے۔ اُن میں سے ایک نے پرتاب رائے کے قتل کا انتقام لینے کے لیے بھرے دربار میں یہ کہہ دیا کہ رانی نے محمدّ بن قاسم کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے پرتاپ کو قتل کیا ہے۔ اُن تمام واقعات نے ففّی کو اپنی ماں کے خلاف غضب ناک کر دیا، اور اُس نے لاڈھی رانی سے کہا۔ ”کاش تُم میری ماں نہ ہوتیں۔“

[2] اِس واقعہ کی آڑلے کر بعض تاریخ دان یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ لاڈھی دیوی قبولِ اسلام کے بعد محمدّ بن قاسم سے شادی کر چکی تھی۔ اور اُس کا اسلامی نام عائشہ تھا لیکن یہ داستان زیادہ تر اُن تاریخ دانوں کی جدّتِ طبع کا نتیجہ ہے جو ہر بڑے آدمی کے ساتھ عشق کی ایک داستان منسوب کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس طرح کی ایک داستان بھی محمدّ بن قاسم کے ساتھ منسوب کی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ محمدّ بن قاسم نے اَرَوَر کی فتح کے بعد راجہ داہر کی دو لڑکیاں خلیفہ ولید کے پاس بھیج دی تھیں اور ایک لڑکی نے اپنے باپ کی موت کا انتقام لینے کی نیّت سے ولید کو محمدّ بن قاسم کے خلاف یہ کہہ کر مُشتعل کر دیا تھا کہ نعوذ باللہ محمدّ بن قاسم اُسے دربارِ خلافت میں بھیجنے سے پہلے اُس کے دامنِ عصمت پر دھبّہ لگا چکا ہے اور ولید نے غضب ناک ہو کر محمدّ بن قاسم کو قتل کروا دیا اور اُس کے بعد جب اُس لڑکی نے یہ بتایا کہ اُس نے محض انتقام لینے کے لیے یہ قصّہ تراشا تھا تو ولید نے اُسے بھی قتل کروا دیا۔ پہلا قصّہ یُوں بھی غَلَط ثابت ہوتا ہے کہ لاڈھی دیوی قبول اسلام کے بعد مسلمانوں کی پناہ میں آچکی تھی اور امیرِ عساکر کی بیوی ہونے کی حیثیت میں اُس کا منصب ہرگز ایسا نہ تھا کہ وہ اَرَوَر میں سفیر بن کر جاتی اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اُس کے دِل میں اپنے بیٹے کے لیے بہت بڑی تڑپ تھی۔ تو یہ کیسے مُمکن ہو سکتا ہے کہ ایک ایسا نوجوان جو سترہ سال کی عمر میں ہندوستان فتح کرنے کا عزم رکھتا تھا۔ اَرَوَر کی ادنیٰ سی مہم سے کترا کر اپنی نو مسلم بیوی کو اَرَوَر کے بھرے دربار میں بھیج دیتا۔ خصوصاً ان حالات میں جب کہ اَرَوَر کی رائے عامہ اُس کے قبولِ اسلام پر سخت مشتعل ہو سکتی تھی۔

دوسرے قصّے کے راوی وہ تاریخ دان ہیں جنہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ خلیفہ ولید محمدّ بن قاسم سے پہلے راہی مُلکِ عدم ہو چکا تھا۔

رانی کو اپنے اکلوتے بیٹے سے یہ توقّع تھی۔ یہ الفاظ ایک نشتر کی طرح اُس کے سینے میں اُتر گئے۔ اُس نے یکّے بعد دیگرے اپنے بیٹے، اپنی سوکن اور حاضرینِ دربار کی طرف دیکھا اور کانپتی ہوئی آواز میں چِلاّئی:

"بیٹا! شرم کرو۔ میں تمہاری ماں ہوں۔ اگر اِن لوگوں کی مدد سے مُجھے تمہاری کامیابی کی ذرا بھی اُمّید ہوتی تو میں تمہیں بصرہ تک دُشمن کا تعاقب کرنے کا مشورہ دیتی لیکن یہ لوگ کمینے بھی ہیں اور بُزدل بھی جو تمہارے باپ کے ساتھ وفا نہ کرسکے، وہ تمہارے ساتھ وفا نہیں کریں گے۔ جو دُشمن لاکھوں سپاہیوں کو شکست دے چکا ہے۔ اُس کے سامنے تمہارے دس بیس ہزار سپاہی نہیں ٹھہر سکتے۔ سندھ کی آدھی فوج اُس کے ساتھ مل چکی ہے۔ میں اپنی آنکھوں سے اِن سے زیادہ غیّور سرداروں کو مسلمانوں کے سپہ سالار کے پاؤں پر ہاتھ رکھتے دیکھ چکی ہوں۔ تمہاری خیر اِسی میں ہے کہ تُم ہار مان لو۔ ورنہ یاد رکھو یہ لوگ عین موقع پر تمہیں دھوکا دیں گے۔ اُس وقت زیادہ جوش وہ دِکھا رہے ہیں جنہیں ابھی تک دُشمن کے سامنے آنے کا موقع نہیں ملا۔"

ففّی نے جوش میں آ کر کہا۔ ”ماتا خاموش رہو۔ میرے ساتھی مرتے دم تک میرا ساتھ دیں گے۔“

”تو بیٹا یاد رکھو! اِس جنگ میں اُنہیں موت کے سوا کُچھ حاصل نہ ہو گا!“

ایک ماہ کے بعد محمدّ بن قاسم برہمن آباد کے انتظامات سے فارغ ہو کر اَرُوَر کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔ ففّی کو یہ معلوم ہوا کہ مرتے دم تک اس کا ساتھ دینے کا دعویٰ کرنے والے سرداروں کے متعلّق رانی کا اندازہ صحیح تھا۔

محمدّ بن قاسم کی فوج نے ابھی نصف راستہ طے کیا تھا کہ ایک صُبح ففّی کو معلوم ہوا کہ اُس کے چند سردار پانچ ہزار سپاہیوں کے ہمراہ راتوں رات شہر چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔

جب محمدّ بن قاسم کی فوج اَرُوَر سے فقط ایک منزل کے فاصلے پر تھی۔ اَرُوَر سے اور تین ہزار سپاہی رات کے وقت شہر کے دروازے بند پا کر سیڑھیوں کی مدد سے فصیل سے اُتر گئے۔ ففّی کا دِل ٹوٹ گیا اور اُس نے

رہی سہی فوج کے ساتھ راہِ فرار اختیار کی۔

محمدؒ بن قاسم نے ایک نو مسلم سندھی سردار کو شہر کا حاکم مقرّر کیا اور چند دِن کی تیّاری کے بعد مُلتان کی طرف پیش قدمی کی۔

اُن کا دیوتا

ملتان کے محاصرہ کے دوران میں محمدّ بن قاسم کو حجّاج بن یوسف کی وفات کی خبر ملی۔ اُس کے ساتھ ہی اُسے اپنی بیوی کا مکتوب ملا جس میں اُس نے اپنے باپ کی موت کا ذکر کرنے کے بعد محمدّ بن قاسم کی ماں کے متعلّق لکھا کہ اُن کی صحت پھر خراب ہو گئی ہے۔ لیکن اُن کی یہ خواہش ہے کہ آپ ہندوستان میں اپنا کام ختم کیے بغیر گھر آنے کا اِرادہ نہ کریں۔ زبیدہ نے اپنے متعلّق لکھا۔ ”میں اُن ہزاروں بیویوں سے مختلف نہیں جن کے شوہر سندھ، ترکستان اور اَندلُس میں برسرِ پیکار ہیں اور سندھ کے سپہ سالار کی بیوی ہوتے ہوئے میرا یہ فرض ہے کہ میں آپ کی جُدائی کو عام

سپاہیوں کی بیویوں کی نسبت زیادہ صبر و سکون کے ساتھ برداشت کروں، آپ نے لکھا تھا کہ ملتان کی فتح کے بعد ہمیں اپنے پاس بُلوا لیں گے لیکن والدہ کی صحت شاید آئندہ چند مہینے اُنہیں سفر کی اجازت نہ دے۔ مُجھے ڈر ہے کہ گھر کے متعلّق آپ کی تشویش، آپ کی فتوحات کی رفتار پر اثر انداز نہ ہو۔ انتہائی تکلیف کے وقت آپ کی فتح کی خبر سُن کر اُن کے چہرے پر رونق آ جاتی ہے۔ جب کبھی اُن کا جی اُداس ہوتا ہے تو میں اُن کے منہ سے یہ دُعا سُنتی ہوں۔ ”یا اللہ! مُجھے قرونِ اولیٰ کے مجاہدین کی ماؤں کا صبر و استقلال دے۔“ اور جب کبھی وہ مُجھے غمگین دیکھتی ہیں تو یہ کہتی ہیں کہ زبیدہ! تُم ایک مجاہد کی بیوی ہو، ناہید اور زہرا کو میرا سلام پہنچا دیجیے۔ مُجھے اُن بہنوں پہ رشک آتا ہے جو ہر روز سندھ کے میدانوں میں مجاہدوں کے گھوڑوں سے اُڑنے والی گرد دیکھتی ہیں۔ بصرہ میں ان عورتوں اور بچّوں کا انتظار ہو رہا ہے۔ جنہیں آپ نے برہمن آباد کے قید خانے سے آزاد کروایا ہے۔ اُنہیں کب بھیجیں گے؟ میں اِس سے زیادہ اور کیا دُعا کر سکتی ہوں کہ آپ کا ہر قدم بُلندی کی طرف ہو اور میری نگاہ کا ہر آسمان آپ کے سمندِ اقبال کے پاؤں چومے۔“

چند دِن کی مزاحمت کے بعد ملتان کے باشندوں نے ہتھیار ڈال دیے اور محمدّ بن قاسم، امیر داؤد نصر کو ملتان کا امیرِ اعلیٰ مقرّر کر کے اَروَر کی طرف واپس ہوا۔ راستے میں اُسے خبر ملی[3] کہ قنوج کا راجہ ہری چندر راج کمار جے سنگھ کو پناہ دے کر سندھ پر حملے کی تیّاری کر رہا ہے۔ یہ خبر سُنتے ہی محمدّ بن قاسم یلغار کرتا ہوا اَروَر پہنچا اور وہاں قیام کیے بغیر قنوج پر چڑھائی کر دی۔ سندھ اور راجپوتانہ کی سرحد پر دونوں افواج کا سامنا ہوا۔ راجہ ہری چندر جے سنگھ کی زبانی یہ سُن کر اس کی اعانت کے لیے آمادہ ہوا تھا کہ بیرونی حملہ آوروں کی تعداد دس ہزار سے زیادہ نہیں لیکن جب اُس نے اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا کہ محمدّ بن قاسم کی جے کے نعرے لگانے والے سندھی، عربوں سے کہیں زیادہ ہیں تو وہ جے سنگھ کو کوستا ہوا میدان چھوڑ کر واپس بھاگ گیا۔ جے سنگھ کے بعض ساتھیوں نے اُسے محمدّ بن قاسم کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھانے کا مشورہ دیا لیکن اس نے چاروں طرف سے مایوس ہو کر بھی مشورہ قبول نہ کیا اور جنوب کی طرف راہِ فرار اختیار کی۔ صرف دو سرداروں نے اُس کا ساتھ دیا اور باقی محمدّ بن قاسم کی پناہ

[3] یہ قنوج جنوبی ہند کا مشہور شہر نہیں بلکہ موجودہ، اودھے پور کے قریب اُس زمانے کی ایک طاقتور ریاست کا دارالحکومت تھا۔

میں چلے آئے۔

اِس کے بعد محمدؐ بن قاسم سندھ کے انتظامات درست کرنے اور سندھ کی ہمسایہ ریاستوں پر چڑھائی کرنے سے پہلے اپنی افواج کو از سرِ نو منظّم کرنے کے لیے اَرور واپس چلا گیا۔ بصرہ سے ایک قاصد اُس کی آمد سے ایک دِن پہلے اَرور پہنچ چکا تھا۔ اُس نے محمدؐ بن قاسم کو دیکھتے ہی کہا۔ ”سالارِ اعظم! میں ایک بہت بُری خبر لایا ہوں!“

محمدؐ بن قاسم کے پُر سکون چہرے پر تفکّرات کے ہلکے سے آثار پیدا ہوئے اور اُس نے اپنے ہونٹوں پر ایک مغموم مُسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ ”یہ خبر میری ماں کے متعلّق تو نہیں؟“

ایلچی نے اثبات میں سر ہلایا اور جیب سے خط نکال کر محمدؐ بن قاسم کے ہاتھ میں دے دیا۔ محمدؐ بن قاسم نے جلدی سے خط کھول کر پڑھا اور ”اناللہ وانا الیہ راجعون“ کہہ کر گردن جھکالی۔

شام کے وقت شاہی محل کے اس حصّے میں جسے محمدؐ بن قاسم نے اپنے قیام

کے لیے مُنتخب کیا تھا، شہر کے معزّزین کے علاوہ کئی بیوائیں جمع تھیں، جن کی نگاہوں میں فاتح سندھ ایک نیک دِل بھائی اور ایک رحم دل باپ کا رُتبہ حاصل کر چکا تھا جو اُسے اِس دیوتاؤں کی سر زمین پر ایک نیا دیوتا خیال کرتے تھے۔

محمدؒ بن قاسم نے محل سے باہر نکل کر ایک مختصر سی تقریر میں اُن کا شکریہ ادا کیا۔ رات کے وقت اُس نے مشعل کی روشنی میں پھر ایک بار زبیدہ کا مکتوب پڑھا اور اُس کی نگاہیں دیر تک اُن الفاظ پر مرکوز رہیں۔ بسترِ مرگ پر امّی جان کے آخری الفاظ یہ تھے۔ "میری روح جسم کی قید سے آزاد ہو کر اِن میدانوں پر پرواز کر سکے گی جہاں میرا بیٹا اسلام کی فتوحات کے جھنڈے نصب کر رہا ہے۔"

(۲)

تین ماہ کے بعد محمدؒ بن قاسم عرب سپاہیوں کے علاوہ ایک لاکھ سندھی نو مسلم اور اُن غیر مسلم سپاہیوں کو فوجی تربیت دے چکا تھا جو اسلام قبول نہ کرنے کے باوجود باقی تمام ہندوستان کی آخری حدود تک اُس کم سن سالار

کی فتوحات کے پرچم لہرانا انسانیت کی سب سے بڑی خدمت سمجھتے تھے۔ جس کے عدل و انصاف نے اُسے مفتوحہ علاقے کے ہر باشندے کی نگاہ میں ایک دیوتا بنا دیا تھا۔ وہ اُسے اپنا نجات دہندہ سمجھتے تھے اور باقی ہندوستان کے لیے ایسے نجات دہندہ کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔

ایک دِن اَرور کے ایک مشہور سنگ تراش نے شہر کے ایک چوراہے میں اپنا شاہکار نمائش کے لیے رکھ دیا۔ یہ سنگِ مرمر کی ایک مورتی تھی جس کے نیچے یہ الفاظ کندہ تھے "وہ دیوتا جس نے اِس مُلک میں عدل اور مساوات کی حکومت قائم کی۔"

شہر کے ہزاروں باشندے اِس مورتی کے گرد جمع ہو گئے اور مورتی کو پاؤں سے لے کر سر تک پھولوں میں ڈھانپ دیا۔ اَرور کے بہت سے سردار اُس مورتی کو اپنے گھر کی زینت بنانے کے لیے سنگ تراش کو منہ مانگے دام دینے کے لیے تیّار تھے لیکن شہر کے پروہتوں کا یہ متفقہ فیصلہ تھا کہ محمدؐ بن قاسم جیسے دیوتا کی مورتی کا مقام سرداروں کے محل نہیں بلکہ ہمارے مندر ہیں۔ سنگ تراش نے بھی اپنے شاہکار کی اہمیّت محسوس

کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ اُسے کسی مندر میں جگہ دی جائے۔ پروہتوں نے اُس کے لیے بُدھ کا ایک پُرانا مندر منتخب کیا۔

شام کے وقت مورتی کو مندر کی طرف لے جاتے ہوئے شہر کے پروہتوں اور عوام کا جلوس شاہی محل کے سامنے سے گزرا۔ بھیم سنگھ نے بھاگ کر محمدّ بن قاسم کو اطلاع دی کہ لوگ آپ کی مورتی کو مندر میں نصب کرنے کے لیے جا رہے ہیں۔

محمدّ بن قاسم پریشان ہو کر محل سے باہر نکلا۔ جلوس اُسے محل کے دروازے کی سیڑھیوں پر کھڑا دیکھ کر رُک گیا۔ شہر کے بڑے پروہت نے آگے بڑھ کر کہا۔

”یہ لوگ آپ کی اِس سے زیادہ عزّت نہیں کرسکتے۔ یہ ایک سنگ تراش کا کمال ہے۔ لیکن آپ کی تصویر جو اِن کے دِلوں میں ہے، اِس مورتی سے کہیں زیادہ حسین ہے۔“

محمدّ بن قاسم نے بُلند آواز میں ہجوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”ٹھہرو!

میں تُم سے کُچھ کہنا چاہتا ہوں!"

ناقوس اور شہنائیوں کی صدائیں بند ہو گئیں اور مجمع پر ایک سکوت طاری ہو گیا۔ محمدّ بن قاسم نے اپنی تقریر میں اصنام پرستی کے متعلّق اسلام کے نقطۂ نگاہ کی وضاحت کی اور اختتام پر عوام سے یہ اپیل کی:

"مجھے گنہگار نہ کرو۔ مُجھ میں اگر کوئی خوبی ہے، تو وہ اسلام کی عطا کی ہوئی ہے۔ اگر اسلام کا پیرو کار ہو کر میں انسانیت کی کوئی اچھّی مثال بن سکتا ہوں تو یہ دروازہ سب کے لیے کھلا ہے۔ تُم میری پوجا نہ کرو بلکہ اُس کی پوجا کرو جس نے مُجھے بنایا ہے، جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ جس کا دین ہر انسان کو عدل و مساوات اور حریّت کا سبق دیتا ہے!" لوگ جذبات سے مغلوب تھے لیکن مورتی کے مُقابلے میں وہ جیتے جاگتے دیوتا کے حکم کی تکمیل سے انکار نہ کر سکے۔ جب محمدّ بن قاسم نے یہ کہا کہ "مُجھے یہ سب کُچھ دیکھ کر روحانی تکلیف ہوئی ہے۔" تو سنگ تراش نے آگے بڑھتے ہوئے ہاتھ باندھ کر کہا۔ "ایک سنگ تراش صرف مورتی بنا کر اپنے جذبات کا اظہار کر سکتا ہے۔ میں نے دیوتاؤں کے نام سُنے تھے اور اُن کی

مختلف خیالی تصویریں بنایا کرتا تھا۔ مگر اب آپ کو دیکھنے کے بعد مُجھے یقین ہو چکا ہے کہ میں خواہ کسی دیوتا کی تصویر بناؤں اُس کی شکل وصورت وہی ہو گی جو آپ کی ہے۔ میرا بیٹا لس بیلا کی جنگ میں زخمی ہوا تھا۔ آپ نے دوسرے زخمیوں کی طرح اُس کی بھی تیمار داری کی اور اُس کے زخم اچھّے ہو گئے لیکن یہاں پہنچ کر وہ بیمار ہو گیا اور چند دِن کے بعد چل بسا۔ مرتے وقت وہ آپ کے اُس رومال کو چُوم رہا تھا جو آپ نے اس کے زخم پر باندھا تھا۔ اُس نے مُجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں اُس کی مورتی بناؤں گا لیکن آپ کو برہم دیکھ کہ شاید اُس کی آتما کو بھی دُکھ ہو۔ میں اپنے بیٹے کے دیوتا کی پوجا کرنے کی بجائے اُس کا حکم ماننا ضروری سمجھتا ہوں۔ اگر آپ کا حکم ہے تو میں یہ مورتی توڑنے کے لیے تیّار ہوں!“

محمدؐ بن قاسم نے جواب دیا۔ ”یہ آپ کا مُجھ پر بڑا احسان ہو گا!“

”احسان؟ یوں نہ کہیے۔ اِس مورتی کے ٹوٹ جانے کے بعد بھی میں آپ کو ایک دیوتا ہی سمجھوں گا اور سندھ کے لاکھوں انسان بھی آپ کو دیوتا ہی خیال کریں گے۔“

محمدّ بن قاسم نے کہا۔ ”لیکن میری تمنّا فقط یہ ہے کہ میں اِس ملک میں انسانیت کا ایک خادم ہونے کی حیثیت میں پہچانا جاؤں۔“

سنگ تراش نے سینے پر پتھّر رکھ کر تیشے کی ایک ضرب سے مورتی کے ٹکڑے اُڑا دیے لیکن ہجوم اِن ٹکڑوں کو جواہرات کا انبار سمجھ کر اُن پر ٹُوٹ پڑا۔

اِس واقعے کے بعد اَروَر کے ہزاروں باشندے اسلام کی تعلیم کے ساتھ دِلچسپی لینے لگے اور سندھ کے طول و عرض میں نو مُسلموں کی تعداد میں آئے دِن اضافہ ہونے لگا۔

(۳)

اَروَر سے چند سالار رُخصت پر جارہے تھے۔ اُن کا اِرادہ تھا کہ واپسی پر اپنے بال بچّوں کو ساتھ لاکر مُستقل طور پر سندھ میں آباد ہو جائیں۔

محمدّ بن قاسم نے زبیدہ کو لکھا کہ وہ بصرہ سے سندھ آنے والی خواتین کے ساتھ چلی آئے اور بصرہ کے حاکم کو بھی لکھا کہ اُسے باقی عورتوں کے

ساتھ سپاہیوں کی حفاظت میں اَرور تک پہنچانے کا انتظام کرے۔ اِس کے بعد وہ چند دِن راجپوتانہ اور پنجاب کی تسخیر کے لیے نقشے بنانے میں مصروف رہا۔ چند دِن کے غور و خوض کے بعد اُس نے پنجاب سے پہلے راجپوتانہ کو مسخّر کرنا ضروری خیال کیا، اُس کا ارادہ تھا کہ زبیدہ کی آمد تک راجپوتانہ کی مہم سے فارغ ہو جائے اور اِس کے بعد ملتان کو اپنا مستقر بنا کر پنجاب کا رُخ کرے۔ چنانچہ اُس نے بصرہ جانے والے سپاہیوں کے رُخصت ہونے کے سات دِن بعد ایک شام شہر سے باہر فوجی مستقر میں اپنی فوج کے سامنے مختصر سی تقریر کرنے کے بعد اُنہیں یہ حکم دیا کہ وہ علی الصبح کُوچ کے لیے تیّار رہیں۔

لیکن ایک مغربی مؤرّخ کے قول کے مطابق محمدّ بن قاسم کا آفتابِ اقبال عین دوپہر کے وقت غروب ہو رہا تھا۔ صُبح کی نماز کے بعد جب اَرور کے باشندے پڑاؤ میں جمع ہو کر محمدّ بن قاسم کو الوداع کہہ رہے تھے اور عورتیں آگے بڑھ بڑھ کر سپاہیوں کے گلوں میں پھولوں کے ہار ڈال رہی تھیں۔ اچانک ایک طرف سے اُڑتی ہوئی گرد دِکھائی دی اور آن کی آن

میں پچاس مسلّح عرب نمودار ہوئے۔ محمدؐ بن قاسم ایک سفید گھوڑے پر سوار فوج کی صفوں میں چکّر لگا رہا تھا۔ دور سے آنے والے سواروں کی رفتار دیکھ کر اُس کا ماتھا ٹھنکا اور وہ اپنے چند سالاروں کے ساتھ ایک طرف ہو کر آنے والے سواروں کی راہ تکنے لگا۔

اِن سواروں کے ہمراہ محمدؐ بن قاسم کے وہ سالار بھی تھے جو ایک ہفتہ پہلے بصرہ کے لیے رُخصت پر روانہ ہوئے تھے۔ ایک سوار نے آگے بڑھ کر محمدؐ بن قاسم کو ایک خط پیش کرتے ہوئے کہا: ”یہ امیر المومنین سلیمان بن عبد الملک کا مکتوب ہے۔“

محمدؐ بن قاسم نے چونک کر کہا۔ ”امیر المومنین۔۔۔۔ سلیمان۔۔۔۔؟“

اُس نے جواب دیا۔ ”ہاں! خلیفہ ولید وفات پا چکے ہیں۔“

محمدؐ بن قاسم نے انا اللہ و انا الیہ راجعون کہہ کر جلدی سے خط کھول کر پڑھا اور کُچھ دیر گردن جھکا کر سوچنے کے بعد قاصد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجُھے سلیمان سے یہی توقع تھی۔ یزید بن ابو کبشہ کون ہیں؟“

ایک ادھیڑ عمر آدمی نے گھوڑا آگے کیا۔ ”میں ہوں!“

محمدّ بن قاسم نے اپنا گھوڑا آگے بڑھا کر یزید بن ابو کبشہ سے مصافحہ کیا اور کہا۔ ”آپ کو اِس فوج کی قیادت مبارک ہو۔ میں امیر المومنین کی بیڑیاں پہننے کے لیے حاضر ہوں!“

یزید بن ابو کبشہ، محمدّ بن قاسم کی مغموم مُسکراہٹ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اُس نے پڑاؤ میں اُن بے شمار سپاہیوں کی طرف دیکھا جو کوچ کے لیے امیرِ عساکر کے حُکم کے مُنتظر تھے۔ پھر اُن سالاروں کی طرف دیکھا جو ولید کی موت اور سلیمان کی مسند نشینی کی خبر سُن کر محمدّ بن قاسم کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ یزید بن ابو کبشہ نے محسوس کیا کہ وہ خود ایک لاکھ جانبازوں کے قائد کے سامنے ایک مُجرم کی حیثیت میں کھڑا ہے۔ محمدّ بن قاسم کے یہ الفاظ کہ ”میں امیر المومنین کی بیڑیاں پہننے کے لیے حاضر ہوں؟“ اس کے کانوں میں بار بار گونج رہے تھے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ قُدرت نے اُس کے کندھوں پر زمین آسمان کا بوجھ لاد دیا ہے۔ محمدّ بن قاسم کی طرف اُس کی نگاہیں کئی بار اُٹھ اٹھ کر جھکیں اور جھک جھک کر

اُٹھیں۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ اُن سب کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ کئی بار الفاظ اُس کی زبان تک آ آ کر رُک گئے۔ بالآخر اُس نے کہا۔ ”میرے دوست! قُدرت نے یہ خفّت میرے حصّے میں لکھی تھی۔“

محمدّ بن قاسم نے جواب دیا۔ ”آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ فقط ایلچی ہیں۔ خالد! اُنہیں محل میں لے چلو اور زبیر تم سپاہیوں کو حکم دو کہ ہم نے آج کوچ کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔“

بھیم سنگھ نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”اگر اِس خط میں کوئی راز کی بات نہ ہو تو ہم سب یہ جاننے کے لیے بے قرار ہیں کہ دربارِ خلافت سے آپ کو کیا حکم ملا ہے؟“

محمدّ بن قاسم نے خط محمدّ بن ہارون کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا: ”یہ آپ کو پڑھ کر سُنا دیں گے۔“

(۴)

شام کے وقت اَروَر کے ہر گلی کوچے میں کہرام مچا ہوا تھا۔ حجّاج بن یوسف کے خاندان کے ساتھ مسلمان کی پرانی دُشمنی کی خبر مشہور ہو چکی تھی۔ ہر گھر میں سندھ کے نئے گورنر کی آمد اور محمدؒ بن قاسم کی روانگی کا ذکر ہو رہا تھا۔ شہر کے ہزاروں مرد، عورتیں اور بچّے شاہی محل کے گرد جمع ہو کر شور مچا رہے تھے۔

نمازِ مغرب کے بعد محمدؒ بن قاسم کی فوج کے تمام عہدیدار محل کے ایک وسیع کرنے میں جمع ہوئے۔ محمدؒ بن قاسم کو اس کی مرضی کے خلاف اس اجتماع میں شریک ہونے پر مجبور کیا گیا۔ اُس نے ایک مختصر سی تقریر میں کہا:

”میں صُبح دمشق روانہ ہو جانے کا فیصلہ کر چکا ہوں اور اُس فیصلے پر نظر ثانی کرنے کے لیے تیّار نہیں۔ ایک سپاہی کا سب سے پہلا فرض اطاعتِ امیر ہے۔ آپ اِس حادثے سے پریشان نہ ہوں اور اپنے نئے حاکم کے ساتھ پورا پورا تعاون کریں۔ امیر المومنین سلیمان غالباً یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ

میرے دِل میں اطاعتِ امیر کا جذبہ ہے یا نہیں۔ دمشق سے روانگی کے وقت وہ مُجھ سے بد ظن ہو گئے تھے۔ لیکن یہ وہ زمانہ تھا، جب اُن پر کسی ذمّہ داری کا بوجھ نہ تھا۔ اب وہ امیر المومنین ہیں اور مُجھے یقین ہے کہ اُن کے مزاج میں تبدیلی آچکی ہو گی۔ بہت مُمکن ہے کہ وہ مُجھے ہندوستان میں اپنا ادھورا کام پورا کرنے کے لیے بھیج دیں۔ لیکن اگر میں اُن کی غَلَط فہمی دور نہ کر سکا اور مُجھے دوبارہ یہاں آنے کا موقع نہ دیا گیا تو بھی یزید بن ابو کبشہ کی اطاعت تمہارا فرض ہو گا!"

بھیم سنگھ نے کہا۔ "آپ جو حکم دیں ہم ماننے کے لیے تیّار ہیں لیکن سندھ کے تمام سرداروں کی رائے یہ ہے کہ آپ اُس وقت تک یہاں سے نہ جائیں جب تک کہ آپ کو خلیفہ کی نیک نیّتی کا یقین نہ ہو جائے۔ میں زبیر سے دمشق کے واقعات سُن چکا ہوں اور میرا دِل گواہی دیتا ہے کہ سلیمان آپ کے ساتھ بہت بُرا سلوک کرے گا۔ ہم آپ کو سلیمان کی رعیّت نہیں سمجھتے بلکہ اپنے دِلوں کا بادشاہ سمجھتے ہیں۔ ہم آپ کے اشارے پر آگ میں کود سکتے ہیں لیکن یہ گوارہ نہیں کر سکتے کہ ہماری آنکھوں کے

سامنے آپ کو بیڑیاں پہنائی جائیں۔ آپ کے عرب ساتھیوں کے دِلوں میں دربارِ خلافت کا احترام ہو تو ہو لیکن ہم ایسے خلیفہ کا احترام کرنے کے لیے تیّار نہیں جو سندھ کو اُس کے محسن اعظم سے محروم کرنا چاہتا ہے۔ ہم زندگی اور موت میں آپ کا ساتھ دینے کا عہد کر چکے ہیں اور یہ عہد ٹوٹنے والا نہیں۔ آپ سندھ میں رہیں۔ سندھ کو آپ کی ضرورت ہے۔ آپ کے عرب ساتھی اگر آپ کا ساتھ چھوڑ بھی دیں تو بھی ہماری ایک لاکھ تلواریں آپ کی حفاظت کے لیے موجود ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ سندھ کا ہر بچّہ اور بُوڑھا خطرے کے وقت آپ پر جان قربان کرنے کو تیّار ہو گا۔ بھگوان کے لیے آپ نہ جائیں اور کم از کم اُس وقت تک نہ جائیں جب تک ہمیں یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ سلیمان آپ کے ساتھ بد سلوکی نہیں کرے گا۔ اگر میرے الفاظ آپ پر اثر نہیں کرتے تو آپ اِس محل کے نیچے جھانک کر دیکھیں اور پھر فیصلہ کریں کہ وہ ہزاروں یتیم جو آپ کو اپنا باپ سمجھتے ہیں، وہ ہزاروں بُوڑھے جو آپ کو اپنا بیٹا سمجھتے ہیں اور وہ بیوائیں جو آپ کو اپنا بھائی سمجھتی ہیں، آپ پر کوئی حق رکھتے ہیں یا نہیں۔“

اختتام پر بھیم سنگھ کی آواز بھرّا گئی۔ حاضرین ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

زبیر نے کہا۔ ”آپ اچھّی طرح جانتے ہیں کہ سلیمان آپ کے ساتھ نیک سلوک نہیں کرے گا۔ آپ یہیں ٹھہریں اور مُجھے امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع دیں۔ میری جان اِس قدر قیمتی نہیں لیکن سندھ اور عالمِ اسلام کو آپ کی ضرورت ہے۔“

محمدّ بن قاسم نے جواب دیا۔ ”میں اپنے ہر سپاہی کی جان کو اپنی جان سے زیادہ قیمتی سمجھتا ہوں اور بھیم سنگھ! تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں لیکن تُم میری ذات کو میرے مقصد سے زیادہ اہمیّت دے رہے ہو۔ تُم نہیں جانتے کہ دربارِ خلافت سے میری بغاوت دراصل اس عظیم الشّان مقصد سے بغاوت ہو گی جس کے لیے گزشتہ ایک صدی میں لاکھوں سرفروش اپنا خون بہا چکے ہیں۔ یہ ایک لاکھ انسان تمام ہندوستان کو فتح کرنے کے لیے کافی ہیں اور میری جان اِس قدر اہم نہیں کہ میں سندھ کی ایک لاکھ تلواروں کو عالمِ اسلام کی

ایک لاکھ تلواروں سے ٹکرانے کی اجازت دے دوں۔ ایسی بغاوت میں میری فتح بھی مسلمانوں کی بدترین شکست کے مترادف ہو گی۔ کیا میں یہ گوارا کر سکتا ہوں کہ اِس وقت تُرکستان اور اَندلُس میں ہماری جو افواج مصروفِ جہاد ہیں وہ صرف اِس لیے واپس بُلا لی جائیں کہ سندھ کے سپہ سالار نے اپنی جان کے خوف سے عالمِ اسلام کے خلاف بغاوت کر دی ہے۔ اگر یہ سوال میری اور سلیمان کی ذات تک محدود ہوتا تو شاید میں اُس کے سامنے ہتھیار نہ ڈالتا۔ لیکن میں اِس قوم کے سامنے ہتھیار ڈال رہا ہوں تو سلیمان کو اپنا خلیفہ تسلیم کر چکی ہے۔ اگر میری موت مسلمانوں کو اتنے بڑے انتشار سے بچا سکے تو میں اِسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔ تُم یہ کہہ چُکے ہو کہ تُم میرے اشارے پر جان قربان کرنے کے لیے تیّار ہو۔ میں تم سے کوئی قربانی طلب کرنے کا حق دار نہیں لیکن اگر تُم چاہتے ہو کہ سندھ سے رُخصت ہوتے وقت میرے دِل پر کوئی بوجھ نہ ہو اور میں اپنے دِل میں یہ اطمینان لے کر جاؤں کہ سندھ میں میرا کوئی کام ادھورا نہ تھا۔ تم جو دین عملاً قبول کر چکے ہو اِس کا زبان سے بھی اعلان کر دو۔، میری یہ دعوت اپنے ان تمام احباب کے لیے ہے جو اِس جگہ موجود

ہیں۔ تُم جیسے لوگوں کے قبول اسلام کے بعد سندھ کا مُستقبل کسی محمدّ بن قاسم کا محتاج نہ ہو گا۔ اب عشا کی نماز کا وقت ہو رہا ہے اور آج میری حالت اُس مسافر کی سی ہے جو ایک لمبے سفر کے بعد منزل پر قدم رکھتے ہی سو جانا چاہتا ہو۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ میری ذات سے متاثر ہو کر فوراً کوئی فیصلہ کریں۔ لیکن اگر آپ دِل سے اسلام کی خوبیوں کا اعتراف کر چکے ہیں تو مُجھے آپ کا اعلان سُن کر روحانی مسرّت ہو گی۔

بھیم سنگھ نے بُلند آواز میں کلمۂ توحید پڑھتے ہوئے کہا۔ ”میں اگر اسلام کی خوبیوں کا معترف نہ بھی ہوتا تو بھی میں آپ کی دعوت پر انکار نہ کرتا۔ میرے نزدیک اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ جیسے لوگ مسلمان ہیں!“

محمدّ بن قاسم نے اُٹھ کر بھیم سنگھ کو سینے سے لگا لیا اور کہا۔ ”مسلمانوں میں تمھیں مُجھ جیسے ہزاروں انسان ملیں گے۔“

آٹھ اور سرداروں نے بھیم سنگھ کی تقلید کی اور حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ جب یہ لوگ عشاء کی نماز ادا کرنے کے لیے کمرے سے باہر نکل رہے

تھے تو محل کے ایک اور کمرے سے اَروَر کے بڑے پروہت کی قیادت میں معزّزینِ شہر کا ایک وفد یزید بن ابو کبشہ سے ملاقات کے بعد واپس جا رہا تھا۔ اُس وفد کے ارکان مُرجھائے ہوئے چہروں کے ساتھ یزید کے کمرے میں داخل ہوئے تھے اور مُسکراتے ہوئے باہر نکلے۔ یزید اُن کے دیوتا کی جان بچانے کا وعدہ کر چکا تھا۔ اور وہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ سندھ کے آفتاب کے گرد جمع ہونے والے بادل چھٹ چُکے ہیں۔

پروہت اور اُس کے ساتھی محل سے باہر نکلے تو بے شمار لوگ اُن کے گرد جمع ہو گئے اور سوالات کے جواب میں پروہت نے فقط یہ کہا۔ ''تم اپنے اپنے گھر جاؤ۔ سندھ کے مقدّر کے ستارے کی نحوست ٹل چکی ہے۔ تمہارا دیوتا تمہیں مل جائے گا۔

سلیمان کا قیدی

عشاء کی نماز کے بعد جب محمدؒ بن قاسم اپنی قیام گاہ میں داخل ہو رہا تھا تو یزید بن ابو کبشہ نے آواز دی۔ خالد، زبیر اور بھیم سنگھ ابو کبشہ کے ساتھ آ رہے تھے۔ محمدؒ بن قاسم دروازے پر رُک کر اُن کی طرف دیکھنے لگا۔ یزید نے قریب پہنچ کر خالد، زبیر اور بھیم سنگھ کو رُخصت کیا اور محمدؒ بن قاسم کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اُس کے کمرے میں داخل ہوا۔

کمرے میں مشتعل جل رہی تھی۔ علی کرسی پر سو رہا تھا۔ محمدؒ بن قاسم نے یزید کو ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اِس لڑکے کو میرے

ساتھ بہت محبّت ہے۔ یہ بھی برہمن آباد میں قید تھا۔"

یزید نے مُسکراتے ہوئے کہا۔"اس سرزمین میں وہ کون ہے جسے آپ کے ساتھ محبّت نہیں۔"

محمدؒ بن قاسم نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے موضوعِ سخن بدلنے کی نیّت سے کہا۔ "میں چاہتا تھا کہ رُخصت ہونے سے پہلے آپ کو سندھ کے تمام حالات بتا دوں۔ میرا ارادہ تھا کہ علی الصبح آپ سے ملوں لیکن یہ اچھا ہوا کہ آپ خود ہی آ گئے۔" یزید نے کہا۔"میں آپ سے سندھ کے حالات پوچھنے نہیں آیا۔ میں آپ کو یہ بتانے کے لیے آیا ہوں کہ آپ یہیں رہیں گے۔"

محمدؒ بن قاسم نے جواب دیا۔"آپ کی ہمدردی کا شکریہ! لیکن میں امیر المومنین کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا۔"

"لیکن آپ نہیں جانتے کہ سلیمان آپ کے خون کا پیاسا ہے!"

"مُجھے معلوم ہے، مگر میں یہ نہیں چاہتا کہ میرے خون کے چند قطروں کے لیے عالمِ اسلام دو حصّوں میں تقسیم ہو جائے۔"

”آپ اِس عُمر میں میری توقّعات سے کہیں زیادہ دور اندیش ہیں۔ پھر بھی مجھے یقین ہے کہ اگر میں خود جا کر سلیمان کو یہ بتاؤں کہ سندھ میں ایک لاکھ سے زیادہ سپاہی آپ کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں گے، تو وہ آپ کے خلاف یقیناً اعلانِ جنگ نہیں کرے گا۔“

”لیکن اِس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ میں اور میرے ساتھ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی جماعت مرکز سے کٹ کر علیحدہ ہو جائے گی اور ہم اِس دُنیا میں ایک اجتماعی جدوجہد کے انعام سے محروم ہو جائیں گے۔ میں آپ کو یہ سمجھانے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ لامرکزیت دُنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کو لے ڈوبتی ہے۔“

یزید نے کہا۔ ”میرے پاس نماز سے پہلے اَروَر کے معزّزین کا ایک وفد آیا تھا اور وہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا دیوتا ہم سے نہ چھینئے! اگر سلیمان نے آپ کے ساتھ کوئی بدسلوکی کی تو وہ تمام ہندوستان کو اُس کے خلاف مُشتعل کر دیں گے۔“

”آپ اس بات کی فکر نہ کریں۔ میں اُنہیں سمجھالوں گا۔“

یزید محمدّ بن قاسم کا فیصلہ اٹل سمجھ کر خاموش ہو گیا۔ اِس کے بعد محمدّ بن قاسم نے اُسے سندھ کے تمام حالات بتائے اور اِس ملک کے باشندوں کے ساتھ رواداری برتنے اور مُشکل وقت میں ناصر الدّین والئ دیبل اور بھیم سنگھ کی ہدایات پر عمل کرنے کی تاکید کی۔

یزید نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ سے صرف ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ آپ سلیمان کے حکم کی تعمیل میں یہاں سے بیڑیاں پہن کر رُخصت ہونے پر ضِد نہ کریں۔ اِس سے ہزاروں انسانوں کے دِل مجروح ہوں گے اور مُمکن ہے کہ لوگ مُشتعل بھی ہو جائیں۔“

”اگر آپ اِسی میں مصلحت سمجھتے ہیں تو میں ضِد نہیں کروں گا۔ ورنہ اطاعتِ امیر کی بیڑیاں پہنتے ہوئے میں فخر محسوس کرتا۔“

یزید نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں ایک اور سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ عرب سالاروں میں سے آپ کا بہترین دوست کون ہے؟“

”میرے سب دوست ہیں لیکن جو شخص میری زندگی کے ہر پہلو سے

واقف ہے وہ زبیر ہے۔ وہ ہر وقت آپ کے ساتھ رہے گا۔"

"نہیں، میں اُسے ایک ضروری کام کے لیے فوراً مدینہ بھیجنا چاہتا ہوں۔"

"وہ آپ کے ہر حکم کی تعمیل کرے گا!"

"میں آپ کے رُخصت ہونے سے پہلے اُسے روانہ کر دینا چاہتا ہوں، آپ اُسے میرے کمرے میں بھیج دیں۔"

محمدؒ بن قاسم نے علی کو جگایا اور کہا۔ "اُنہیں اُن کے کمرے میں چھوڑ آؤ اور زبیر کو اِن کے پاس بھیج دو۔"

(۲)

یزید کو اُس کے کمرے میں چھوڑ کر علی زبیر کو بُلانے کے لیے چلا گیا اور یزید مشعل کی روشنی کے سامنے بیٹھ کر خط لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد زبیر اندر داخل ہوا۔ یزید نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے بیٹھنے کے لیے کہا۔

زبیر دیر تک بیٹھا رہا۔ خط ختم کرنے کے بعد یزید اُس کی طرف متوجّہ ہوا۔
"آپ ایک لمبے سفر کے لیے تیّار ہو جائیں۔ یہ خط پڑھ لیں!"

یزید نے خط زبیر کے ہاتھ میں دے دیا۔ زبیر نے خط پڑھا اور اُس کے مُرجھائے ہوئے چہرے پر اُمّید کی روشنی جھلکنے لگی۔ یزید کا یہ خط حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے نام تھا جس میں اُس نے محمدؐ بن قاسم کو عالمِ اسلام کا جلیل القدر مجاہد ثابت کرنے کے بعد عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ سے یہ اپیل کی تھی کہ وہ اُسے سلیمان کے انتقام سے بچانے کی ہر مُمکن کوشش کریں۔ یزید کے مکتوب کے آخری الفاظ یہ تھے:

"محمدؐ بن قاسم جیسے مجاہد بار بار پیدا نہیں ہوتے۔ میں نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے آدمی دیکھے ہیں۔ لیکن اِس نوجوان کی عظمت کا میں صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا، جس نے سترہ برس کی عمر میں سندھ فتح کیا اور اب اپنے ایک لاکھ بارہ ہزار جان بازوں کی موجودگی میں خوشی سے اطاعتِ امیر کی بیڑیاں پہننے کے لیے تیّار ہے۔ محمدؐ بن قاسم اسلام کے جسم میں ایک ایسا دِل ہے جس کی ہر دھڑکن مُجھ جیسے انسانوں کی عُمر بھر کی

ریاضت سے زیادہ قیمتی ہے۔ آپ عالمِ اسلام کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان سے بچاسکتے ہیں۔"

زبیر نے خط پڑھ کر یزید کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "آپ کو یقین ہے کہ وہ سلیمان پر اثر ڈال سکیں گے؟"

"مُجھے یقین ہے۔ تُم جاؤ، وہ اِس وقت مدینے میں ہیں۔ لیکن راستے میں ایک لمحہ ضائع نہ کرنا۔ سلیمان کے مشیر جنہیں محمدؐ بن قاسم کے ساتھ فقط اِس لیے عناد ہے کہ وہ حجّاج بن یوسف کا داماد ہے۔ ہر مُمکن کوشش کریں گے کہ اُس کے متعلّق فوراً فیصلہ ہو جائے۔ سلیمان خود اتنے با اثر آدمی کو زیادہ دیر تک زندہ رکھنا خطرناک خیال کرے گا۔ عمر بن عبد العزیز اگر مدینہ میں نہ ہوئے تو جہاں بھی ہوں، تُم وہاں پہنچو اور کوشش کرو کہ وہ محمدؐ بن قاسم کی قسمت کا فیصلہ ہونے سے پہلے دمشق پہنچ جائیں۔ میرے نزدیک یہ ہم تمام ہندوستان کی فتح سے زیادہ اہم ہے۔"

زبیر نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی جاتا ہوں۔"

"جاؤ! خُدا تمہاری مدد کرے!"

زبیر یزید کے کمرے سے نکل کر بھاگتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچا۔ ناہید، خالد، اور زہرا اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ سب نے یک زبان ہو کہ کہا۔
"کیا خبر لائے؟"

"میں مدینے جا رہا ہوں۔" زبیر صرف اتنا کہہ کر عقب کے کمرے میں لباس تبدیل کرنے کے لیے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ لباس تبدیل کر کے باہر نکلا۔ ناہید نے کوئی سوال پوچھے بغیر کھونٹی سے تلوار اُتار کر اُس کے ہاتھ میں دے دی۔

خالد نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

زبیر نے تلوار کمر کے ساتھ باندھتے ہوئے کہا۔ "نہیں تُم ناہید اور زہرا کو لے کر محمدّ بن قاسم کے ساتھ بصرہ پہنچ جاؤ۔"

زہرا نے کہا۔ "بھیّا! مدینے میں آپ کو کیا کام ہے؟"

زبیر نے جواب دیا۔ "میں ایک ایسے آدمی کے پاس یزید کا خط لے کر جا رہا

ہوں جو محمدّ بن قاسم کو بچا سکتا ہے۔ خالد تم بصرہ پہنچ کر سیدھے محمدّ بن قاسم کے گھر چلے جانا اور زبیدہ کو تسلّی دینا۔ مجھے اُمّید ہے کہ میں بھی بہت جلد وہاں پہنچ جاؤں گا۔ ناہید خُدا حافظ! زہرا! میری کامیابی کے لیے دُعا کرنا۔"

زبیر یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

راستے میں محمدّ بن قاسم کا کمرہ تھا۔ اندر مشعل ٹمٹما رہی تھی۔ اُس نے دروازے پر رُک کر اندر جھانکا اور پھر کُچھ سوچ کر دبے پاؤں اندر چلا گیا۔ محمدّ بن قاسم گہری نیند سو رہا تھا ایک معصوم بچّے کی سی مُسکراہٹ جسے زبیر نیند کی حالت میں اکثر اُس کے ہونٹوں پر دیکھ چکا تھا۔ آج بھی اُس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ سرہانے کی طرف دیوار کی کھونٹی پر وہ تلوار لٹک رہی تھی جس کے ساتھ کمسن اور نوجوان سالار نے سندھ کے مضبوط قلعوں اور سندھ کے باشندوں کے قلوب کو مسخّر کر لیا تھا۔

ایک نامعلوم جذبے کے تحت زبیر کا دِل دھڑکا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ کانپتی ہوئی آواز میں آہستہ سے یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

"میرے بھائی! میرے دوست! میرے سالار! خُدا حافظ۔"

محل سے نکلتے وقت زبیر اپنے سہمے ہوئے دِل کو بار بار یہ کہہ کر تسلّی دے رہا تھا۔ "نہیں! نہیں! ہم ایک بار اور ضرور ملیں گے۔"

(۳)

صُبح کے وقت محل کے دروازے پر تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ محمدّ بن قاسم دروازے سے باہر نکلا تو ہجوم نے اِدھر اُدھر سمٹ کر دروازے کے سامنے سیڑھیاں خالی کر دیں۔ فوج کے عہدیدار شہر کے معزّزین اور پروہت آگے بڑھ کر اُس سے مصافحہ کرنے لگے۔ بھیم سنگھ کی باری آئی تو وہ بے اختیار محمدّ بن قاسم کے ساتھ لپٹ گیا۔ اُس نے کہا۔ "آپ نے میرا اسلامی نام تجویز نہیں کیا۔"

محمدّ بن قاسم نے جواب دیا۔ "تم اگر پسند کی تو میں تمہارا نام سیف الدّین رکھتا ہوں!"

سیڑھیوں سے نیچے ایک سپاہی گھوڑا لیے کھڑا تھا۔ محمدّ بن قاسم نیچے اُتر کر

گھوڑے پر سوار ہونے لگا تو یزید بن ابو کبشہ نے بھاگ کر باگ تھام لی۔ محمدّ بن قاسم کے احتجاج کے باوجود لوگ بھاگ بھاگ کر دیوانہ وار اُس کے پاؤں کو ہاتھ لگا رہے تھے۔

گھوڑے پر سوار ہو کر محمدّ بن قاسم نے چاروں طرف دیکھا، اُسے کوئی آنکھ آنسوؤں سے خالی نظر نہ آئی۔ سفید ریش بوڑھے یہ محسوس کر رہے تھے کہ اُن کا عزیز ترین بیٹا اُن سے رُخصت ہو رہا ہے۔ بیوہ عورتیں اور یتیم بچّے یہ محسوس کر رہے تھے کہ قدرت اُن کا زبردست سہارا چھین رہی ہے۔ نوجوان لڑکیاں یہ کہہ رہی تھیں کہ ان کی عفّت و عصمت کا نگہبان جا رہا ہے۔ اَروَر کے درو دیوار پر حسرت برس رہی تھی۔

اپنے باپ کے اشارے پر شہر کے پروہت کی نوجوان لڑکی آگے بڑھی اور اُس نے محمدّ بن قاسم کو پھولوں کا ہار پیش کرتے ہوئے کہا: ”میرے بھائی، میں اَروَر کی تمام کنیاؤں کی طرف سے یہ تحفہ تمہاری خدمت میں پیش کرتی ہوں۔“

محمدّ بن قاسم نے اُس کی طرف احسان مندانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے

پھول قبول کر لیے۔

دیبل کے بازاروں سے سلیمان بن عبد الملک کے قیدی کا گھوڑا پھولوں کے ڈھیر روندتا ہوا نکلا۔۔۔اَروَر کے باشندوں نے کسی شہنشاہ کا جلوس بھی اِس قدر شاندار نہ دیکھا تھا۔ کسی عزیز کی جُدائی پر اِس قدر آنسو نہ بہے تھے۔ وہ ہاتھ جنھوں نے دو سال قبل فاتح سندھ کو اپنا بد ترین دُشمن سمجھ کر تیروں اور نیزوں کے ساتھ اُس کا خیر مقدم کیا تھا، وہی اب پھولوں کی بارش کر رہے تھے۔

علی، خالد، ناہید اور زہرا محمدّ بن قاسم کے ساتھ جانے والے چند سپاہی کے ساتھ پہلے ہی شہر سے باہر پہنچ چکے تھے۔ یہ قافلہ ساٹھ نفوس پر مشتمل تھا۔ ان میں چالیس وہ سپاہی تھے جو محمدّ بن قاسم کو پابہ زنجیر دمشق لے جانے کے لیے یزید بن ابو کبشہ کے ساتھ آئے تھے۔ واسط کا کوتوال مالک بن یوسف صالح کی سفارش کے ساتھ مالک بن یوسف کو صالح کی یہ ہدایت تھی کہ وہ راستے میں محمدّ بن قاسم کے ساتھ کوئی رعایت نہ کرے۔ مالک خود بھی حجّاج بن یوسف کے خاندان کا پرانا دُشمن تھا لیکن

اَرور پہنچ کر وہ یزید بن ابو کبشہ کی طرح محمدّ بن قاسم کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اُس کے بعض ساتھی بھی اَرور سے اُس کی روانگی کا منظر دیکھ کر اِس قدر متاثر ہوئے کہ وہ کھلے بندوں سلیمان کے غَلَط احکام پر نکتہ چینی کرنے لگے۔ یزید نے اُنہیں رخصت کرتے وقت تاکید کی تھی کہ اُنہیں عزّت کے ساتھ بصرہ لے جاؤ۔ امیر المومنین کو میں جواب دے دوں گا۔

دوپہر کے وقت سیف الدّین (بھیم سنگھ) اَرور کے پروہت کے ساتھ ایک ٹیلے پر کھڑا دور راستے کی گرد میں ایک قافلے کو روپوش ہوتے دیکھ رہا تھا۔ پروہت نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”سندھ کا آفتاب دوپہر کے وقت غروب ہو رہا ہے۔“

غروبِ آفتاب

حضرت عمر بن عبد العزیز ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد مسجد نبویؐ سے باہر نکل رہے تھے۔ اچانک ایک سوار دروازے پر آ کر رُکا۔ سوار کا چہرہ گرد و غبار میں اٹا ہوا تھا۔ اُس کا چہرہ بھوک، پیاس اور تھکاوٹ کی وجہ سے مُرجھایا ہوا تھا۔ اُس نے عُمر بن عبد العزیز کو ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف متوجّہ کرتے ہوئے کُچھ کہنے کی کوشش کی لیکن خشک گلے سے آواز نہ نکل سکی۔ وہ گھوڑے سے اُتر کر خط نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈال کر عمر بن عبد العزیز کی طرف بڑھا لیکن دو تین قدم اٹھانے کے بعد لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا اور اُس کے ساتھ ہی تھکے ہوئے گھوڑے نے

اپنے بوجھ سے آزاد ہوتے ہی زمین پر گرنے کے بعد ایک جھرجھری لے کر دم توڑ دیا۔ یہ سوار زبیر تھا۔ لوگ اُسے اُٹھا کر مسجد کے حُجرے میں لے گئے۔ تھوڑی دیر بعد سوار نے جب ہوش میں آکر آنکھیں کھولیں۔ اس وقت عمر بن عبد العزیز اس کے مُنہ پر پانی کے چھینٹے دے رہے تھے۔ اُس نے پانی کا پیالہ چھین کر پینے کی کوشش کی لیکن عمر بن عبد العزیز نے کہا۔ ”تھوڑی دیر صبر کرو۔ تُم پہلے ہی بہت زیادہ پانی پی چُکے ہو۔ اب کُچھ کھا لو۔ معلُوم ہوتا ہے تُم نے کئی دِنوں سے کُچھ نہیں کھایا۔“ عُمر بن عبد العزیز کے اشارے پر ایک شخص نے زبیر کے سامنے کھانا رکھ دیا۔ لیکن اُس نے کہا۔ ”نہیں! مُجھے پانی کی ضرورت ہے۔“ اور پھر چونک کر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”میں پہلے ہی بہت وقت ضائع کر چکا ہوں۔ یہ خط لیکن۔۔۔۔۔۔؟“ جیب خالی پا کر اُس کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔

عُمر بن عبد العزیز نے کہا۔ ”تمہارا خط میں پڑھ چکا ہوں۔ تمہارے گھوڑے کے دم توڑنے اور تمہارے بے ہوش ہو جانے سے مُجھے یقین ہو

گیا تھا کہ تُم کوئی ضروری پیغام لائے ہو۔"

زبیر نے کہا۔ "تو آپ محمدؐ بن قاسم کے لیے کُچھ کریں گے ؟"

"میں دمشق جارہا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اُنہوں نے اپنے ایک ساتھی کی طرف دیکھا اور سوال کیا۔ "میرا گھوڑا تیّار ہے؟"

اُس نے جواب دیا۔ "جی ہاں!"

زبیر نے کہا۔ "میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔"

اُنہوں نے جواب دیا۔ "نہیں! تُم آرام کرو۔ تُم گزشتہ سفر میں بہت نڈھال ہوچکے ہو!"

"نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میرے نڈھال ہونے کی وجہ سفر کی کلفت سے زیادہ میرے دِل کی بے چینی تھی۔ اب یہاں ٹھہر کر انتظار کرنے میں مُجھے سفر سے زیادہ تکلیف ہو گی۔"

عمر بن عبد العزیز نے کہا۔ "بہت اچھّا، تُم کھانا کھالو!"

زبیر نے جلدی جلدی کھانے کے چند نوالے مُنہ میں رکھنے کے بعد پیٹ بھر کر پانی پیا اور اُٹھ کر بولا۔ ”میں تیّار ہوں۔“

عمر بن عبد العزیز نے ایک عرب کو دوسرا گھوڑا تیار کرنے کا حکم دیا اور زبیر سے کہا۔ ”آپ تھوڑی دیر بیٹھ جایئے!“

زبیر نے کہا۔ ”اگر آپ کا حکم نہ ہو تو میں کھڑا رہنے کو ترجیح دوں گا۔ بیٹھنے سے انسان پر نیند اور تھکاوٹ کا حملہ نسبتاً زیادہ شدید ہوتا ہے!“

ایک عرب نے پوچھا۔ ”آپ نے راستے میں بالکل آرام نہیں کیا؟“

زبیر نے جواب دیا۔ ”دِن کے وقت بالکل نہیں اور رات کو بھی اُس وقت جب میں بے ہوش ہو جایا کرتا تھا۔“

عمر بن عبد العزیز نے پوچھا۔ ”تُم نے راستے میں کتنے گھوڑے تبدیل کیے؟“

اَروَر سے بصرہ تک ہر پانچ کوس پر سپاہیوں کی چوکیوں سے میں تازہ دم گھوڑا تبدیل کرتا رہا لیکن بصرہ سے آگے وقت بچانے کے لیے میں نے

سیدھا راستہ اختیار کرنا مناسب خیال کیا اور صحرائے عرب عبور کرتے ہوئے مجھے بعض اوقات ایک ہی گھوڑے پر کئی منزلیں طے کرنا پڑیں۔ اِس سے پہلے میری سواری میں چار گھوڑے دم توڑ چکے ہیں!"

عمر بن عبد العزیز نے کہا۔ "لوگ محمدّ بن قاسم کی فتوحات کی داستانیں تعجّب سے سُنا کرتے تھے لیکن جس سپہ سالار کے پاس تمہارے جیسے سپاہی ہوں، اس کے لیے کوئی قلعہ ناقابلِ تسخیر نہیں ہو سکتا!"

خادم نے آکر اطلاع دی کہ گھوڑے تیّار ہیں۔ زبیر اور عمر بن عبد العزیز حُجرے سے باہر نکل کر گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔

(۲)

سلیمان کو سندھ سے محمدّ بن قاسم کے روانہ ہونے کی اطلاع مل چکی تھی۔ اُسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ اَروَر کی طرح مکران اور ایران کے ہر شہر کے باشندے راستے میں اُس کا پُر تپاک خیر مقدم کر رہے تھے اور یزید نے بغاوت کے خوف سے اُسے بیڑیاں پہنانے کی جرأت نہیں کی۔ اِن

خبروں نے اُس کی آتشِ انتقام پر تیل کا کام کیا۔ اُس نے تمام تیر دیکھے اور اُن میں سے جو سب سے زیادہ تیز اور جگر دوز تھا، اُسے محمدّ بن قاسم کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے اختیارات دے کر بصرہ روانہ کر دیا۔ یہ صالح تھا۔ غازی محمدّ بن قاسم کا بدترین دُشمن!

بصرہ کے لوگ جس بے چینی اور بے قراری سے محمدّ بن قاسم کا انتظار کر رہے تھے، اُس سے صالح نے یہ اندازہ لگایا کہ بصرہ میں محمدّ بن قاسم کے ساتھ بد سلوکی کی گئی تو لوگ بغاوت پر آمادہ ہو جائیں گے۔ وہ محمدّ بن قاسم کو پابہ زنجیر بصرہ سے واسط سے جانا چاہتا تھا لیکن بصرہ کے عوام کا جوش و خروش دیکھ کر اُسے اپنا ارادہ تبدیل کرنا پڑا۔

ایک شام محمدّ بن قاسم کا قافلہ بصرہ سے تیس میل کے فاصلے پر ایک بستی کے قریب پہنچا۔ بستی کے لوگوں کو یہ اطلاع مل چکی تھی کہ سندھ کا فاتح اور سلیمان کا قیدی ایک رات یہاں قیام کرے گا۔ بستی کے مرد، عورتیں اور بچّے فوج کی چوکی کے سامنے کھڑے تھے۔ عورتیں محمدّ بن قاسم کے علاوہ اُس لڑکی کو دیکھنے کے لئے بے قرار تھیں جس کی آواز نے سندھ کی

تاریخ بدل ڈالی تھی۔ محمدّ بن قاسم کو دیکھتے ہی کئی نوجوان بھاگ کر اُس کے گرد جمع ہو گئے۔ کئی ہاتھ بیک وقت اُس کے گھوڑے کی باگ تھامنے کے لیے بڑھے۔ عورتوں نے چوکی سے کُچھ فاصلے پر ہی محمل بردار اونٹ ٹھہرالیا۔ زہرا اور ناہید کو ایک مکان میں لے گئیں۔

چوکی کے محافظ سپاہیوں نے مالک بن یوسف کو بتایا کہ صالح راستے کی ہر بستی میں محمدّ بن قاسم کی آؤ بھگت کی خبریں سُن کر سخت مُضطرب ہے اور اُسے یہ خطرہ ہے کہ بصرہ کے لوگ شاید زیادہ جوش و خروش سے اس کا خیر مقدم کریں گے۔ اِس بات کا بھی اندیشہ ہے کہ وہاں ناہید کی آواز اُس کے حق میں بہت مُضرِ ثابت ہو گی۔ اِس لیے اُس نے فیصلہ کیا ہے کہ محمدّ بن قاسم کو سیدھا واسط پہنچایا جائے۔ وہ اِن لڑکیوں کو بھی بصرہ پہنچنے سے روکنا چاہتا ہے۔ شاید وہ صُبح تک خود یہاں پہنچ جائے۔“

چوکی کے سالار نے مالک کو صالح کا وہ خط دکھایا جس میں یہ ہدایت تھی کہ محمدّ بن قاسم کو اُس کی آمد تک روکا جائے۔

گزشتہ سفر میں محمدّ بن قاسم کو قریب سے دیکھنے کے بعد مالک بن یوسف کو

اُس کے ساتھ غایت درجہ کی عقیدت ہو چکی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ بصرہ کے لوگوں کا جوش و خروش سلیمان کو محمدّ بن قاسم کے متعلّق اپنا ارادہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیے گا۔ واسط ولید کی موت کے بعد پھر ایک بار خارجی عناصر کا مرکز بن چکا تھا، اُسے اُمّید نہ تھی کہ وہاں سے محمدّ بن قاسم کے حق میں کوئی آواز اُٹھے گی۔

وہ عشاء کی نماز کے بعد کُچھ دیر اپنے خیمے سے باہر پریشانی کی حالت میں ٹہلتا رہا۔ بالآخر وہ ایک مضبوط ارادہ لے کر محمدّ بن قاسم کے خیمے میں داخل ہوا۔ محمدّ بن قاسم شمع کی روشنی میں بیٹھا کُچھ لکھ رہا تھا۔

مالک نے کہا۔ ”آپ کسی کے نام کوئی خط بھیجنا چاہتے ہیں تو میں انتظام کر دوں؟“

محمدّ بن قاسم نے جواب دیا۔ ”خط نہیں میں ایک نئی قسم کی منجنیق تیّار کر رہا ہوں۔ میرے خیال میں اِس سے پتھّر زیادہ دور اور زیادہ صحیح نشانے پر پھینکا جاسکے گا۔“

مالک نے جواب دیا۔ ”اس وقت آپ کو کچھ اپنے متعلّق سوچنا چاہیے۔“

محمدّ بن قاسم نے جواب دیا۔ ”میں ایک فرد ہوں اور منجنیق ایک قوم کی ضرورت ہے۔ اگر مجھے قید کر لیا گیا تو آپ خود یہ نقشہ امیر المومنین کے پاس پہنچا دیں!“

مالک نے جواب دیا۔ ”آپ کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ آپ بصرہ کے بجائے سیدھے واسط جا رہے ہیں۔“

محمدّ بن قاسم نے جواب دیا۔ ”مجھے پہلے ہی یہ خیال تھا کہ وہ مجھے بصرہ لے جانے کی غَلَطی نہیں کریں گے۔“

مالک نے کہا۔ ”اب آپ اپنے متعلّق فیصلہ کر سکتے ہیں۔ واسط کے بہت کم لوگ آپ کے حق میں آواز اٹھائیں گے لیکن آپ کے بصرہ پہنچ جانے پر ہزاروں مجاہد آپ پر جان دینے کے لیے تیّار ہوں گے۔ صالح آج رات یا صُبح کسی وقت یہاں پہنچ جائے گا۔ اِس کے بعد ہماری تدبیر بے سود ہو گی۔ اِس وقت ایک ہی صورت ہے کہ آپ فوراً اِن لڑکیوں کو لے کر روانہ ہو

جائیں۔ وہاں آپ ہر گھر کو اپنے لیے ایک قلعہ پائیں گے۔ اب اُٹھیے، یہ وقت بہت نازک ہے!"

محمدؐ بن قاسم نے جواب دیا۔ "میری جان بچانے کے لیے آپ کتنے مسلمانوں کی جانیں قربان کرنا جائز سمجھتے ہیں؟ کیا اِس سے پہلے بصرہ کے لوگوں کی بغاوتوں نے عالمِ اسلام کو کافی نقصان نہیں پہنچایا؟ کیا میری تنہا جان اِس قدر قیمتی ہے کہ اِس کے لیے لاکھوں مسلمانوں کی تلواریں آپس میں ٹکرا جائیں۔ ہزاروں عورتیں بیوہ اور بچّے یتیم ہو جائیں؟ اگر میں عالمِ اسلام کو اِس تباہی سے بچانے کے لیے قربان بھی ہو جاؤں تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میری قربانی رائیگاں جائے گی۔ یہ مسلمانوں کی بد قسمتی ہے کہ خلافت اب ملوکیت میں تبدیل ہو چکی ہے۔

تاہم مسلمانوں کا سوادِ اعظم اُسے خلیفہ تسلیم کرنے کی غَلطی کر چُکا ہے اور اُس وقت میری بغاوت فقط خلیفہ سلیمان کے خلاف نہ ہو گی بلکہ قوم کے سوادِ اعظم کے خلاف ہو گی۔ لیکن ممکن ہے کہ میری قربانی کے بعد لوگ اپنی اس کمزوری کو محسوس کریں اور اُن میں ایک ایسا اجتماعی ضمیر پیدا ہو

جائے جو سلیمان کو راہِ راست پر لے آئے یا کم از کم مسلمان کے بعد وہ انتخاب کے معاملہ اس قدر سخت ہو جائیں کہ سلیمان جیسیوں کے لیے آگے بڑھنے کا موقع نہ ہو۔ اگر میرے انجام سے متاثر ہو کر عوام نے یہ محسوس کیا کہ وہ امارت کو کِسی کی خاندانی میراث تسلیم کرنے میں غَلَطی پر تھے اور اُنہوں نے سلیمان کے بعد اُس کے کسی خاندانی وارث کی بجائے کسی صالح مسلمان کو خلیفہ منتخب کیا، تُو یہ ایک ایسا مقصد ہے جس کے لیے قربان ہونا میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی سعادت سمجھتا ہوں۔"

مالک بن یوسف نے لاجواب ہو کر کہا۔ "آپ کا فیصلہ اٹل ہے۔ میں ہار مانتا ہوں لیکن اِن لڑکیوں کے متعلّق آپ نے کیا سوچا؟ مُجھے چوکی کے سپاہیوں سے معلوم ہوا کہ صالح بصرہ کے لوگوں کے اشتعال کے خوف سے اُنہیں بھی واسط لے جانا چاہتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اِن کے بصرہ نہ پہنچنے سے لوگ زیادہ مُشتعل ہوں گے۔ بصرہ کے ہر گھر میں ناہید کا انتظار ہو رہا ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ صالح کے یہاں پہنچنے سے پہلے اُنہیں بصرہ روانہ کر دیا جائے۔"

محمدؒ بن قاسم نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ”مجھے صرف اِس بات کا خیال ہے کہ ناہید زبیر کی بیوی ہے اور صالح میری طرح زبیر کو بھی اپنا بد ترین دُشمن خیال کرتا ہے۔ تاہم مجھے یہ اُمّید نہیں کہ وہ ناہید کے ساتھ کسی بدسلوکی کی جرأت کرے گا!“

مالک نے جواب دیا۔ ”میں کئی برس صالح کے ساتھ گزار چکا ہوں۔ وہ انسان نہیں بلکہ سانپ ہے۔ اگر اِن لڑکیوں کے متعلّق اُس کے مُنہ سے گستاخی کا ایک لفظ بھی نکل گیا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے تمام ساتھی کٹ مرنے کے لیے تیّار ہوں گے۔ اِس لیے میرا مشورہ قبول کیجئے اور اِن لڑکیوں کو خالد کے ساتھ بصرہ بھیج دیجیے، میں چند سپاہی بھی ساتھ کیے دیتا ہوں اور اگر آپ کو اسلام کا مستقبل بہت زیادہ عزیز ہے تو آپ انہیں ہدایت کر سکتے ہیں کہ وہ بصرہ میں کسی بغاوت کی حوصلہ افزائی نہ کریں۔“

محمدؒ بن قاسم کو اچانک ایک خیال آیا اور اُس کے دِل میں بعض دبے ہوئے احساسات جاگ اُٹھے۔ وہ اُٹھا اور بے قراری کی حالت میں خیمے

کے اندر ٹہلنے لگا۔ مالک اُس کی حرکات کا بغور مطالعہ کر رہا تھا۔ محمدؐ بن قاسم بار بار مُٹھّیاں بھینچ کر کسی زبردست ارادے کے خلاف جنگ کرتا ہوا دِکھائی دیتا تھا۔ کمرے میں چند چکّر لگانے کے بعد وہ مالک سے کوئی بات کیے بغیر باہر نکل آیا اور ساتھ والے خیمے میں خالد کو آواز دی۔ خالد بھاگتا ہوا باہر نکلا تو اس نے کہا۔ ”خالد! ناہید اور زہرا کو بستی سے بُلا لو۔ جلدی کرو۔“

خالد اُسی رفتار سے بھاگتا ہوا بستی کی طرف چلا گیا اور محمدؐ بن قاسم مالک کی طرف متوجّہ ہوا۔ ”آپ فوراً چار گھوڑے تیّار کروائیں۔ نہیں پانچ، علی بھی ہمارے ساتھ جائے گا!“

مالک نے پُر اُمّید ہو کر پوچھا۔ ”تو آپ جا رہے ہیں؟“

محمدؐ بن قاسم نے جواب دیا۔ ”اگر تمہاری اجازت ہو تو میں اُنہیں بصرہ چھوڑ آؤں۔ میں انشاءاللہ صُبح تک واپس آجاؤں گا!“

مالک نے جواب دیا۔ ”آپ واپس آنے کا نام نہ لیں۔ بہتر یہ ہے کہ آپ

سندھ کا رُخ کریں۔ میں چند دِنوں میں آپ کی بیوی کو وہاں پہنچا دینے کا انتظام کر دوں گا۔“

محمدؒ بن قاسم نے کہا۔ ”میرے دوست میرے متعلّق بار بار غَلَط اندازہ نہ لگاؤ۔ میری شخصیت ایسی نہیں جو کہیں چھُپ سکے۔ میں فقط چند لمحات کے لیے گھر جانا چاہتا ہوں اور وہ بھی اِس صورت میں کہ تُم میرے وعدے کا اعتبار کرو، اگر صالح آج رات بصرہ سے روانہ نہیں ہو گیا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اُس کے یہاں پہنچنے سے پہلے واپس آ جاؤں گا۔“

صالح جیسے آدمی ایسے حالات میں رات کے وقت سفر نہیں کیا کرتے۔ وہ دِن کے وقت عراق کی زمین پر پھُونک پھُونک کر قدم رکھتا ہے۔ میں گھوڑے تیّار کرتا ہوں۔ اگر آپ بصرہ پہنچ کر واپس آنے کا ارادہ تبدیل کرلیں تو میری فکر نہ کریں، میں آپ کے ساتھ ایک سپاہی بھیج دیتا ہوں۔ آپ اُس کے ہاتھ پیغام بھیج دیں۔ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سندھ چلا جاؤں گا!“

محمدؒ بن قاسم نے ذرا تلخ ہو کر کہا۔ ”مالک تُم مجھے بار بار نادم نہ کرو۔ اگر

تمہیں مُجھ پر اعتبار نہیں تو میں نہیں جاتا؟"

مالک نے کھسیانا ہو کر کہا۔ "نہیں نہیں میں گھوڑوں کا انتظام کرتا ہوں۔ آپ تیّار ہو جائیں۔"

تھوڑی دیر بعد محمدؐ بن قاسم، خالد، ناہید، زہرا اور علی صبار فتار گھوڑوں پر بصرہ کا رُخ کر رہے تھے۔ محمدؐ بن قاسم نے راستے میں صالح سے ٹکّر کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے بصرہ کی عام شاہراہ سے کترا کر ایک دوسرا اور نسبتاً لمبا راستہ اختیار کیا۔

(۳)

آدھی رات کے قریب خادمہ بھاگتی ہوئی زبیدہ کے کمرے میں داخل ہوئی اور اُسے جھنجھوڑ کر جگاتے ہوئے کہنے لگی۔ "زبیدہ، زبیدہ!! وہ آگئے! وہ آگئے!"

زبیدہ پر ایک سکتے کا عالم طاری تھا۔ خادمہ نے ذرا بُلند آواز میں کہا۔ "زبیدہ محمدؐ آگیا؟"

زبیدہ کی حالت اُس بھٹکے ہوئے مسافر کی سی تھی، جسے کسی نے بے ہوشی کی حالت میں تپتے ہوئے صحرا سے اُٹھا کر نخلستان میں پہنچا دیا ہو۔ جو ایک گھونٹ پانی کو ترسنے کے بعد دریا میں غوطے لگا رہا ہو۔ جذبات کی شدّت سے زبیدہ ایک ثانیہ کے لیے بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ خادمہ نے مشعل جلا کر رکھ دی اور کہا۔

"زبیدہ! اٹھو! اُن کے ساتھ چند مہمان ہیں۔ "

اتنی دیر میں زبیدہ اپنے حواس پر قابو پا چکی تھی۔ "وہ کہاں ہیں؟" اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

"وہ اصطبل میں گھوڑے باندھ رہے ہیں۔ دو لڑکیاں صحن میں کھڑی ہیں۔ "

زبیدہ نے باہر نکل کر چاند کی روشنی میں زہرا اور ناہید کی طرف دیکھا اور کہا: "آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں۔ اندر آیئے۔ میں ابھی خواب دیکھ رہی تھی، آپ ناہید اور زہرا ہیں نا؟"

ناہید جواب دیے بغیر آگے بڑھ کر زبیدہ سے لپٹ گئی اور زہرا کی آنکھوں میں ضبط کی کوشش کے باوجود آنسو اُمڈ آئے۔ ناہید سے علیحدہ ہو کر زبیدہ، زہرا کی طرف متوجّہ ہوئی اور اُس سے آنسوؤں کی وجہ پوچھنا چاہتی تھی لیکن اتنی دیر میں محمّد بن قاسم، خالد اور علی قریب آتے دکھائی دیے۔

محمّد بن قاسم کے ساتھ دو اجنبی دیکھ کر زبیدہ نے ناہید اور زہرا کو اندر لے جانا چاہا لیکن ناہید نے کہا۔ "ہمیں دوسرے کمرے میں آرام کرنے دیجیے ہم بہت تھکی ہوئی ہیں۔"

زبیدہ نے کہا۔ "بہت اچھّا! آپ آرام کریں۔"

خادمہ زبیدہ کے اشارے پر زہرا اور ناہید کو دوسرے کمرے میں لے گئی اور محمّد بن قاسم خالد اور علی کو اُس کمرے میں پہنچانے کے بعد زبیدہ کے کمرے میں داخل ہوا۔

(۴)

رات کے پچھلے پہر محمدّ بن قاسم اپنے کمرے میں بیٹھا زبیدہ سے باتیں کر رہا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ زبیدہ کبھی کبھی اپنے شوہر کے چہرے سے نگاہ ہٹا کر باہر جھانکتی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر رہ جاتی۔ سپیدۂ صبح اُسے شامِ جدائی کا پیغام دے رہا تھا۔ مُرغِ سحر کی اذان سے کُچھ دیر پہلے ہی محمدّ بن قاسم سفر کے لیے تیّار ہو گیا۔

زبیدہ کی والدہ محمدّ بن قاسم کے متعلّق سلیمان کے اِرادوں سے واقف ہوتے ہی زبیدہ کے ماموں اور بصرہ کے چند با اثر مسلمانوں کے وفد کے ساتھ دمشق روانہ ہو چکی تھی۔ محمدّ بن قاسم نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ”افسوس میں ان سے مل نہ سکا۔ زبیدہ! مُجھے اُمّید ہے کہ ناہید اور زہرا تمہیں اُداس نہ ہونے دیں گی۔ ابھی چند دِن یہی کوشش کرنا کہ اُن کی آمد کا کسی کو پتہ نہ چلے۔ “

زبیدہ ہونٹ بھینچ بھینچ کر ہچکیوں کو ضبط کر رہی تھی لیکن اُس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں۔ ”آپ سچ مُچ جا رہے ہیں؟“

محمدّ بن قاسم نے کہا۔ ”زبیدہ! خُدا حافظ!“

زبیدہ نے مُلتجی ہو کر کہا۔ ”اگر آپ مُجھے اجازت دیں تو میں آپ کو اصطبل تک چھوڑ آؤں؟“

اُس نے جواب دیا۔ ”نہیں تُم یہیں ٹھہرو۔۔۔ اور میری طرف اِس طرح نہ دیکھو!“ زبیدہ کی نگاہوں کے سامنے آنسوؤں کے پردے حائل ہو رہے تھے۔ اُس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ ”جایئے!“

محمدّ بن قاسم ایک لحظہ کے لیے پانی کے اُن دو قطروں کی طرف دیکھتا رہا جن میں محبّت اور اطاعت کے ہزاروں دریا بند تھے۔ اُس نے رومال نکال کر زبیدہ کے آنسوؤں کو پونچھنے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن اُس نے پھر کہا۔ ”جایئے!“

محمدّ بن قاسم نے دو قدم آگے کی طرف اٹھائے اور ایک بار مُڑ کر دیکھا اور لمبے لمبے قدم اُٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

اصطبل کے سامنے اُسے خالد اور علی دکھائی دیے اور اُس نے پوچھا۔

”خالد! تم ابھی تک سوئے نہیں؟“

اس نے جواب دیا: ”ہم میں سے کوئی بھی نہیں سویا۔“

محمدؒ بن قاسم نے کہا۔ ”جاؤ آرام کرو!“

”لیکن میں آپ کے ساتھ چلنا چاہتا ہوں!“

محمدؒ بن قاسم نے خالد کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں تمہارے جذبات سے واقف ہوں لیکن مصلحت کا یہی تقاضا ہے کہ تُم یہیں ٹھہرو۔ یہ میری زندگی کا ایسا جہاد ہے جس میں مُجھے ساتھیوں کی ضرورت نہیں!“

”میں اپنے سالار کے حکم کی تعمیل سے انکار نہیں کر سکتا لیکن میرے لیے یہاں ٹھہر کر آپ کے انتظار کی ہر گھڑی قیامت ہو گی۔“

محمدؒ بن قاسم نے جواب دیا۔ ”یہ تمہارے سالار کا حکم نہیں۔ تمہارے دوست کی خواہش ہے۔ اِن حالات میں تمہارے لیے میرا ساتھ دینا ٹھیک نہیں۔ تُم بعد میں آسکتے ہو۔“

خالد نے مایوس ہو کر علی کی طرف دیکھا اور وہ اصطبل سے گھوڑا نکال لایا۔

محمدّ بن قاسم نے گھوڑے پر سوار ہو کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔
خالد نے جذبات سے مغلوب ہو کر اُس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔
"میرے دوست! میرے بھائی! میرے آقا! خُدا حافظ!"

خالد کے آنسو محمدّ بن قاسم کے ہاتھ پر ِگر پڑے۔ وہ ہاتھ چھُڑا کر علی کی طرف متوجّہ ہوا۔ علی اُس کا ہاتھ مضبوطی کے ساتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر کانپتی ہوئی آواز میں خُدا حافظ کہہ کر سِسکیاں لینے لگا۔

دروازے سے باہر نکلتے ہوئے محمدّ بن قاسم نے پیچھے مُڑ کہ دیکھا۔ صحن میں چند قدم کے فاصلے پر تین عورتیں کھڑی تھیں۔

جس وقت بصرہ کی مساجد میں اذانیں گونج رہی تھیں۔ محمدّ بن قاسم اُس بازار میں سے گزر رہا تھا جس میں کُچھ عرصہ قبل بصرہ کے لوگوں نے سندھ پر حملہ کرنے والی افواج کے سترہ سالہ سپہ سالار کا شاندار جلوس دیکھا تھا۔

شہر سے کُچھ دور جا کر اُس نے ایک ندی کے کنارے صُبح کی نماز ادا کی اور گھوڑے پر سوار ہو کر اُسے سرپٹ چھوڑ دیا۔

(۵)

خلیفہ سلیمان مسجد میں مغرب کی نماز کے بعد قصرِ خلافت میں داخل ہو رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے آواز دی۔ "سلیمان!"

اُس آواز میں غصّہ بھی تھا اور جلال بھی۔ سلیمان نے چونک کر پیچھے دیکھا اور کہا۔ "کون!"

عمر بن عبد العزیز نے اُس سوال کا جواب دینے کی بجائے سلیمان کا بازو پکڑ لیا اور کہا۔

"سلیمان! خُدا کو کیا جواب دو گے؟" سلیمان انتہا درجے کا خود پسند تھا لیکن عمر بن عبد العزیز کی شخصیت کے سامنے وہ مرعوب سا ہو کر رہ گیا۔ زبیر چند قدم کے فاصلے پر تھا لیکن شام کے دُھندلکے میں وہ اُسے فوراً پہچان نہ سکا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا: "مجُھے آپ کی گفت گو کا موضوع

نازک معلوم ہوتا ہے۔ کیا اِس کے لیے تخلیہ بہتر نہ ہو گا؟ آیئے! اندر چلیں۔"

عمر بن عبدالعزیز نے کہا۔ "میں تو مسجد میں لوگوں کے سامنے تمہارا دامن پکڑنے کے لیے آیا تھا لیکن اب چلو جلدی کرو۔ آؤ زبیر تُم بھی۔"

چند قدم چلنے کے بعد تینوں محل کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوئے۔ سلیمان نے مشعل کی روشنی میں زبیر کی طرف دیکھا اور کہا۔ "میں نے تمہیں کہیں پہلے بھی دیکھا ہے۔"

عمر بن عبدالعزیز نے کہا۔ "اب باتوں کا وقت نہیں۔ میں محمدّ بن قاسم کے متعلّق کُچھ کہنے کے لیے آیا ہوں؟"

محمدّ بن قاسم کا نام سُن کر سلیمان نے غصّے اور اضطراب کی حالت میں عمر کی طرف دیکھا اور کہا۔ "تو اِس کی سازش مدینے تک بھی پہنچ چکی ہے اور یہ اُس کا دوست ہے؟"

زبیر نے کہا۔ "میں اُس کی دوستی سے انکار نہیں کرتا لیکن یہ غلَط ہے کہ محمدّ

بن قاسم آپ کے خلاف کوئی سازش کر رہا ہے۔ میں یزید بن ابو کبشہ کا ایلچی بن کر مدینے پہنچا تھا۔“

سلیمان کُچھ کہنا چاہتا تھا لیکن عمر بن عبد العزیز نے یزید بن ابو کبشہ کا خط اُس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ ”پہلے یہ پڑھ لو۔ یزید تمہارے خاص احباب میں سے ہے۔ اگر اُسے محمدؐ بن قاسم کی معصومیت ایسا خط لکھنے پر آمادہ کر سکتی ہے تو مُجھ سے یہ توقّع نہ رکھنا کہ میں تمہیں مسلمانوں کی گردنِ پر چھری رکھتے دیکھ کر خاموش رہوں گا۔ تُم شاید اِس بات پر خوش ہو گے کہ قدرت نے آج تمہیں انتقام کا موقع دیا ہے لیکن تُم اِس نوجوان کی عظمت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ جس کے جاں نثار تمہارے جاں نثاروں سے کہیں زیادہ ہیں۔ جس کی تلوار تمہاری تلوار سے زیادہ تیز اور جس کے تیر تمہارے تیروں سے زیادہ جگر دوز ہیں۔ لیکن اِس کے باوجود وہ ایک عاقبت نا اندیش امیر کے سامنے سر تسلیم خم کر رہا ہے۔ تُم نے پچاس آدمیوں کو اُسے قید کر کے لانے کا حکم دے کر سندھ بھیجا تھا لیکن تُم ہی بتاؤ، اگر تُم خود اُس کی جگہ ہوتے اور تمہارے پاس ایک لاکھ سے زیادہ

جاں نثاروں کی فوج ہوتی اور یزید تمہیں جا کر خلیفہ کا حکم سناتا کہ میں تمہیں زنجیریں پہنا کر لے جانا چاہتا ہوں۔ تو تُم اُن پچاس آدمیوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے۔ تمہارا اپنا بھائی تمہارا امیر تھا لیکن تُم تمام عمر اُس کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کرتے رہے۔ لیکن محمدّ بن قاسم تمہیں اچھّی طرح جانتا تھا۔ اُسے تُم سے کسی بھلائی کی اُمّید نہ تھی۔ وہ اگر چاہتا تو سندھ کے ہر گھر کو اپنے لیے قلعہ بنا سکتا تھا۔ وہ اگر تمہارے ایلچی کو قتل بھی کر دیتا تو بھی شاید تُم اُس کا کُچھ نہ بگاڑ سکتے۔ لیکن اُس کے باوجود وہ تمہاری اطاعت سے منحرف نہیں ہوا۔ تُم اپنے انتقام سے زیادہ نہیں سوچ سکے۔ اُس کے سامنے عالمِ اسلام کا مُستقبل ہے۔ کیا تُم اُس سے اِس بات کا انتقام لینا چاہتے ہو کہ وہ حجّاج بن یوسف کا داماد ہے؟ اور فنونِ حرب کی نمائش میں اُس نے تمہیں نیچا دکھایا تھا؟ کاش جس طرح وہ ایک سپاہی کے فرائض سمجھتا ہے، اُسی طرح تُم بھی ایک امیر کے فرائض سمجھو۔ اُس کی افواج ہندوستان کے آخری کونے تک اسلام کا پرچم لہرانے کا تہیّہ کر چکی تھیں۔ اگر اُسے واپس نہ بلایا جاتا تو شاید وہ اُس وقت تک راجپوتانہ فتح کر چکا ہوتا۔ آج مُجھے دمشق پہنچتے ہی پتہ چلا ہے کہ تُم نے اُسے صالح کی

نگرانی میں واسط بھیج دیا ہے اور تُم اس کے لیے کوئی بدترین سزا تجویز کر چکے ہو۔ لیکن یاد رکھو۔ تُم اُس کی عظمت اُس سے نہیں چھین سکتے۔ لوگ جلّاد کی تلوار بھول سکتے ہیں لیکن شہیدوں کا خون نہیں بھول سکتے۔ سلیمان! میں تمہیں بہت کُچھ سمجھاتا لیکن اب باتوں کا وقت نہیں اگر فاتح سندھ کے سینے میں پیوست ہونے والا تیر ابھی تک تمہارے ہاتھ میں ہے تو اُسے روک لو۔ ورنہ یاد رکھو، آنے والے مؤرّخ جہاں محمدؐ بن قاسم کو اِس زمانے کا سب سے بڑا مجاہد کہیں گے۔ وہاں وہ تمہیں اسلام کے سب سے بڑے دُشمن کے نام سے یاد کریں گے۔ اگر تُم نے میری بات نہ مانی تو شاید کل تک میں دمشق کے لوگوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دوں کہ مسلمانوں کی جماعت میں تمہارے جیسے امیر کے لیے کوئی جگہ نہیں۔۔۔۔!"

سلیمان کا غصّہ ندامت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ اضطراب کی حالت میں مُٹھّیاں بھینچ کر کمرے میں ٹہلنے کے بعد مشعل کے سامنے رُکا۔ پھر اُس نے عمر بن عبد العزیز اور زبیر کی طرف دیکھا اور گھبرائی ہوئی آواز میں

کہا۔

”کاش! آپ دو دِن پہلے آجاتے، میرا تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ اب میں کُچھ نہیں کر سکتا۔“

عمر بن عبد العزیز نے پوچھا۔ ”تو تُم اس کے قتل کا حکم بھیج چکے ہو؟ “

سلیمان نے اثبات میں سر ہلایا۔

زبیر نے کہا۔ ”اگر آپ دوسرا حکم لکھ دیں تو میں شاید وقت پر پہنچ سکوں۔“

سلیمان نے تالی بجائی۔ ایک غلام تعمیل کے لیے آموجود ہوا۔

سلیمان نے کہا۔ ”میرے اصطبل کا بہترین گھوڑا تیار کر دو۔“

غلام چلا گیا اور سلیمان خط لکھنے میں مصروف ہو گیا۔

خط ختم کرنے کے بعد سلیمان نے عمر بن عبد العزیز کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ پڑھ لیجئے۔“

عمر بن عبد العزیز نے خط پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد زبیر کے ہاتھ میں دے دیا اور کہا۔

"اب خدا کرے یہ وقت پر پہنچ جائے۔ تُم بہت تھکے ہوئے ہو۔ کیا یہ بہترین نہ ہو گا کسی اور کو بھیج دیا جائے؟"

زبیر نے جواب دیا۔ "یہ خط حاصل کرنے کے بعد میری تھکاوٹ دور ہو چکی ہے۔ میں آپ کو اطمینان دِلاتا ہوں کہ راستے میں آرام کیے بغیر واسط پہنچ سکتا ہوں۔ اگر مُجھے راستے کی چوکیوں سے تازہ دم گھوڑے ملتے جائیں تو میرا ارادہ ہے کہ میں طویل راستہ اختیار کرنے کی بجائے سیدھا صحرا عبور کر لوں۔"

سلیمان نے ایک اور حکم نامہ راستے کی فوجی چوکیوں کے نام لکھ کر زبیر کے حوالے کیا۔ غلام نے آ کر یہ اطلاع دی کہ گھوڑا تیّار ہے۔ زبیر نے سلیمان کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد عمر بن عبد العزیز کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپ میرے لیے دُعا کریں!"

عمر بن عبد العزیز نے خُدا حافظ کہتے ہوئے زبیر کی طرف غور سے دیکھا۔ اُس کے چہرے پر جو چند لمحے پہلے ایک طویل سفر کی کلفتوں سے مُرجھایا ہوا تھا، اُمّید کی روشنی جھلک رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد زبیر ایک تیز رفتار گھوڑے پر واسط کا رُخ کر رہا تھا۔

(۶)

صحرا عُبُور کرنے کے بعد زبیر ایک رات تیسرے پہر کے قریب ایک سر سبز و شاداب علاقے میں سے گُزر رہا تھا۔ مسلسل بے آرامی سے اُس کے اعضاء شل ہو چکے تھے، سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ گھوڑے کی تیز رفتاری کے باوجود پچھلے پہر کی ہوا کے خوش گوار جھونکے اُسے ہتھے پر سر ٹیک کر دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جانے پر مجبور کر رہے تھے۔ ایک ناقابلِ تسخیر عزم کے باوجود کبھی کبھی اُس کی آنکھیں خود بخود بند ہو جاتیں، لگام پر ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی اور گھوڑے کی رفتار تھوڑی دیر کے لیے

سُست ہو جاتی لیکن ایک خیال اچانک کسی تیز نشتر کی طرح اُس کے دِل میں اُتر جاتا۔ وہ چونک کر ستاروں کی طرف دیکھتا اور گھوڑے کی رفتار تیز کر دیتا۔

اُس کی منزل قریب آچکی تھی۔ وہ تصوّر میں سلیمان کا خط صالح کے ہاتھ میں دے رہا تھا۔ قید خانے کے دروازے پر محمدّ بن قاسم سے بغل گیر ہو رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "محمدّ! میں اب سو جانا چاہتا ہوں۔ کسی ندی کے کنارے، کسی درخت کی گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں میں۔۔۔۔۔ اور دیکھو، جب تک میں خود تازہ دم ہو کہ نہ اُٹھوں، مُجھے جگانا مت۔ نیند کتنی عجیب چیز ہے۔ ہر دکھ کا، ہر درد کا علاج۔۔۔ میں کم از کم ایک دفعہ جی بھر کر سونا چاہتا ہوں۔ لیکن نہیں۔ میرے دوست تمہیں سلامت دیکھ کر میری نیند اور تھکاوٹ دور ہو جائے گی!"

افقِ مشرق پر صُبح کا ستارا نمودار ہو رہا تھا۔ زبیر کا تصوّر اُسے کہیں دور لے جا رہا تھا۔ وہ پھر ایک بار دیبل کے راستے میں ایک ٹیلے پر کھڑا تھا اور کم سن اور نوجوان سپہ سالار کے یہ الفاظ اُس کے کانوں میں گونج رہے تھے:

"زبیر! مُجھے اِس ستارے کی زندگی پر رشک آتا ہے۔ اِس کی زندگی جس قدر مُختصر ہے، اُسی قدر اس کا مقصد بُلند ہے۔ دیکھو! یہ دُنیا کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے کہ میری عارضی زندگی پر تاسف نہ کرو۔ قُدرت نے مُجھے سورج کا ایلچی بنا کر بھیجا تھا اور میں اپنا فرض پورا کر کے جا رہا ہوں۔ کاش! میں بھی اِس ملک میں آفتابِ اسلام کے طلوع ہونے سے پہلے صُبح کے ستارے کا فرض ادا کر سکوں۔"

زبیر کے دِل میں ایک ہوک سی اُٹھی اور اُس نے پھر ایک بار تھکے ہوئے گھوڑے کو پوری رفتار سے چھوڑ دیا۔ افقِ مشرق سے شب کی ردائے سیاہ سِمٹ رہی تھی۔ صُبح کا ستارہ نُور کے آنچل میں چھُپ گیا اور آفتاب خونی قبا پہن کر نمودار ہوا۔

زبیر نے آخری چوکی سے اپنا گھوڑا تبدیل کیا، دو کوس اور چلنے کے بعد زبیر کو حدِّ نظر پر واسط کی مساجد کے مینار نظر آ رہے تھے۔ وہ ہر قدم پر بیم و رجا کے اُٹھتے ہوئے طوفانوں میں اُمّید کی مشعل جلا رہا تھا۔

شہر کے مغربی دروازے پر آدمیوں کا ہجوم دیکھ کر زبیر نے گھوڑے کی

باگ کھینچی اور چند نوجوانوں کے کندھوں پر کسی کا جنازہ دیکھ کر اتر پڑا۔ ٹانگوں میں اُس کا بوجھ سہارنے کی طاقت نہ تھی۔ پھر بھی اُس نے ہمّت کر کے ایک عرب سے پوچھا۔ ”صالح کہاں رہتا ہے؟“

عرب نے اُس کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”تُم کون ہو؟ اُس سفّاک سے تمہارا کیا کام ہے؟“

زبیر نے چند نوجوانوں کی پُرنم آنکھیں دیکھیں۔ پھر عرب کی طرف دیکھا اور دھڑکتے ہوئے دِل پہ ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”میں دمشق سے خلیفہ کا ایک ضروری پیغام لایا ہوں۔“

عرب نے سوال کیا۔ ”خلیفہ نے اب کس کے قتل کا حکم بھیجا ہے؟“

زبیر نے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے مغرب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ جنازہ کس کا ہے؟“

عرب نے جواب میں کہا۔ ”تُم نے فاتح سندھ کا نام سُنا ہے؟“

زبیر کے ہاتھ سے گھوڑے کی باگ چھوٹ گئی اور لڑکھڑا کر زمین پر گر

پڑا۔ بہت سے لوگ اُس کے گرد جمع ہو گئے۔ ایک نوجوان زبیر! زبیر! کہتا ہوا آگے بڑھا اور اُس کے قریب بیٹھ کر اُسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ درد بھری آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”زبیر! اٹھو۔ جلدی کرو۔ عماد الدّین محمدّ بن قاسم کا جنازہ جا رہا ہے۔“

زبیر بے ہوشی کی حالت میں بڑبڑا رہا تھا۔ ”محمدّ! میں اب سو جانا چاہتا ہوں۔ کسی ندی کے کنارے۔ کسی درخت کی ٹھنڈی اور گھنی چھاؤں میں۔۔۔ اور جب تک میں خود نہ اُٹھوں، مُجھے جگانا مت۔“

نوجوان نے اُسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ”زبیر! میں خالد ہوں، میری طرف دیکھو۔ محمدّ چل بسا۔ سندھ کا آفتاب واسط کی خاک میں روپوش ہو رہا ہے۔ اٹھو! لوگ تمہارے دوست کا جنازہ لے جا رہے ہیں!“

زبیر نے آنکھیں کھولیں اور پریشان سا ہو کر بولا۔ ”خالد تُم؟ میں کہاں ہوں؟ اُف میں شاید بے ہوش ہو گیا تھا۔ وہ جنازہ؟ مُجھ سے شاید کوئی یہ کہہ رہا تھا کہ نہیں نہیں۔۔۔! محمدّ بن قاسم نہیں ہو سکتا۔ دیکھو میں اُس

کی رہائی کا حکم لایا ہوں۔"

زبیر نے خط نکال کر خالد کو دے دیا اور کہا۔ "خالد! اِسے جلدی سے صالح کے پاس پہنچا دو!"

خالد نے بے توجہی سے کاغذ کے پرزے کی طرف دیکھا اور اُسے زمین پر پھینک دیا۔ زبیر مبہوت سا ہو کر خالد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک معمّر عرب نے جھک کر خط اُٹھا لیا اور اُسے کھول کر پڑھتے ہی چلّا اٹھا:

"امیر المومنین کا حکم تھا کہ اِسے عزّت کے ساتھ دمشق پہنچایا جائے۔ صالح نے اِسے اپنے ارادے سے قتل کیا ہے۔ امیر المومنین ایسا حکم نہیں دے سکتے تھے۔ واسط کے مسلمانو! محمدؐ بن قاسم کی روح انتقام کے لیے پُکار رہی ہے۔ تُم کیا دیکھتے ہو؟ آؤ میرے ساتھ آؤ!"

ہجوم کے کھسک جانے کے بعد خالد نے زبیر کو اُٹھانے کے لیے سہارا لینے کی کوشش کی لیکن اُس نے کہا۔ "میں اب ٹھیک ہوں۔ چلو!"

دونوں اُٹھ کر قبرستان کی طرف چلے۔

جس وقت لوگ محمدؒ بن قاسم کی لحد پر مٹّی ڈال رہے تھے، کوئی پچاس نوجوان صالح کے مکان کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے اور تلواریں سونت کر اُس پر ٹوٹ پڑے۔

ختم شد